صدیق عالم کے افسانے

فہرست

۱.	ڈھاک بند	۰۲
۲.	لیمپ جلانے والے	۰۸
۳.	کبھی دو پیر فرتوت	۱۳
۴.	نل کی پیاس	۱۹
۵.	خدا کے بندے	۲۷
۶.	فور سیپس	۳۶
۷.	رودِ خنزیر	۴۶
۸.	خدا کا بھیجا ہوا پرندہ	۶۰
۹.	جانور	۶۶
۱۰.	اچھا خاصا چیروا	۷۳
۱۱.	نادر سکوّں کا بکس	۷۸
۱۲.	دروازہ	۸۴
۱۳.		

ڈھاک بن

جھرنا ہیمبرم کی آنکھوں میں سیلن بہت آسانی سے اترتی تھی۔ اتنی آسانی سے کہ صبح نیند سے جاگ کر دونوں پپوٹوں کو الگ کرنے کے لیے اسے انگلیوں کا اچھا خاصا زور لگانا پڑتا۔ آج تو اس کی داہنی آنکھ آدھی ہی کھل پائی تھی اور اسی حالت میں وہ اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی، صبح کے کام کاج کر رہی تھی، سور کی ناند صاف کر رہی تھی۔ اور اس کی داہنی آنکھ میں تھا کہ دن گھستا چلا آرہا تھا۔ اسے کسی طور اس آنکھ کو پورا کھولنا ہوگی تاکہ آسانی سے بند کر سکے۔ اس نے کئی بار کوشش کی مگر پپوٹوں کے کنارے پھر بھی جڑے رہے۔ آخر میں تھک کر اس نے ایک بیڑی سلگالی جسے وہ خود بناتی تھی، اور بھک بھک دھواں نکالتے ہوئے اپنے مجروح دانتوں سے تنکے کھینچ کھینچ کر بانس کی ٹوکری بننے لگی۔ اس کے بیٹے رائسن ہیمبرم کو شہر نے مانگ لیا تھا اور اب وہ ریل کی پٹری کے کنارے کنارے اپنے ہتھوڑے اور دوسرے اوزار لے کر گھومتا۔ اس کے شوہر منگرو نے مہوے کا ٹھرا پی پی کر اپنا پیٹ اتنا بڑا کر لیا تھا کہ اسے شہر کے سرکاری اسپتال میں اندر سے چیر کر ٹھیک کرنا پڑا۔ مگر پھر وہ زیادہ دن تک زندہ نہ رہ پایا۔ اس نے اتنا غصہ اپنے اندر بھر لیا تھا کہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی رکھیل آرتی سردار کو اتنا مارا اتنا مارا کہ وہ ادھ موئی ہو گئی۔ اس دن گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ منگرو شرابی ہو گیا ہے اور منگرو مرنے والا ہے اور اب منگرو کسی بھی دن جنگلی بدروحوں کے شکنجے میں ہوگا جو اسے اڑا کر ڈھاک کے جنگل میں لے جائیں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیڑوں کے کھوکھلوں میں بھٹکتا رہے گا اور راہ گیروں پر عجیب و غریب چہرے بناتا رہے گا۔

ایک دن منگرو کا بھوت آئے گا! جھرنا ہیمبرم خود سے کہہ رہی تھی۔ اور وہ ہر کام آسان کر دے گا۔ وہ سوروں کے طویلے میں رہنا شروع کر دے گا اور سوروں کی گرمی بڑھ جائے گی۔ وہ مرغیوں کے ڈربے میں رہنا شروع کر دے گا اور ان کے ٹونگنے لیے ہرے پتے پیڑ پودوں اور جھاڑیوں کے نچلے حصوں میں اگائے گا۔ اور سلائی کنڈ کے بڑے پتھر سے پھوٹتے جھرنے میں پانی ہی پانی ہوگا۔ میں نے منگرو کے لیے سجنا کے کھوکھل صاف کروائے ہیں تاکہ اپنے آرام کے لیے اسے ڈھاک کے جنگل کی طرف لوٹنا نہ پڑے بلکہ انھیں میں سے کسی میں وہ آرام سے لیٹا رہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح جب وہ زندہ تھا لیٹا رہتا تھا۔

وہ لوگ کانا پہاڑ کے باشندے تھے۔ اسے کانا پہاڑ اس لیے کہتے تھے کیونکہ جب سورج اس کی چوٹی کو چھو کر ڈوبتا تو کانی آنکھ کی شکل اختیار کر لیتا۔ کانا پہاڑ کے بارے میں بہت ساری باتیں مشہور تھیں۔ مثلاً اس پر بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے قبائلی گاؤں اب اپنے پرانے رکھ رکھاؤ سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ پر عیسائی مشنری حاوی ہو گئے ہیں اور کچھ نے ہندو دیوی دیوتاؤں کو اپنا لیا ہے۔ مگر جو افواہ سب سے زیادہ گرم تھی اور جس نے لوگوں کو مضطرب کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ اب کانا پہاڑ سے روحیں منتقل ہو رہی ہیں۔ وہ یہاں کے لوگوں سے ناخوش ہیں اور ایک دن آئے گا جب پہاڑ کے گربھ سے آگ اُبلے گی اور پیڑ پودے گھر اور پرانی اس طرح جلیں گے جس طرح جنگل میں آگ پھیلنے سے کیڑے مکوڑے جلتے ہیں۔

شاید یہی وجہ تھی کہ منگرو کے اندر اس قدر غصہ بھرا ہوا تھا۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے تیر اور بھالے تیز کیا کرتا۔

مگر اس نے کبھی تیر نہیں چلائے، بھالا نہیں اٹھایا۔ وجہ بے وجہ مہوا پیتے پلاتے رہنا، ڈھلان میں ہفتہ وار ہاٹ میں مرغے لڑانا اور ہباڈ باکھیلنا جہاں سے وہ بہت سارے سکے جیت کر آتا اور کبھی کبھار ہار کر بھی۔ مگر جھرنا ہیمبرم جانے کیسی جادوگرنی تھی، دو وقت کا ابلا ہوا اناج اور گوشت اس کے برتن میں عین وقت پر دھرا ہوتا جن کی طرف منگرو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا، مگر کھائے جاتا، جیسے یہ سب کچھ اسے اچھا نہ لگ رہا ہو، جیسے اس کے اندر کی آتما اسے پھٹکار رہی ہو۔ اور جب اس اندرونی ملامت سے وہ ہار جاتا تو آرتی کے پاس چلا جاتا۔ آرتی جو جانے انجانے کتنوں ہی کی مشترک رکھیل تھی اور جسے مہوے سے شراب کشید کرنے کا فن آتا تھا اور جس کا شوہر اسے ہر کسی کے پاس بیچنے کے لیے بے چین رہتا۔

"بہت کراری بہو ہے، بس ایک باٹلی ٹھرّا سرکار اور دس روپے۔" وہ اکثر پہاڑی راستے سے گزرنے والے سیاحوں کی گاڑیوں کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی بغل میں آرتی سر جھکائے کھڑی رہتی، اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کرتی رہتی، اپنی ساڑی کے پلّو کو منھ میں ٹھونستی جاتی۔

"یہ شہری لوگ!" وہ دل ہی دل میں سوچتی۔

اور جب جھرنا ہیمبرم اکیلی رہ گئی تو کتنوں نے ہی اسے گونے کی پیشکش کی۔ وہ ٹوکریاں اچھی بنتی تھی۔ اس کے جانور بیماری سے نہیں مرتے تھے اور جنگل کے ان گوشوں سے وہ بخوبی واقف تھی جہاں بدلتے موسموں کی مناسبت سے سوکھی لکڑیوں کی بہتات ہوتی۔ اس کے بالوں میں چاندی کے تار جاگنے لگے تھے اور اس جیسی تجربہ کار عورت کا سہارا کاہل قبائلیوں کی ہمیشہ کی ضرورت رہی ہے۔

صرف جھرنا ہیمبرم کو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی منگرو کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ صرف منگرو کہیں اور تھا اور وہ کہیں اور۔ جنگل میں کیکر، شہتوت اور بچھو متی کی جھاڑیوں میں جہاں سانپ اپنی کینچلی چھوڑ جاتے وہ منگرو کے پیروں کے نشان ڈھونڈتی۔ مگر پھر اسے یاد آتا، آتماؤں کے پیر نہیں ہوتے۔۔۔ نہیں پیر تو ہوتے ہیں، مگر انھیں زمین پر رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی جھرنا ہیمبرم خود بھی پریت آتما کی شکل اختیار کر لیتی اور اسے لگتا وہ کیکر کی جھاڑیوں پر بہ آسانی چل سکتی ہے۔ اس کے اندر اسے آزمانے کی ہمت تو نہ تھی مگر وہ آتماؤں کا مذاق بھی اڑانا نہیں چاہتی تھی۔

جس دن رائسن اپنے سے بھی دگنی عمر کی ایک عورت کے ساتھ وارد ہوا جس سے اس نے بیاہ کر لیا تھا تو بڑے غصے میں دکھائی دیا۔ اس دن پہلی بار جھرنا ہیمبرم کو منگرو کی بہت ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے پہلی بار لگا کہ وہ اکیلی ہو گئی ہے۔

''یہ سب کچھ اب زیادہ دن نہیں چلنے کا، ماں!'' رائسن نے گھر کے اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا۔ ''اب زیادہ سمے نہیں ہے جب بواری ماں بنے گی اور ہمیں اگلے دنوں کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔''

''اگلے دن؟'' جھرنا ہیمبرم نے معصومیت سے پوچھا۔

''میرے ریلوے کوارٹر میں دو کمرے ہیں،'' رائسن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ وہ کھانس بھی رہا تھا۔ ''اور بواری جب ماں بنے گی تو ہمیں کسی نہ کسی کی ضرورت تو ہو گی ہی۔ رہا ایک کمرہ تو اسے ہم کرائے پر دے سکتے ہیں۔''

دو ہفتے رائسن اور بواری جھرنا ہیمبرم کے ساتھ رہے۔ بواری اور جھرنا ہیمبرم کسی حد تک ہم عمر بھی کہی جا سکتی تھیں۔ اس لیے دونوں گھل مل گئیں۔ بواری کے کولھے پیچھے کی طرف نکلے ہوئے تھے اور اس کے سامنے کے تین دانت نقلی تھے جنھیں رات کے وقت کھول کر اسے پانی کے پیالے میں ڈبو کر رکھنا پڑتا تھا۔ وہ بار بار اپنے دونوں کان جھاڑتی اور نقلی دانتوں سے ہنستی۔

''میرا باپ شروع میں میرے بیاہ سے خوش نہیں تھا جیسا کہ میرے باپ کو ہونا چاہیے۔ وہ میرے لیے اور بھی اونچے سپنے دیکھتا تھا۔ مگر میری سوتیلی ماں نے میرا ساتھ دیا۔ ہم نے ہنومان چوک کے مندر میں شادی کی۔ میری تین بہنیں ہیں اور سب کی سب میری ہی طرح سندر ہیں۔ ہمیں بَروں کا کیا کال ہے۔''

جھرنا ہیمبرم زیادہ تر اس کی باتوں کا سر اٹھیک سے پکڑ نہ پاتی۔ مگر پھر بھی اسے پتا تو تھا کہ اس کے بیٹے کی بہو اپنے دل کا بوجھ اس کے سامنے ہلکا کر رہی ہے۔ رائسن تو جھونپڑی سے تھوڑی دور بانس کے جھنڈ کے سامنے بچھی چارپائی پر لیٹا لیٹا سگریٹ پھونکتا رہتا اور اپنی انگلیاں چٹخاتا رہتا۔ اور یہ وہی جگہ تھی جہاں دس سال پہلے تک چیتا اور بن سور آیا کرتے تھے۔

''ارے، یہ سب کتنی بکواس ہے،'' وہ بیچ بیچ میں چلا اٹھتا۔ ''اس کانا پہاڑ میں ڈھنگ سے جینے کا کچھ تو سادھن ہونا چاہیے۔''

بواری ضرورت سے زیادہ کھاتی تھی اور اسے ہر وقت لوٹا لے کر جھاڑیوں کے پیچھے گڑھیا کی طرف جانا پڑتا۔

''مجھے تو لگتا ہے ماں، مجھے جلد سے جلد اسے پیٹنا شروع کر دینا چاہیے،'' رائسن ماں کو آنکھ مار کر کہتا۔ ''اس جیسی عورت کے لیے اس سے بہتر اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کا باپ سالا انجن کا خلاصی تھا جو اسٹیم انجن سے ریٹائر تو ہو چکا ہے مگر انگاروں کی سی آنکھیں رکھتا ہے۔ صرف بواری اس سے نہیں ڈرتی۔ اور اس کی یہی بات تو مجھے بھاتی ہے۔''

گاؤں میں جتنے بھی جھونپڑے تھے سب ایک دوسرے سے الگ الگ مختلف اونچائیوں پر کھڑے تھے۔ ایک دو جگہ باڑ کے اندر مکئی اور سورج مکھی کے پودے تھے۔ جھرنا ہیمبرم کے کتے تھنبا نے بواری کو شروع سے ناپسند کر دیا تھا۔ وہ بلا جھجک دور کھڑا اس پر بھونکتا رہتا۔ سورناند میں چھینکتے رہتے، جھرنا ہیمبرم ٹوکری بنتی رہتی اور رائسن چارپائی پر سگریٹ کی ٹیڑھی راکھ کو دھیرے دھیرے ہوا میں منتشر ہوتے دیکھتا رہتا۔

واقعی یہ سب کوری بکواس ہے، وہ دل ہی دل میں سوچتا۔ اور اس کتے کو مہمانوں کی قدر کرنی چاہیے۔ میری غیر حاضری میں اس گھر کا تو کباڑا ہی ہو گیا ہے گویا۔ بڑھؤ کے مرنے کے بعد کچھ بھی تو نہیں سدھرا ہے یہاں۔

اور دو ہفتے بعد، رائسن ہیمبرم اپنی بیوی بواری اور ماں جھرنا ہیمبرم کو لے کر گاؤں سے چلا گیا۔

اور بس میں تین گھنٹے اور رکشا میں پندرہ منٹ کے سفر کے بعد تینوں ریلوے کے ایک پرانے کوارٹر کے دروازے پر پہنچ گئے جس کی قدیم طرز کی محرابی چھت پر جھاڑیاں اور پیپل کے پودے اگے ہوئے تھے۔ یہاں آنکھوں کے سامنے ریلوے کی پٹریاں چمک رہی تھیں اور جھرنا ہیمبرم کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ کوئلہ جلانے کا اتنا تیز دھواں جانے کہاں سے پھیل رہا تھا اور یہاں پیڑ پودوں پر ایک عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ زمین توے کی طرح سپاٹ اور سیاہ تھی اور جدھر بھی نظریں اٹھاؤ صرف کوے ہی کوے تھے اور انسان ہی انسان جو کوؤں کی طرح ہی غلیظ تھے اور کالک سے لپٹے ہوئے انھیں کی طرح ڈھیٹ نظر آ رہے تھے۔ پہلے دن سے ہی جھرنا

ہیمبرم کو گھر کا پورا کام کاج سنبھالنا پڑا اور چونکہ کرایہ دار ابھی مل نہ پایا تھا رائسن نے دوسرے کمرے پر تالا دے رکھا تھا۔ اس لیے جھرنا ہیمبرم کو اپنا بستر باورچی خانہ کے دروازے کے پاس آدھے گھرے ہوئے برآمدے پر لگانا پڑا جہاں سے پٹریوں کے اوپر پھیلے ہوئے کالک زدہ تار اور تاروں بھرا آسمان دکھائی دیتے تھے۔

اندر کمرے سے بواری اور رائسن کے کھلکھلا کر ہنسنے، چومنے اور ایک دوسرے کو پیار بھری فحش گالیوں سے نوازنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ آدھی رات سے قبل دونوں باری باری سے جھرنا ہیمبرم کے سوتے ہوئے جسم کو لانگھ کر غسل خانے کے اندر جاتے۔ مگر جھرنا زیادہ تر وقت جاگتی رہتی اور ایسے اوٹ پٹانگ وقت میں سو جاتی جب بواری کو اس کی ضرورت ہوتی۔

"جب سے کوارٹر آئی ہے، بڑھیا کو تو مزہ ہی مل گیا ہے،" بواری کوسنے دیتی۔ "ڈھنگ سے دو وقت کا کھانا بنانا تو آتا نہیں، پسر کر یوں سوتی ہے جیسے سارا جگ جیت کر آئی ہو۔"

اب تو رائسن نے نل سے پانی لانا بند کر دیا تھا۔ نل پر پانی کے لیے بڑا ہنگامہ ہوتا۔ اکثر جھرنا خالی ڈول کے ساتھ واپس لوٹتی۔ اور اس پر بواری کا عتاب نازل ہوتا۔

"غیر کو تو آدمی گالی بھی دے لے، مگر اپنے پر کیسے تھوکے؟" بواری اپنے خصم کو سناتی۔ "اجی میں تو کہتی ہوں، آپ تو ادھر توجہ دیتے ہی نہیں، بس اکیلے مجھے ہی جھیلنا پڑتا ہے۔ بڑھیا تو خالی ڈول لے کر واپس آجاتی ہے اور مجھے نل پر جا کر گالی گلوچ کرنی پڑتی ہے۔"

"سب بکواس سن رہا ہوں میں، "رائسن کہتا۔ "میرا خیال ہے بڑھیا جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ جلد ہی سیکھ جائے گی۔ ارے اب اس میں چلّانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ تم بواری بس جلد سے جلد ایک بچہ دے دو، یہ گھر بھر جائے گا۔ کیوں نہ آج ہم ایک نیا طریقہ اپنائیں؟"

اور پچھلے پورے دو سال سے دونوں اسی کوشش میں تو مصروف تھے۔ جھرنا ہیمبرم کے آنے کے بعد اب تو دن میں بھی وہ ایک آدھ کوشش کر لیتے۔ فرصت کے وقت جھرنا کوارٹر کے دروازے کے باہر اکڑوں بیٹھی زمین پر کسی تنکے سے لکیریں کھینچتی رہتی، ٹرینوں کو گزرتے دیکھتی رہتی۔ اسے دھواں اگلتے ہوئے اسٹیم انجن زیادہ اچھے لگتے جن کے ڈرائیور سر پر غلیظ رومال باندھے رہتے اور اس عجیب و غریب بڑھیا کی طرف تاکتے رہتے جسے اس شہر کی بھاشا بھی نہیں آتی تھی۔ پٹریوں پر بھاگتے کتوں کو دیکھ کر اسے اپنا تھنبا یاد آجاتا۔ سوروں کو تو اس نے پڑوسیوں کو امانت کے طور پر سونپ دیا تھا، مگر تھنبا کو کون سنبھالتا! کتنی دور تک وہ پہاڑی راستے پر بھاگتا آیا تھا اور بس کے پیچھے پیچھے اس نے دوڑ بھی لگائی تھی۔ اسے یاد کر کے جھرنا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ دبی دبی آواز میں کوئی پہاڑی گیت گانے لگتی جسے وہاں کوئی سمجھ نہ پاتا، یہاں تک کہ اندر سے بواری کی پکار سنائی دیتی۔

"بڑھیا، باہر کیا خصم پھانس رہی ہے کہ اب تک آنکھیں سٹی ہوئی ہیں؟ کتنا درد ہے میرے بدن میں۔ مگر کوئی مجھے اپنی بیٹی کی نظر سے دیکھے تب نا!"

رات کو اکثر رائسن دیر سے شراب پی کر لوٹتا اور باورچی خانے کے دروازے پر پڑے ہوئے جسم سے اسے چڑ ہو جاتی۔

"جی چاہتا ہے ایک لات جماؤں اسے۔ یہ بھی سونے کا کوئی وقت ہے ماں؟ اور کھانا کون کھلائے گا؟ یہ سب تیرے کارن ہے کہ بواری کے پیٹ میں بچہ ٹھہر نہیں پا رہا ہے۔"

"اور کیا!" بواری اندر سے تائید کرتی۔ "ذرا سمجھاؤ اسے، کبھی جو مالش کا تیل گرم کر کے میرے بدن پر لگایا ہو۔ میری تو کمر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔"

"ارے گھبرانے کی بات نہیں، پہلے کچھ کھا لینے دو، بڑی بھوک لگی ہے۔ پھر میں تیری کمر کا درد ٹھیک کر دیتا ہوں۔ میرے پاس ایک خاص نسخہ ہے،" رائسن آنکھ مار کر کہتا۔ "اور ذرا دیکھ، کیا لایا ہوں تیرے لیے۔ بہت ہی خستہ مال پوے ہیں۔ پسند ہیں نا تجھے؟ پر اتنا بھی نہ کھا لینا کہ پھر سے لوٹا لے کر دوڑنا پڑے۔"

"ارے، میرے پیٹ میں تو کچھ پچتا ہی نہیں۔"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے، گھر کے اندر سنڈاس جو ہے۔"

کبھی کبھی بواری باپ کے گھر چلی جاتی۔ اس وقت گھر میں سناٹا رہتا اور دونوں ماں بیٹے کی دیرینہ محبت لوٹ آتی۔

"ارے اماں، بواری سے کہوں گا اب کے بازار سے تمھارے لیے تانت کی ساڑی لائے۔ اور یہ سڑی گلی چپل، مجھ سے تو یہ برداشت نہیں ہوتی، جانے تم کیسے انھیں سٹکتی پھرتی ہو؟"

"ارے اماں ذرا ٹھیک سے کھایا کرو، تم تو سوکھتی جا رہی ہو۔ یہی حال رہا تو تمھارے باقی کے دانت بھی جھڑ جائیں گے۔"

"ارے اماں، اب کے بواری سے کہوں گا تمھیں ریلوے ٹاکیز میں سنیما دکھا کر لائے۔"

مگر بواری دن بدن شکی ہوتی جارہی تھی۔ اس نے ٹوناٹوکا بھی کر کے دیکھ لیا تھا، سادھو سنتوں اور پیر فقیروں کے مزاروں کے درشن بھی کر لیے تھے، ٹنگا بھوت والے برگد پر سیندور کی پوجا بھی کی تھی اور تجربہ کار چھنال بوڑھیوں سے سن کر رائسن کے ساتھ ہر وہ طریقہ آزمالیا تھا جو بچہ پیٹ میں رکھنے کے لیے ضروری ٹھہرتا ہے، مگر تھی وہ بانجھ کی بانجھ۔ اور آخر کار اس کی بجلی جھرنا ہیمبرم پر ہی ٹوٹتی۔

"یہ سب اس کے کارن ہے۔ اس نے اپنے مرد کو کھایا اور اب میرے پیٹ سے بچے چرا رہی ہے۔"

"چپ رہ رنڈی،" رائسن چلاتا۔ "میری پیاری رنڈی!"

"میں کہتی ہوں، ضرور اس میں کچھ بات ہے۔ میں نے اکثر کچھ سائے آنگن میں چلتے دیکھے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں، کبھی تم غور سے بڑھیا کو نہیں دیکھتے۔ کل صبح میں نے جب اسے دیکھا تو وہ مری پڑی تھی۔ مگر اسے جب ہلایا تو اس نے اپنی سیلن بھری آنکھیں کھول دیں اور اپنے سفید دانتوں سے بھوتنی کی طرح ہنس دی۔"

"میں کہتی ہوں وہ رات کو نیند میں چلتی ہے اور اپنے گیتوں کے ذریعے بدروحوں کو بلایا کرتی ہے۔"

مگر رائسن زیادہ دن تک ماں کا دفاع نہ کر سکا۔ اب تو بواری نے کھلے عام جھرنا کو گالی دینا شروع کر دیا تھا۔

"ہر رات اس چڑیل کو مجھے لانگھنا پڑتا ہے۔"

"ہر صبح اس کی لاش دیکھنی پڑتی ہے۔"

"ہر دوپہر، جب میں سوتی ہوں، جانے یہ کہاں جاتی ہے۔ لوگوں نے اسے مڑے ہوئے پیروں سے چلتے دیکھا ہے۔"

اور جب بات حد سے گزر گئی تو ایک دن رائسن نے جی بھر کر شراب پی، گھر آیا اور ماں کے جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے جا کر ریل کی پٹری پر ڈال دیا۔ جھرنا اٹھی اور لنگڑاتے لنگڑاتے تاروں کی ناکافی روشنی میں اس سمت ہولی جدھر اس کی دانست میں اس کے پہاڑ تھے۔

گھر پہنچنے میں اسے تین دن لگے۔ اس ایک سال کے عرصے میں اس کے اور بھی بہت سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ جب پہاڑ نے ہیمبرم کو دیکھا تو اس نے اپنی جھاڑیوں اور پیڑوں والی بانہیں پھیلا دیں اور سورج کا ناپہاڑ پر گویا ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا اور رنگین سروں والے گرگٹ سوکھے پتوں پر بھاگتے بھاگتے رک گئے اور اپنے سر موڑ موڑ کر جھرنا ہیمبرم کو تاکنے لگے۔ اور جب جھرنا ہیمبرم گاؤں سے کچھ دور، جہاں تک بس کے کنڈکٹر نے ترس کھا کر اسے لفٹ دی تھی، ایک چٹان پر بیٹھی اپنے بالوں سے تنکے نوچ نوچ کر نکال رہی تھی تو اسے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

تھنبا سورج کو سر پر اٹھائے کھڑا تھا۔

"گھر لوٹ کر آگئی مالکن؟" کتے نے کہا۔

"ہاں رے،" جھرنا ہیمبرم نے کتے کے سر کو تھام کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میرا بچہ بڑا دکھی ہے تھنبا، مجھے جلد سے جلد انصاف مانگنے ڈھاک کا جنگل جانا ہوگا۔"

ڈھاک کا جنگل! ڈھاک کا جنگل! کتا راستہ بھر بھونکتا رہا۔

کبھی ڈھاک کے جنگل میں صرف ڈھاک کے پیڑ رہے ہوں گے، مگر حال کے برسوں میں دوسری قسم کے پیڑ بھی جگہ جگہ اگ آئے تھے۔ انھیں میں سے چیتیان کے ایک پیڑ پر منگرو نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ اس کی کھوکھلی شاخ پر، ہاتھ پر سر رکھے لیٹا رہتا اور اپنی مڑی ہوئی ٹانگ ہلایا کرتا۔ یہاں وہاں بہونیا کے پیڑوں میں گلابی پھول کھلے ہوئے تھے اور املتاس کے پھل لانبے اور فحش انداز میں جھولتے رہتے اور ڈھاک کے بونے پیڑوں میں دھول اور ہوا سرگوشیاں کرتی رہتیں جن میں کمتر درجہ کی روحیں بلبلایا کرتیں۔

"خاموش رہو بے مطلب کے پلّو!" منگرو کی آواز سے روحیں دہل جاتیں اور وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے پیڑوں اور جھاڑیوں کے پیچھے پناہ لینے لگتیں۔ "یہ بھی کوئی زندہ انسانوں کی جگہ ہے کہ دانت نکوس رہے ہو؟ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے علاوہ تم آتماؤں کو اور کچھ آتا بھی ہے؟"

"بغاوت!" روحیں چلاتیں۔

اور ان نعروں کو سن کر منگرو کا پیٹ ہنسی سے پھولنے لگتا۔ وہ چیتیان کے پیڑ سے زمین پر چھلانگ مارتا اور ڈھاک کے پیڑوں کی آڑ سے نکلی ہوئی روحوں کے کولھوں پر لات لگایا کرتا۔

"تم اسی قابل ہو۔" وہ کہتا۔ "اور شاید یہ لات تھوڑی بہت عقل تمھارے پیٹ میں ڈال دے۔"

مگر جھرنا ہیمبرم جب ڈھاک کے جنگل میں وارد ہوئی تو روحوں کی آپس میں صلح ہو چکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈھاک بن میں سرے سے روحوں کا وجود ہی نہ ہو۔

منگرو نے چیتیان کی کمزور شاخ سے سر موڑ کر جھرنا ہیمبرم کو دیکھا اور مسکرایا۔

"آ گئی میری مہوا کی ترنگ۔ ذرا دیکھو، مرنے کے بعد بھی اسے میری ضرورت ہے جیسے زندگی بھر کا دکھ لے کر بھی جی نہیں بھرا۔ آہ، ہماری ناریوں کو اور کتنا بوجھ چاہیے۔"

تھنبا کا سینہ کانپ رہا تھا۔ وہ سر کو زمین پر گاڑ کر غرا رہا تھا۔ اس کی دم ٹانگوں کے بیچ چھپتی جا رہی تھی۔ اسے بدروحیں کبھی پسند نہیں تھیں۔ اسے ان کی عادت بھی نہ تھی۔

"وہ دکھی ہے، بہت دکھی ہے۔ "جھرنا گھٹنوں کے بل گر کر رو رہی تھی، مٹی چہرے پر مل رہی تھی۔

"اچھا!" منگرو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "تب تو میں بھی دکھی ہوں۔"

"آہ منگرو، ایک سال تک میں نے ان کا دکھ دیکھا۔ آہ، ہمارے بچے دکھی ہیں۔"

منگرو کود کر چیتیان کے پیڑ سے نیچے اترا اور جھرنا کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر کے بال تن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت ساری روحوں نے پتوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ وہ اپنی لانبی زبانوں سے دانت چوس رہی تھیں اور منگرو کی مصیبت سے خوش تھیں۔

"عورت! میرے قریب نہ آنا، ورنہ میں تیرا ٹیٹوا دبا دوں گا۔ میں پہاڑ پر گِدھوں کو اترنے کی اجازت نہیں دے سکتا جیسا کہ تم چاہتی ہو۔"

"چاہے وہ اپنا بچہ ہو؟" جھرنا ہیمبرم نے بڑھ کر منگرو کا کرتا پکڑنا چاہا۔

"دور ہٹ!" منگرو کود کر پیچھے ہٹ گیا اور اپنی ایڑیوں پر بلند ہوتا چلا گیا جسے دیکھ کر کمتر آتماؤں کے دل کانپنے لگے۔ "مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جاتا۔ اتنی کمزوری کے ساتھ زندہ رہنا کیا مطلب رکھتا ہے۔ عورت اپنے ناخن تیز رکھ اور زبان کی نوک پر انگارے۔ سانپوں میں مجھے کوبرا سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"انھیں بچہ دے دو منگرو۔ ان کی زندگی آسان ہو جائے گی۔"

"ہرگز نہیں!" منگرو دانت پیس رہا تھا۔ "تو پہاڑ سے نیچے گئی اور انھوں نے تیرے بال سفید کر ڈالے۔"

"منگرو!"

"تجھے زندہ رہنے کے لیے کسی کی ضرورت تو نہیں تھی جھرنا؟ تو ریچھ کی طرح طاقتور تھی۔ تو تو اکیلی پہاڑ کی رکھوالی کر سکتی تھی۔ پھر بھی، جب تو کمزور پڑ ہی چکی ہے تو میں تجھے لڑنے کے لیے ایک ہتھیار دیتا ہوں۔" وہ جنگل کی طرف بھاگا۔ وہ ایک دیودار کے تنے پر چڑھتا نظر آیا، اس نے اپنی آنکھیں خاردار جھاڑیوں پر ٹانگ دیں اور کان پتوں پر لٹکا دیے۔ اس کے دانت پتھروں پر گرتے چلے گئے اور اس کے بال الگ الگ رینگنے لگے۔ جھرنا ہیمبرم نے اپنے سامنے ایک چھوٹے سے نقارے کو پڑا پایا۔ منگرو اس کے سامنے کھڑا ہانپ رہا تھا۔ نقارے کے چمڑے کی کھال پر اپنی سوکھی چمڑیوں والا ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"اس نگاڑے کے لیے ہم روحوں نے کتنی محنت کی تھی۔ اسے مٹی کے نقاب پہن کر ناچنے والوں سے چھینا تھا جب ان کا جتھا نیچے شہر کی طرف جا رہا تھا اور نشے میں تھا۔ جب بھی تیرا دکھ تجھے چاٹے تو اپنی ساری چوٹ اس کو دینا۔ یہ تیرا دکھ بانٹ لے گا، تیرا کام آسان کر دے گا۔ اسے بجانے کے لیے ایک مڑی ہوئی لکڑی بنا لینا اور اسے تیل پلانا جس کی ہم روحوں کو قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔"

منگرو چیتیان کے پیڑ کی طرف اڑتا دکھائی دیا۔ روحوں نے اپنے سر جھاڑیوں اور پتوں کے اندر کر لیے۔ منگرو نے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اپنی ایک ٹانگ ہمیشہ کی طرح موڑ لی اور سیٹی بجانے لگا۔

"چل بھاگ تھنبا!" اس نے کہا۔

نقارے کی آواز زیادہ تر رات کی تنہائی میں سنائی دیتی۔ اس نقارے کی چوٹ سے جھرنا ہیمبرم نے گاؤں کے لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ کہاں سے ملا اسے یہ نگاڑا؟ یہ بڑھیا عجیب و غریب کارنامے دکھاتی ہے۔ ایک سال بعد بھی اس کے تمام کے تمام سؤر زندہ رہے تھے اور تھنبا نے تین جنگلیوں کو کاٹ کھایا تھا جو گوشت کے لیے اس کا اغوا کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر یہ نگاڑا ایک عجیب واقعہ تھا۔ اسے سمجھنا مشکل تھا۔ مگر بڑھیا ہر رات جس دلجمعی سے اسے بجاتی وہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ بوڑھا منگل باسکے ایک دن لنگڑاتا ہوا جھرنا ہیمبرم کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے بیڑی قبول کی اور کھانستا رہا۔ جھرنا نے نگاڑا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔ بوڑھا باسکے سارے گاؤں اور اس کے چرند و پرند کی طرف سے آیا تھا۔

"اس کا چمڑا مضبوط ہے اور لکڑی کا تو جواب نہیں جس پر یہ تنا ہوا ہے،" منگل باسکے نے بیڑی پیتے ہوئے کہا۔ "کوئی وجہ تو ہو گی کہ تم اسے اس طرح راتوں کو بجاتی ہو؟"

"میرے رائسن کو اس کی ضرورت ہے۔"

"شاید۔" منگل باسکے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہمیں اس سے کیا لینا۔ ہر کسی کو اپنے ڈھنگ سے دکھ جھیلنے کا حق ہے۔"

لگتا ہے بیٹے کی مار کھا کر دماغ پھر گیا ہے، اس نے گاؤں والوں کو بتایا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے۔
اور گاؤں والوں نے جھرنا ہیمبرم کو معاف کر دیا۔ مگر جھرنا کی ہر رات امیدوں بھری تھی۔ وہ دل لگا کر آدھے گھنٹے تک نقارہ پیٹتی اور تھنبا کا سینہ کانپتا رہتا۔ اور پھر واقعی معجزہ ہو گیا۔ نگاڑے نے چینکار دکھایا۔
جاڑے کی ایک کہر آلود صبح رائسن دروازے پر کھڑا تھا۔ جھرنا اس سے لپٹنا چاہتی تھی، مگر رائسن سرد مہری کے ساتھ چپ چاپ کھٹیا پر بیٹھ گیا اور بیڑی پھونکتا رہا۔ اس نے وقت پر کھانا کھایا اور بانس کے جھنڈ کے پیچھے جا کر زمین پر لیٹ کر دھوپ کھانے لگا۔ اگلے پورے ہفتے تک اس نے بہت کم بات کی۔ وہ گاؤں میں آوارہ گھومتا پھرا۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی۔
"بواری کیسی ہے؟" آخر ایک دن جھرنا ہیمبرم نے پوچھ ہی لیا۔
"اچھی ہے،" رائسن نے بتایا۔ اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی گھنگھریالی داڑھی اگ چلی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ لگ رہا تھا اندر ہی اندر اسے کچھ کھرچ رہا تھا۔ اس نے نقارے کو تعجب اور تمسخر سے دیکھا۔
"تو اب اس کی بھی ضرورت پڑنے لگی ہے؟ کیا بکواس ہے۔"
مگر بیٹے کے آنے کے بعد جھرنا کو نقارے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے اس نے اسے بانس کی ایک پرانی چٹائی کے اندر لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ پہلے کی جیسی جھرنا ہیمبرم بن گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں منگرو کی شکر گذار تھی۔
"شاید اب میں واپس نہ جاؤں۔ ان شہروں میں کوئی زندگی نہیں ہے ماں،" ایک دن رائسن نے اعلان کیا۔
"بواری کو کب لا رہے ہو؟"
رائسن نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر ایک ہفتے کے اندر یہ جواب جھرنا ہیمبرم کو دوسری طرح سے مل گیا جب شہر سے پولیس کا ایک دستہ آ کر رائسن کو حراست میں لے کر چلا گیا۔ رائسن پر بواری کے خون کا الزام تھا جس کے مردے کو اس نے ریل کی پٹری پر ڈال دیا تھا تاکہ اسے ایک حادثہ قرار دے سکے۔ مگر وہ اس وقت اتنا پیے ہوئے تھا کہ اسے آس پاس کا ہوش نہ تھا اور کئی لوگوں نے اسے بواری کے جسم کو پٹری پر ڈالتے دیکھا تھا۔
اس کے جانے کے بعد جھرنا لٹی لٹی سی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی رہی، بانس کے جھنڈ کے اوپر پھیلے ہوئے نیلے آسمان میں پرندوں کو چکر لگاتے دیکھتی رہی۔ اس رات گاؤں والوں نے پھر سے نقارے کی آواز سنی اور یہ آواز رک رک کر رات رات بھر سنائی دیتی رہی۔ مہینوں بیت گئے۔ جھرنا ہیمبرم کے بدن پر گوشت برائے نام رہ گیا اور اس کے چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔ ہر وقت اس کی آنکھیں بے چینی لیے اپنے گڈھوں میں گھومتی رہتیں۔ اس کے آدھے سوُر بیماری سے مر گئے۔ جس دن وہ تھنبا اور پھٹے ہوئے نقارے کے ساتھ ڈھاک کے جنگل کی طرف گئی۔ اس دن آسمان پر گھنے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ڈھاک کا جنگل سنسان پڑا تھا۔ اس نے نقارے کو منگرو کے چیتیان کے پیڑ سے لٹکا دیا اور منگرو کو جنگل میں ڈھونڈتی رہی۔ ڈھاک کا جنگل خاموش تھا۔
اس کی آواز پہاڑ کے اوپر سے دوسرے پہاڑ تک جا کر لوٹ آئی جیسے تیز ہوا اسے کاندھوں سے ڈھو کر لے گئی ہو اور واپس لے آئی ہو۔
"منگرو! یہ نقارہ تو اب کچھ بھی نہیں کرتا۔"
ڈھاک کا جنگل اب پوری طرح خاموش بھی نہ تھا۔ ڈھاک کے بڑے بڑے پتوں پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے پتوں کے پیچھے کچھ سرسرا رہا ہو، مگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے ہوا تیز ہو گئی، آسمان بجلی کے کڑکنے سے آر پار پھٹتا چلا گیا اور تیز بارش اور ہوا میں پیڑ زمین بوس ہوتے گئے۔
جھرنا اور تھنبا نے ڈھاک کے ایک پیڑ کے تنے سے لپٹ کر سر کو دونوں بانہوں کے اندر کر لیا۔ ان کی پیٹھ اور کولھوں پر بارش تازیانے لگا رہی تھی، اولے برسا رہی تھی۔
"واپس نہ چلیں مالکن؟" تھنبا بیچ بیچ میں جھرنا سے سرگوشی کر رہا تھا۔ مگر واپسی ناممکن تھی جب تک طوفان فرد نہ ہو جائے۔ اور جب طوفان فرد ہوا تو سارا جنگل گیلا، اداس اور خاموش تھا۔ اپنے سارے پانی برسا کر بادل بدمست ہاتھیوں کی طرح واپس جا رہے تھے۔ جھرنا اور تھنبا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈھاک کے جنگل میں اب صرف ڈھاک کے پیڑ رہ گئے تھے۔ املتاس، بہونیا اور چیتیان کے سارے پیڑ جن پر آتمائیں رہتی تھیں اور وہ بھی جس پر منگرو رہتا تھا، نگاڑے کے ساتھ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

لیمپ جلانے والے

(تم سفر کے بارے میں سوچ کیسے سکتے ہو؟ ایک نئی دنیا کے لیے خود کو تیار کر لو۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔ ابھی امکانات نے اپنے تمام دروازے کھولے ہی کہاں ہیں۔ لیمپ پوسٹ)

گلی سے نکلتے ہی نکڑ پر ایک آہنی لیمپ پوسٹ واقع ہے جس پر پرانے وقتوں میں کبھی کیروسین تیل کا لیمپ جلا کرتا ہوگا۔ اب وہ لیمپ اپنے پنجرے اور شیشوں سمیت غائب ہو چکا ہے۔ اب کھمبے پر صرف ایک بریکٹ بچی ہے جس پر کبوتر یا کوے بیٹھے پہرہ دیا کرتے ہیں۔

ایک دن اس کا ایک اور مصرف بھی نکل آتا ہے جب ایک بھکاری اس بریکٹ سے لٹک کر خودکشی کر لیتا ہے۔ لیکن اس واقعے کو ایک دہائی گزر چکی ہے۔ میں پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اپنے پنشن یافتہ ہونے تک میں نے اس لیمپ پوسٹ کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا جو دور سے ایک ٹوٹی ہوئی صلیب کی مانند دکھائی دیتا ہے اور رات کے دھندلکے میں ایک لمبے لاغر انسان میں بدل جاتا ہے جس کا صرف ایک ہاتھ ہو۔

"تم مجھے نظر انداز نہیں کر سکتے،" ایک دن لیمپ پوسٹ نے جھک کر میرے داہنے کان میں کہا کیونکہ اب میں اسی کان سے کچھ سن پاتا ہوں۔ میں نے مضطرب ہو کر اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ کہیں کسی نے دیکھ لیا تو؟ جانے وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کر بیٹھے۔

"اور تم اتنے حیران کیوں ہو؟"

"تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تم کوئی زندہ چیز نہیں ہو۔ تم اس طرح جھک نہیں سکتے، نہ بات کر سکتے ہو۔ یہ تو ایک بالکل ہی غیر حقیقی بات ہے۔"

"میں جھک تو گیا ہوں،" کھمبے نے کہا۔

مگر وہ تن کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ چینی دندان ساز شانگ فو اپنے رکشا میں واپس لوٹتا نظر آتا ہے۔ یہ شانگ فو ہے جس نے میرے تمام غیر ضروری دانت نکالے ہیں اور تمام غیر ضروری دانت لگائے بھی ہیں جن کے پیچھے میرا کافی وقت صرف ہوتا ہے اور جنھوں نے، ایک طرح سے دیکھا جائے تو، نفسیاتی طور پر مجھے شانگ فو کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جوڑ دیا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں وہ واحد دندان ساز ہے۔ شاید مجھے کسی بی ڈی ایس سے رجوع کرنا چاہیے۔ اب اس طرح کے تعلیم یافتہ ڈاکٹر آنے لگے ہیں، اگرچہ چینی دندان سازوں کی ساکھ ابھی کم نہیں ہوئی ہے۔ شانگ فو نشے میں ہے۔ وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کے بڑے سے گھر کا لکڑی کا سرخ پھاٹک کھلتا ہے اور وہ رکشا کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے۔ اب یہ رکشا کل صبح ہی نکلنے والا ہے۔

"شانگ فو بے اولاد ہے،" کھمبے نے مجھ سے سرگوشی کی ہے، "اور اس کی بیوی اس سے عمر میں دس سال بڑی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ مگر مجھے اس سے کیا؟"

"وہ شہر کا واحد چینی باشندہ ہے۔ تمھیں اس کی حفاظت کرنی چاہیے، تم یہ کیوں نہیں سوچتے؟"

"ارے ہاں، بالکل تمھاری طرح وہ بھی اپنا ایک اینٹیک ویلیو (antique value) رکھتا ہے۔" میں ہنستا ہوں۔ "مجھے تمھاری ہمدردی سمجھ میں آتی ہے۔"

اور اس سے پہلے کہ کھمبا کوئی جواب دے، میں اپنے گھر کی طرف چل دیتا ہوں۔ گھر کے دروازے پر میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ کھمبا سنسان سڑک پر اُداس کھڑا ہے اور شانگ فو کی کوٹھی میں اوپر کا ایک کمرہ روشن ہو گیا ہے۔

دن کے وقت یہ کھمبا کس قدر بدنما اور غیر ضروری دکھائی دیتا ہے۔ پان کھانے والے اس پر انگلیوں کا چونا صاف کرتے ہیں اور جنسی امراض کے ماہر اس پر اپنے اشتہار چپکاتے ہیں، جبکہ سڑک پار شانگ فو کی کوٹھی اس کھمبے کی طرح قدیم ہوتے ہوئے بھی اس پر رنگ و روغن جاری ہے۔ حال ہی میں اس کی دوسری منزل پر واقع کھپریل کے ایک چھپر کے اوپر ایک مرغِ بادنما نصب کیا گیا ہے جسے شانگ فو کے رشتے داروں نے منچوریا سے بھیجا ہے، جہاں وہ سویابین کی کاشت کرتے ہیں۔

"میں نے ایک پورا دور دیکھا ہے۔ میں نے انگریزی دور حکومت میں ہندوستانی فوج کو مارچ کرتے ہوئے برما کے محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے،" کھمبا مجھے بتا رہا ہے۔ "اور میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے جب عادی مجرم اور پاگل لوہے کے کڑے پہنا کر سڑک پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔"

"مجھے ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" میں کہتا ہوں۔ "تم وہی باتیں کہہ رہے ہو جو سب جانتے ہیں۔"

"میں نے بنگال کے دونوں قحط دیکھے ہیں۔"

"آہ!" میں مایوسی سے سر ہلاتا ہوں۔ "تم سے بات کرنا بے کار ہے۔"

کھمبا چپ ہو جاتا ہے۔ ایک چیل آ کر اس کی بریکٹ پر بیٹھ گئی ہے۔ بریکٹ کمزور ہے۔ وہ بہت مشکل سے پرندے کا بوجھ سنبھال پا رہی ہے۔ پرندے کو آرام نہیں ملتا۔ وہ اڑ کر شانگ فو کی کوٹھی کے مرغِ بادنما کی طرف چلا جاتا ہے جو واپس لوٹتے ہوئے مون سون کے سبب گھڑی کے رخ پر چکر لگا رہا ہے۔

''یہ شانگ فو، یہ میرے سامنے پیدا ہوا،'' آخر کار کھمبا کہہ اٹھتا ہے۔

''یہ ہوئی نا کوئی بات!'' میں سر تاپا توجہ بن جاتا ہوں۔

''اس کا باپ بلا کا انجی تھا،'' کھمبا کہتا رہا۔ ''وہ شنگھائی سے زبردستی پانی کے جہاز پر مزدور بنا کر لایا گیا تھا۔ مگر خضر پور کی بندرگاہ میں وہ اس چینی جہاز سے بھاگ نکلا۔ اس کے بڑے سے چہرے پر ایک اکلوتا تِل تھا جس سے دو لانبے بال نکلے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں تھیں ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے اس کی آنکھیں ایسی تھیں کہ نظر نہیں آتی تھیں۔ مگر سب کو پتا تھا اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا آسان کام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی چٹائی پر لیٹا رہتا اور پائپ سے افیم کے کش لگایا کرتا۔''

کھمبا پھر دو دن تک خاموش رہتا ہے اور مجھے شک ہونے لگتا ہے۔۔۔ کیا یہ میرا واہمہ تھا؟ کیا واقعی میں بوڑھا ہو رہا ہوں؟

''شاید تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو،'' تیسرے دن میں اسے اکساتا ہوں۔ مگر کھمبا خاموش رہتا ہے۔

''ایسا نہیں ہے کہ میں تمھاری باتوں میں یقین نہیں کرتا،'' میں کہتا ہوں، ''مگر تم سمجھ سکتے ہو، میں آج کا انسان تو ہوں نہیں۔ میں نے بھی اس ملک کو تقسیم ہوتے دیکھا ہے، میں نے بھی اس کی سڑکوں پر نفرت پھیلانے والوں کی تعداد کو بڑھتے دیکھا ہے، بلکہ ان میں سے کچھ تو اب ہمارے ملک کے نمائندے بن کر دوسرے ملکوں میں بھی جانے لگے ہیں۔ میں بھی دیکھ سکتا ہوں کہ کس طرح دن بہ دن لوگ نقل و حمل میں استعمال ہونے والے جانوروں کی طرح جینے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔''

''اور تم اس ملک کے قوانین نافذ کرنے والوں کے بارے میں بات نہیں کرو گے،'' یکایک کھمبا کہہ اٹھتا ہے، ''جو اپنے شہریوں کی مقعد تک کو کھنگال لینا چاہتا ہے؟''

''میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں، میں خود ایک سرکاری دفتر میں اپنی زندگی گزار آیا ہوں،'' میں شرمندگی سے کہتا ہوں۔ ''لوگوں کے ساتھ سدومت کرنے کے عمل میں میں بھی برابر کا شریک رہا ہوں۔ اور اب میری حیثیت ایک ناسزا یافتہ مجرم سے بھی بدتر ہے۔ میرے ضمیر پر ایک بڑا بوجھ ہے۔''

''آہ! اور میں تمھیں ایک اچھا انسان سمجھ رہا تھا۔''

میں کھمبے کو اپنے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔ مگر مجھے معلوم ہے میری زندگی میں ایسا کوئی نادر واقعہ کبھی پیش نہیں آیا جو کسی کے لیے دلچسپی کا حامل ہو۔ میں اس شہر میں پیدا ہوا، بڑا ہوا، نوکری کی، بچے پیدا کیے اور اب پنشن یافتہ ہوں۔ میرے بہی خواہوں اور میری بدگوئی کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو ایک لمبی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان سے مجھے بچنا بھی پڑتا ہے اور گاہے بہ گاہے مجھے ان کی ضرورت بھی پڑتی رہتی ہے۔ زندگی کے آخری موڑ پر کھڑے ہو کر آپ دیکھتے ہیں آپ کے ساتھ نیا کچھ بھی نہیں ہوتا، سارے رشتے ناتے، واقعات و حادثات خود کو دہراتے رہتے ہیں۔ حافظے کا دیو آپ کو اپنے چنگل میں لیے اڑتا رہتا ہے۔

میرے گھر والوں کا خیال ہے میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ میں بلاوجہ بیمار پڑتا ہوں اور بلاوجہ ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ میں ساری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں اور اب میرے اور بچوں کے درمیان ایک نسل کا فاصلہ ہو چکا ہے۔ میں انھیں افق پر غائب ہوتے دیکھتا رہتا ہوں، بلکہ ان میں سے بہت سارے تو سمندر پار جا چکے ہیں۔ سماج میں رہ کر مجھ سے جن باتوں کی توقع کی جاتی ہے، میں ان میں پورا نہیں اترتا اور مجھے خود اس پر حیرت ہوتی ہے، کیونکہ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سماج کے مروجہ اصولوں کو دھیان میں رکھ کر گزاری ہے۔ میں اپنے کمرے میں، اپنے بستر پر کھڑکی کے رخ لیٹا آسمان کی طرف تاکتا رہتا ہوں جس میں شانگ فو کا مرغِ بادنما اپنا چکر لگاتا رہتا ہے۔ میری کتابوں کی الماری کے شیشے دھندلے پڑ چکے ہیں، اس پر لگے ہوئے قفل پر زنگ چڑھ چکا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے بہتیری کتابوں کو میں نے چھوا تک نہیں ہے، جبکہ ایک وقت تھا میں ان کی تلاش میں ٹرین اور بسوں میں میلوں کی مسافت طے کیا کرتا تھا۔ ہر سال نہ جانے کون میری مغربی دیوار پر ایک کیلنڈر ٹانگ جاتا ہے، اس بات سے لاپرواہ کہ مجھے اب اس کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ یہ کیلنڈر ہوا کی زد میں آ کر دیوار کے پلستر پر ایک نیم بیضوی لکیر کھینچ ڈالتا ہے اور دن بہ دن اسے کسی زخم کی طرح گہرا کرتا جاتا ہے۔ کبھی کبھار میں چونک کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ کون ہوں میں؟ اس سیارے پر میرا کام کیا ہے؟ جانے کتنا وقت لگ جاتا ہے تب جا کر میں اس قابل ہو پاتا ہوں کہ زمان و مکاں کے نظام میں خود کو دریافت کر سکوں۔ اس بار سردی زور کی آئی ہے۔ میں ایک لمبی بیماری کا شکار ہو جاتا ہوں۔ موسم سرما عمر دراز لوگوں کے لیے دوسری دنیا کی طرف کوچ کرنے کا موسم ہوتا ہے۔ کیا میں اس سفر کے لیے تیار ہوں؟ میرے جسم کی ہڈیاں سوکھ چکی ہیں۔ مجھے ٹھنڈ کے خلاف بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اکثر میرے نہ چاہنے پر بھی میری کھڑکی میں کہرا بھر جاتا ہے۔ میرے گھر والے مجھ سے پریشان ہیں۔ میں انھیں اپنی کھڑکی بند کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کبھی جب مرغِ بادنما کہرے میں تحلیل ہو کر نظر سے غائب ہو جاتا ہے تو مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ میں اپنی عینک ڈھونڈ کر اس کے اندر سے آسمان کا جائزہ لیتا ہوں۔ وہ مجھے کہیں گردش کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ پھر نظر آنے لگتا ہے۔ وہ بہت دھیمی رفتار سے چکر لگا رہا ہے، شاید گھڑی کے رخ پر۔۔۔ نہیں، شاید گھڑی کے مخالف۔ ہاں وہ گھڑی کے مخالف چکر لگا رہا ہے۔ پھر وہ غائب ہو جاتا ہے۔ مگر اب مجھے اطمینان ہے۔ میں بستر پر لیٹ کر چین کی سانس لیتا ہوں۔ لحاف اور کمبل اپنی رطوبت بھری

ناک تک کھینچ کر مسکراتا ہوں۔ اگر اس جاڑے سے گزر پایا تو شاید دوبارہ شانگ فو کے کلینک جاؤں۔ میرے کچھ اور دانت ہل رہے ہیں۔ شاید اس بار شانگ فو میرے دانتوں کے ساتھ کوئی چمتکار کر سکے۔ دنیا کتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ سائنس الہ دین کے جن کی طرح انسان کو اپنی ہتھیلی پر لیے اڑ رہی ہے، اس کی ہر خواہش پوری کرتی جا رہی ہے۔ اگلے سو سال کے اندر ہمارے لیے کرنے کو کچھ بھی نہ رہ جائے گا۔ ہماری حیثیت ایک تماش بین سے زیادہ کی نہ ہو گی۔

سردی میں کمی آ گئی ہے۔ دوسرے تمام عمر دراز لوگوں کی طرح میری بھی طبیعت سدھرنے لگی ہے۔ ایک عرصے کے بعد میں گہری نیند سویا ہوں اور اب رات ہو چکی ہے۔ رات صاف ہے، کہیں پر کہرے کا نام و نشان نہیں۔ کھڑکی سے آسمان دکھائی دے رہا ہے جس میں تارے روشن ہیں۔ میرے لیے گرم سوپ لایا جاتا ہے۔ میں پیٹ بھر کر پیتا ہوں۔ پھر سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید یہ آدھی رات کا وقت ہے جب میں اپنے بستر سے اتر کر دو چار قدم چلتا ہوں۔ اس سے زیادہ تازہ دم میں نے زندگی میں کبھی خود کو نہ محسوس کیا ہو گا۔ میں کمبل کو اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولتا ہوں۔ میرے سب سے چھوٹے بیٹے کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ اپنے کمپیوٹر پر کچھ پرنٹ کر رہا ہے۔ وہ کبھی شاعر بننا چاہتا تھا۔ وہ شاعر اس کے اندر جانے کہاں گم ہو گیا۔ کچے آنگن سے گزر کر میں صدر دروازہ کھولتا ہوں اور اب میں باہر فٹ پاتھ پر کھڑا ہوں۔ سڑک پر شانگ فو کا گھر تاریک پڑا ہے۔ چاند کرۂ ارض کے دوسرے نصف پر چمک رہا ہو گا جسے دھوپ میں لوگ دیکھ نہ پا رہے ہوں گے۔ اس پوری سڑک پر صرف میرے کمرے کی کھڑکی سے روشنی کا ایک مثلث فٹ پاتھ سے گزر کر سڑک پر گر رہا ہے۔ میری کھڑکی کے نیچے ایک متروک سنگ میل ہے جس پر بچے دن کے وقت کرکٹ کھیلتے ہیں اور رات کے وقت میں بیٹھتا ہوں۔ میں اس پر بیٹھ کر (میں اپنے کولھوں میں اس کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہوں) سامنے کھڑے لیمپ پوسٹ کی طرف تاکتا ہوں۔ اس کا ہیولا مجھے دکھائی دیتا ہے۔ میں سڑک پار شانگ فو کی بالائی منزل کے چھپر کو تاکتا ہوں۔ مرغ بادنما گھر کے خاکے سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ اگر تارے کچھ اور روشن ہوتے!

ہوا بند ہے۔ سڑک کی دونوں جانب دور تک ایک بھی انسانی سایہ نہیں۔ کل ملا کر یہ میری زندگی کی ایک اچھی رات ہے۔ اور جب میں یہ سوچ رہا ہوں، مجھے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ دو آدمی اپنے کندھوں پر ایک سیڑھی سنبھالے ہوئے ایک اُجالیے اور کنستر کے ساتھ میرے سامنے سے گزرتے ہیں۔ دونوں اپنے اُجالیے کی روشنی میں مسکرا کر میری طرف تاکتے ہیں اور کھمبے سے سیڑھی ٹکا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

"لیمپ جلانے والے۔۔۔" میں حیرانی سے سوچتا ہوں مگر سنگ میل پر بیٹھا رہتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں، پہلا آدمی سیڑھی پر چڑھ کر بریکٹ تک پہنچ گیا ہے، دوسرا اسے کنستر تھما رہا ہے۔۔۔ اور تب، میرے خدا! میں اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ پہلی بار میں دیکھتا ہوں کہ لیمپ پوسٹ کی بریکٹ سے ایک لیمپ لٹک رہا ہے جس کے اندر وہ پیرافین انڈیل رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کو پیرافین کا کنستر واپس دے کر اُجالیہ لے لیتا ہے اور تب وہ واقعہ ہوتا ہے جو اس کہانی کا اہم موڑ ہے۔ لیمپ اپنے رنگین شیشوں کے اندر جل اٹھتا ہے۔ سیڑھی ہٹالی جاتی ہے اور وہ دونوں سیڑھی کندھوں سے لٹکائے واپس لوٹتے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر دوبارہ مسکراتے ہیں اور سڑک پر چلتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں۔

ایک پل کے لیے میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ مگر میرے یقین نہ کرنے پر بھی لیمپ پوسٹ کی روشنی سڑک پر پھیل رہی ہے اور آس پاس کی دیواروں پر جا ٹکی ہے۔ میں لیمپ پوسٹ کے پاس جاتا ہوں۔

کیا واقعی! میں ششدر سا لیمپ پوسٹ کو جلتے دیکھتا رہتا ہوں۔ اس میں سفید، ہرے اور نیلے رنگ کے شیشے لگے ہیں۔ اندر فلیتہ خاصی لمبی لو دے رہا ہے جس نے اپنے دندانے دار بیرم کے سبب ماہی دم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ لیمپ فلزکاری ایک نادر نمونہ ہے جس کے بالائی سرے کی مجوّف سطح کو انگلستانی تاج کی شکل دے دی گئی ہے۔

"ہاں!" لیمپ پوسٹ کی سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ "یہ میری زندگی کی ایک اچھی رات ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے سب کچھ صحیح سمت کی طرف لوٹ رہا ہے۔"

"مجھے سوچنے دو،" میں کہتا ہوں۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے سڑک کی دونوں جانب دور تک قدیم دور کے یہ دورویہ لیمپ روشن دکھائی دیتے ہیں۔ اسی درمیان آسمان پر کچھ نئے تارے بھی بڑی تعداد میں آ گئے ہیں جن کی روشنی میں شانگ فو کا مرغ بادنما نظر آنے لگا ہے۔ مجھے اپنی رگوں میں گرم خون دوڑتا سنائی دیتا ہے۔ "کیا یہ ممکن ہے؟"

"بالکل!" لیمپ پوسٹ وثوق کے ساتھ کہتا ہے۔ "اچھے دنوں کی شروعات کبھی بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھو ہم دونوں ایک دوسرے کو کتنا صحیح سمجھ پا رہے ہیں۔"

"وہ تو ہے۔" میں کھمبے پر اپنے دونوں ہاتھ ٹکا کر اوپر تاکتا ہوں جہاں لیمپ اپنے شیشوں کے اندر جل رہا ہے اور اس کے پس منظر میں تارے محدب آسمان پر اپنے جاوداں سفر پر رواں ہیں۔ "اور میں سمجھ رہا تھا یہ میری زندگی کی آخری سردی ہے۔ واقعی یہ ایک نئی شروعات ہے۔ ابھی سفر کا موسم نہیں آیا۔"

"تم سفر کے بارے میں سوچ کیسے سکتے ہو؟" لیمپ پوسٹ کی آواز میں ہمدردی ہے۔ "ایک نئی دنیا کے لیے خود کو تیار کر لو۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔ ابھی امکانات نے اپنے تمام دروازے کھولے ہی کہاں ہیں۔"

"شکریہ!" میں مسکراتا ہوں اور لیمپ کی قدیم روشنی میں سڑک پر چلنے لگتا ہوں۔ میں اس روشنی کے حلقے کے آخری سرے سے لوٹ آتا ہوں، اسے آنکھوں میں بھر کر کھڑا رہتا ہوں۔ آنکھیں کھول کر مسکراتا ہوں۔

"واقعی امکانات نے اپنے کچھ دروازے کھولے تو ہیں۔"

رات کا باقی حصہ میں سنگ میل پر بیٹھ کر گزار دیتا ہوں۔ میری آنکھیں لیمپ پوسٹ کے رنگین شیشوں سے ہٹتی ہی نہیں۔۔۔ یہاں تک کہ کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان سنائی دیتی ہے۔ میں اپنے کمرے میں لوٹتا ہوں اور بڑی گہری نیند سو جاتا ہوں۔ دن کا بڑا حصہ بیت چکا ہے جب میں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ سورج آسمان پر نہیں ہے۔ میں کھڑکی کے باہر تاکتا ہوں۔ کہرا سڑک پر اِدھر سے اُدھر پھیل رہا ہے۔ میری غشی ابھی دور نہیں ہوئی ہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ میں رات کے واقعے کو یاد کر کے مسکرانا چاہتا ہوں، لیکن مسکرا نہیں پاتا۔ میں اولین ضروریات سے فراغت پا کر باہر سڑک پر آتا ہوں اور میری نظر لیمپ پوسٹ کی طرف اٹھ جاتی ہے جو اب وہاں نہیں ہے۔ اب اس جگہ پر ایک اونچا بجلی کا کھمبا رسی کے سہارے کھڑا کیا جا رہا ہے۔ میں گھبرا کر سڑک پر دور تک نظر دوڑاتا ہوں۔ کہیں میں نے غلط تو نہیں دیکھ لیا ہے؟ مگر سڑک پر تاحد نظر اسی طرح کے کھمبے کھڑے ہیں یا نصب کیے جا رہے ہیں۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" میں ایک رسی کھینچنے والے سے پوچھتا ہوں۔ وہ ایک ان پڑھ مزدور ہے۔ وہ میری بات سمجھ نہیں پاتا۔

"بس دو دن کی بات ہے جناب، پھر آپ لوگوں کو یہاں رات کی جگہ دن دکھائی دے گا،" ایک خوش پوش اوور سیئر مداخلت کرتا ہے۔ اور تب مجھے پر انا لیمپ پوسٹ زمین پر پڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بریکٹ اس کے برابر رکھی ہوئی ہے۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" میں اس سفید پوش شخص سے کہتا ہوں جو کام کی نگرانی کر رہا ہے۔ "یہ فیصلہ لینے والے تم لوگ ہوتے کون ہو؟ ہم سے ہماری راتوں کو چھیننے کا حق تمھیں کس نے دیا؟"

وہ شخص کچھ نہ سمجھ کر سر ہلاتا ہے مگر احتراماً خاموش رہتا ہے۔ میں جھک کر گرے ہوئے کھمبے پر اپنی ہمدرد انگلیاں رکھتا ہوں۔

"خدا حافظ!" کھمبے نے مجھ سے سرگوشی کی ہے۔ "اپنے آنسوؤں پر قابو رکھو۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔"

"اسے نہ چھونا!" مجھے اوور سیئر کی تنبیہ سنائی دیتی ہے۔ "یہ سرکاری پراپرٹی ہے۔"

"خدا حافظ!" میں کھمبے کو جواب دیتا ہوں اور مڑ کر اوور سیئر سے مخاطب ہوتا ہوں۔ "تم اس کے لیے ذمہ دار ٹھہرائے جاؤ گے۔"

وہ لوگ بجلی کے کھمبے کو گاڑ کر پرانا کھمبا ٹرک میں لاد کر چلے گئے ہیں۔ صرف ایک راج مستری مزدور کی مدد سے اس کی بنیاد کو سیمنٹ ریت اور کنکریٹ سے بھر رہا ہے۔ سورج نے بادل کے کناروں سے ایک پل کے لیے جھانکا ہے اور مجھے لیمپ پوسٹ کے سنگ میل پر بیٹھا پایا ہے۔ شانگ فو کا مرغِ بادنما تیزی سے چکر لگا رہا ہے، جیسے اس پر دورہ پڑ گیا ہو۔ دور وہ یہ گھروں کے باورچی خانوں کا دھواں کہرے میں ملنے لگا ہے۔ اس سڑک پر شام کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ میری بائیں پسلیوں میں ایک ٹیس ابھرتی ہے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں لوٹتا ہوں۔ دو دن تک یہ درد مجھے بے چین رکھتا ہے۔ میں نے اس بارے میں کسی کو بتایا نہیں ہے۔ تیسری رات مجھے گہری نیند آ جاتی ہے۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے میں اب اس نیند سے کبھی جاگ نہ پاؤں گا۔ میں خواب میں لیمپ پوسٹ کو دیکھتا ہوں جس سے ایک بھکاری لٹک رہا ہے۔ میں شانگ فو کے باپ کو بھی دیکھتا ہوں جو چٹائی پر لیٹا ہوا پائپ پی رہا ہے۔

"یہ شب اپنے اپنے کرم کا پھل ہے،" وہ کہتا ہے، اور میں دیکھتا ہوں وہ اپنی بغیر آنکھوں والی آنکھوں سے مجھے تاک رہا ہے۔

ایک ہفتے کے بعد میں سڑک پر آیا ہوں۔ سنگ میل اپنی جگہ پر نصب ہے۔ مرغِ بادنما سرخ آسمان کے نیچے دھیرے دھیرے چکر لگا رہا ہے۔ نئے لیمپ پوسٹ کے نیچے بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ میں سنگ میل پر بیٹھا بیٹھا دن کو دم توڑتے دیکھ رہا ہوں۔ اندھیرا اچھا خاصا پھیل چکا ہے جب مجھ پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ لڑکے کرکٹ کھیل کر جا چکے ہیں اور میں اکیلا سنگ میل پر بیٹھا ہوا ہوں۔ کوئی راہ گیر اندھیرے میں مجھ سے ٹکرا نہ جائے۔ شانگ فو کی کوٹھی کی بالائی منزل کی کھڑکیاں روشن ہو گئی ہیں۔ کہرا شہر کی کثافت کے ساتھ مل کر کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ ابھی میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی ہے کہ لیمپ پوسٹ کی چوٹی پر ایک ہلکی، یرقان زدہ روشنی جاگ اٹھتی ہے۔ میں اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں۔ دھیرے دھیرے لیمپ کی روشنی میں شدت آ جاتی ہے اور آخر کار یہ پوری آب و تاب کے ساتھ جل اٹھتا ہے۔ کہرے کے باوجود یہ لیمپ ہر شے کو اپنی حیرت انگیز روشنی کی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ کتنی بے باکی سے ہر دیوار پر اپنی پیلی یرقان زدہ روشنی پھیلا رہا ہے، یہاں تک کہ شانگ فو کا مرغِ بادنما بھی اس میں

صاف نظر آرہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں شہر کی کسی اجنبی سڑک پر چلا آیا ہوں۔ میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس لیمپ پوسٹ کے نیچے چلا جاتا ہوں۔ یہ ایک بہت بڑا سوڈیم لیمپ ہے اور کم از کم پچیس فیٹ کی اونچائی پر ہونے کے باوجود اس کی پیلی روشنی اتنی تیز ہے کہ میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کو بھی پڑھ سکتا ہوں۔

"ہیلو لیمپ پوسٹ، کیسے ہو؟"

میں کھمبے پر ہاتھ رکھ کر اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔ لیمپ پوسٹ کسی دیو کی طرح کھڑا اپنے عفریتی لیمپ کی واحد آنکھ سے میری طرف سرد مہری سے تاک رہا ہے۔ اس کی روشنی زرد سیال کی طرح میری آنکھوں میں بھر رہی ہے۔ وہ میری بات کا جواب نہیں دیتا۔ شاید اسے ایک بہت بڑے رقبے پر روشنی پھیلانی پڑتی ہے اور میرے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہے۔

میں شکست خوردہ گھر کے اندر لوٹتا ہوں۔ سوڈیم ویپر لیمپ کی زردی مائل روشنی میرے کمرے میں بھر گئی ہے اور کمرہ اجنبی دکھائی پڑ رہا ہے۔ میں کھڑکی کے پاس جاتا ہوں، ایک نظر نئے لیمپ پوسٹ پر ڈالتا ہوں، دوسری نظر مرغ بادنما کی طرف دوڑاتا ہوں جو اتنی دوری کے باوجود صاف گردش کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ آہ! اب اس کا اسرار ختم ہو چکا ہے۔ میں کھڑکی کے دونوں کواڑ سختی سے بند کر کے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔

آنکھیں بند کرتے ہی مجھے پرانا لیمپ پوسٹ دکھائی دیتا ہے جس کے سامنے سے لیمپ جلانے والے سیڑھی اٹھائے ہوئے گزر رہے ہیں۔ میں بھکاری کو بھی دیکھتا ہوں جو لیمپ پوسٹ سے لٹک رہا ہے اور جس کے دونوں ہاتھ ایڑیوں تک لانبے ہو گئے ہیں۔ اور پھر مجھے شانگ فو کا باپ دکھائی دیتا ہے جو ایک پتلی چٹائی پر لیٹا ہوا اپنکھا جھل رہا ہے۔

"یہ شب اپنے اپنے کرم کا پھل ہے،" وہ افیم کی نلکی سے منھ ہٹا کر کہتا ہے۔

کبھی دو پیر فرتوت

Sleeping as quiet as death, side by wrinkled side, toothless salt and brown, like two old kippers in a box .

Dylan Thomas: Under Milk Wood

بہت عرصہ نہیں گزرا کہ کلکتہ کے ایک پبلک پارک میں دو پنشن یافتہ بوڑھوں کی اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ چھ برس پہلے دو مختلف تاریخوں میں دونوں سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوے تھے اور تب سے تاریخ ان دونوں کو اس دن کے لیے تیار کر رہی تھی جب دونوں ایک ہی بنچ پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوے پائے جائیں۔ بظاہر دونوں بوڑھے اپنی اپنی زندگی جی چکے تھے اور اب اپنے بچے کھچے لمحوں کا مصرف نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر عمر کے اس آخری مقام پر پہنچ کر بھی دونوں میں قطبین کا تضاد تھا۔

پہلا بوڑھا گذشتہ چھ برسوں سے، یعنی جب سے وہ ریٹائر ہوا تھا، بشرطیکہ وہ کلکتہ سے غیر حاضر نہ ہو، ہر شام بلاناغہ پارک کے اندر گھاس کے میدان کے کنارے استادہ لکڑی یا سیمنٹ کے بنچوں کی قطار میں کسی نہ کسی ایک پر دکھائی دیتا آرہا تھا۔ وہ بہت کم گو تھا اور جب وہ بنچ پر بیٹھتا تو اپنی چھتری کو دونوں ٹانگوں کے بیچ رکھ کر اس کے عمودی حصے پر ٹھوڑی ٹکا دیتا۔ عموماً وہ کسی دور افتادہ خالی بنچ کو ترجیح دیتا۔ مگر کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ تقریباً ہر بنچ پر لوگ قابض ہوتے۔ اس صورت میں وہ اس پر اکتفا کرتا جس پر کم سے کم تعداد میں لوگ بیٹھے ہوں اور وہ اس کے کنارے اس طرح دبک کر بیٹھ جاتا جیسے مخاطب کیے جانے پر وقت ضائع کیے بغیر چھتری اُٹھا کر چل پڑے گا۔ ان چھ برسوں میں اس کی داہنی آنکھ کا آپریشن ہو چکا تھا اور اس کی بھنوؤں کے بہت سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ اس کی چندیا صاف تھی اور اکثر شام کی بچی کھچی دھوپ میں وہ کسی لاش کے مانند نظر آتا جو قریب واقع میڈیکل کالج کے مردہ گھر سے سڑک پار کر کے یہاں چلی آئی ہو۔ کل ملا کر اس کا چہرہ کسی پنشن یافتہ مثالی سرکاری نوکر کی طرح تھا جو اپنا سب کچھ آفس کے احاطے کے اندر چھوڑ آیا ہو۔

دوسرا بوڑھا، چونکہ وہ ریلوے کی سروس سے سبکدوش ہوا تھا، اس لیے اسے سال میں دو پاس مل جاتے اور وہ اندرون ملک کی سیر کرنے نکل جاتا۔ جوانی کے آخری دور میں جوئے کی لت نے اسے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ مگر حال کے برسوں میں وہ زیادہ تر مذہبی مقامات (بنارس، پوری، تارکیشور وغیرہ) کا رخ کرنے لگا تھا۔ اس نے پوری کے ایک آشرم میں کٹیا بھی خرید رکھی تھی، باقی کی عمر وہاں سکون سے گزارنے کے لیے۔ مگر فی الحال وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں ہو پایا تھا، اس لیے وہ اپنے شب و روز اخبارات کی ورق گردانی کرنے، اپنی عمارت کے باہر چبوترے پر بیٹھے رہنے اور اونگھنے میں گزارا کرتا یا پبلک پارک کا رخ کرتا۔ اکثر اونگھنے کی حالت میں لاشعوری طور پر وہ خود کو انٹی پوڈیز* پر کھڑا پاتا جہاں اس کے چاروں اطراف بحرالکاہل کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہوتیں۔ مگر ان موجوں پر بھی ریس کورس کے گھوڑے تیر رہے ہوتے یا تاش کے جوکر کشتیوں پر چپو چلا رہے ہوتے یا گرداب رولیٹ** کی شکل میں چکر لگاتے ہوے اس کا پیچھا کرتے۔ یہ انٹی پوڈیز اسکول کے دنوں سے اس کے ذہن میں بس گئے تھے جب جغرافیہ کے استاد نے اپنے طالب علموں کے ذہنوں میں زمین کی صحیح شکل واضح کرنے کے لیے ایک گلوب کا سہارا لیا تھا۔

ایک شام جب سورج تھکا ہارا، پارک کی چہار دیواری کے باہر لگائے گئے کدم اور کرنج کے پیڑوں کے اوپر آخری دم لے رہا تھا اس نے گلگوتھنے سے ایک بچے کو دیکھا جو آیا کے ساتھ گھاس کے میدان سے گزر رہا تھا۔ بچہ جانے کیوں ان دونوں کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر ہنس پڑا اور دور تک مڑ مڑ کر ہنستا رہا۔ پہلا بوڑھا اس بچے کی ہنسی کے معمے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے ایک اور ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ اسی کا ہم عمر ایک آدمی تھا جو بنچ کے دوسرے کنارے بیٹھا تھا۔

"وہ کیوں ہنس رہا تھا؟" اپنی مرضی کے خلاف بوڑھے نے پوچھ لیا، گرچہ اس بچے کی ہنسی سے زیادہ اپنے ہم عمر کی ہنسی اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے یہ دیکھ کر کہ ہم دونوں کتنے بوڑھے ہیں،" اس کے ہم عمر نے جواب دیا اور ایک بار پھر ہنسنے لگا۔

"تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں اس بچے کی عمر کا ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔" بوڑھے نے خواہ مخواہ بچے کی طرفداری شروع کر دی۔ "اور بوڑھے بھلا ہوتے بھی کس لیے ہیں؟" اپنے آخری جملے کی فراخدلی پر خود اسے حیرت ہوئی۔

"نیم تلہ کے برقی چولھوں میں جلنے کے لیے، اور کس لیے!" اس کا ہم عمر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر اس نے اپنی ہنسی روک دی اور اس کی طرف جھک کر پوچھ لیا۔ "ایک راز کی بات بتاؤ۔ کیا تم مرنے کے بعد اپنے پوسٹ مارٹم کی اجازت دو گے؟"

"عجیب سوال ہے۔ اس وقت میں انھیں روکنے کے لیے زندہ کب رہوں گا؟"

"وصیت نامہ کے ذریعے تم اس سلسلے میں ان کی رہنمائی تو کر ہی سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے اگر موت کے حالات نارمل رہیں تو۔"

"ارے ٹھیک ہے، تب کاتب دیکھا جائے گا،" بوڑھے نے ٹالنے کے لیے کہا۔ مگر اسے اندر ہی اندر اس سوال نے مضطرب کر دیا تھا۔ پل بھر کے لیے وہ وسیع و عریض میدان کی طرف تاکتا رہا جس پر موسم سرما میں سرکس کے شامیانے اور تنبو لگتے۔ پارک کے باہر عمارتیں کارڈبورڈ کے ڈبوں کی طرح اونچی کھڑی تھیں جیسے ابھی ابھی کوئی ننھا منا ہاتھ اٹھے گا اور انھیں زمین دوز کر دے گا۔

مگر واقعی وہ بچہ ہنس کیوں رہا تھا؟ اس نے سوچا۔

بعد میں اسے یہ سوچ کر تعجب ہوا تھا کہ وہ اس اجنبی سے کتنی ساری باتیں کہہ گیا تھا جو اس کی کم گوئی کی عادت سے قطعی طور پر مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ مگر پھر بڑے پراسرار طور پر دوسری شام بھی ان کی ملاقات ہو گئی اور تیسری شام بھی اور پھر ہر شام ان کی ملاقات ہونے لگی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کا نام نہیں پوچھا تھا اور نہ وہ اپنے ذاتی معاملات پر گفتگو کرتے تھے، اور یہ اچھا تھا۔ اس طرح بہت سارے تکلیف دہ موضوعات سے احتراز کیا جا سکتا تھا۔

"تم ہمیشہ یہ چھتری لیے ہوئے کیوں نظر آتے ہو؟" ایک دن دوسرے بوڑھے نے پوچھ لیا، "جبکہ موسم اچھا جا رہا ہے۔"

"اپنی چھتری کے بغیر میں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہوں،" بوڑھے نے ناخوشگواری کے ساتھ کہا۔ "دراصل ساری زندگی میں اسے ڈھوتا آیا ہوں اور اب اس سے احتراز میرے لیے ممکن نہیں۔"

"ایک چھتری سے تم تحفظ کی کون سی امید رکھ سکتے ہو؟"

"کیوں!" بوڑھے نے تنک کر کہا۔ "دھوپ اور بارش کا ذکر نہ بھی کروں تو بھی اس کے بہت سارے فائدے ہیں۔ فرض کر لو ہم لوگ اس بنچ پر بیٹھے ہیں اور ایک سانپ گھاس کے اندر سے رینگ کر ہماری ٹانگوں کے درمیان نکل آیا ہو۔ ہم اس سے اپنا دفاع تو کر ہی سکتے ہیں۔ یا یوں سمجھ لو کہ ایک رات تمھیں لوٹنے میں دیر ہو جاتی ہے اور تم وقت بچانے کے لیے کار مائیکل ہاسپٹل کا راستہ اپنا لیتے ہو جہاں تمھیں فٹ پاتھ پر ایک لاش پڑی ملتی ہے۔ تم اس چھتری کی نوک سے چھو کر دیکھ تو سکتے ہو کہ وہ زندہ ہے یا مردہ۔ اور سچ پوچھو تو مجھے یاد نہیں میں نے کتنی بار خود کو اس کے سہارے آوارہ کتوں کے حملوں سے بچایا ہے۔"

"بہت خوب، اور پھر اس چھتری کا ایک اور فائدہ بھی تو ہے۔" دوسرے بوڑھے کو اپنی ہنسی روکنے میں شدید محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ "تم بنچ پر بیٹھے ہو کہ تم دیکھتے ہو ایک ایسے آدمی کا سامنا ہو جانے کا خدشہ ہے جس سے تم ملنا نہیں چاہتے اور تم چھتری کھول کر آرام سے اس کے پیچھے دبک لیتے ہو۔ ہے نا یہ کمال کی بات! ہاہاہا!" وہ معمول کے مطابق کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

"تم سرکس میں جوکر رہ چکے ہو کیا؟"

"نہیں۔ میں بارہ سال تک کچھوا بن کر ہوگلی ندی کا کیچڑ چھانتا رہا ہوں،" بوڑھے نے جوابی فقرہ کسا۔

پارک کے اندر سرکس کے لیے وقف وسیع و عریض میدان کے تین اطراف فینسنگ وال تھی جس سے لگے گھنے یا کم گھنے پیڑوں (بادام، کدم، اشوک، چھتیان، کرنج) کی قطار۔ ان پیڑوں کے نیچے مناسب فاصلوں پر سیمنٹ یا لکڑی کے بنچ زمین پر آڑے ترچھے نصب تھے۔ سیر کرنے والوں کے لیے پارک کے اندر میدان کو چاروں اطراف سے گھیر کر تارکول کی ایک سڑک بچھائی گئی تھی۔ جب رات کی روشنیاں باہر کی عمارتوں کو اندر سے جگمگا دیتیں تو دو ایک جگہ کارپوریشن کے لگائے گئے ہیلوجن لیمپ کے باوجود میدان نیم تاریکی میں ڈوبنے لگتا جس کا فائدہ لوٹنے کے لیے بہت سارے جوڑے آتے اور گھاس کے دبیز قالین پر بیٹھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتے ہوئے وقت گزارتے۔ دونوں بوڑھے لاتعلقی سے ان کی طرف دیکھتے رہتے جیسے جو خرافات وہاں ہو رہی تھی اس سے انھیں کوئی تعلق نہ ہو۔ یوں بھی عرصہ ہوا کہ انھوں نے سماج کی برائیوں پر اپنا ناقدانہ فیصلہ دینا بند کر دیا تھا۔

"زندگی ایک بڑا اکتا دینے والا کھیل ہے،" ایک دن دوسرے بوڑھے نے فلسفیانہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔ "اوپر والا بڑا خطرناک اسکورر ہے۔ تم کتنے بھی گول کرو، وہ گول برابر کر دیتا ہے۔ آخر میں تمھیں صفر ہی ہاتھ آتا ہے۔"

"تم کیا مرنے کے بارے میں سوچنے لگے ہو؟"

"مر کر کیا فائدہ ہوگا؟ پیڑ پھل پھول دینا بند کر دے یا اس پر پتے نہ بھی آئیں تو بھی اس کا کھڑا رہنا اچھا ہے۔ ارے اس کے اندر سانپ اور گلہریاں تو پناہ پا ہی سکتے ہیں۔"

دن کی ڈھلتی ہوئی روشنی میں دونوں کی عینکیں اس طرح جل اٹھتیں جیسے گرانڈ ہوٹل کی شوونڈو سے دو Dummies لا کر ایک دوسری کے روبرو رکھ دی گئی ہوں۔ پہلا بوڑھا چونکہ دھوتی کرتا پہننے کا عادی تھا اس لیے دوسرے بوڑھے کے مقابلے میں، جو پرانی تراش کی پتلون اور شرٹ پہن کر آتا، زیادہ بوڑھا دکھائی دیتا۔

"تم جسمانی طور پر اب بھی چست ہو اگر تمھارے کپڑے کی بات مان لی جائے۔ شاید مجھ سے زیادہ لمبی عمر پاؤ گے تم۔"

"بد دعا مت دو،" دوسرے بوڑھے نے کہا۔ "میرے دادا پچاس تک پہنچے پہنچتے بستر سے لگ گئے، مگر اس کے بعد بھی وہ تیس برس تک زندہ رہے۔ سب کی ناک میں دم کر دیا تھا بڑے میاں نے۔ یہ کہنا مشکل ہے۔"

پھر دوسرے بوڑھے کو ایک ترکیب سوجھی۔ "کیوں نہ ٹاس کر لیں۔ اگر ہیڈ ہوا تو تم لمبی عمر پاؤ گے اور ٹیل ہوا تو میں زیادہ عرصے تک زندہ رہوں گا۔"

اس سے پہلے کہ پہلا بوڑھا کچھ کہتا، اس نے ایک پانچ کا سکہ نکال لیا اور اسے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان تھام کر بوڑھے کی طرف پر امید نظروں سے تاکنے لگا۔

پہلا بوڑھا ایک ٹک اس کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کی پتلیاں ساکت تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ یکایک اس نے دوسرے بوڑھے کی طرف جھک کر کہا:

"ہیڈ تم لو، ٹیل میرا رہنے دو۔"

دوسرے بوڑھے کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے سکہ ہوا میں اچھالا۔ سکہ اپنے محور پر اوپر اٹھا اور گردش کرتا ہوا بنچ کے سامنے گر کر لڑھکتا ہوا بنچ کے نیچے ہری گھاس کے اندر چلا گیا۔ دونوں بوڑھے بنچ سے اتر کر سکے کو تلاش کرنے لگے۔ سکہ لمبی گھاس کے جنگل میں جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ دوسرا بوڑھا بنچ کے نیچے ہاتھ لے جا کر گھاس کے اندر انگلیاں دوڑانے لگا۔ پہلے بوڑھے نے اسے مدد دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔ دونوں بنچ کے نیچے، اس کے پیچھے اور دونوں طرف سکے کو تلاش کرتے رہے، مگر مٹی زرخیز ہونے کے سبب وہاں اتنی کثرت سے گھاس اگی تھی اور اب دن کی روشنی گھنے پیڑوں کے سبب یہاں اتنی مدھم پڑ گئی تھی کہ سکہ ملنا ناممکن سا لگ رہا تھا۔ پھر بھی دونوں گھاس کے اندر انگلیاں دوڑاتے رہے یہاں تک کہ گیلی مٹی سے ان کی انگلیوں پر دھبے پڑ گئے۔ بنچ کے سامنے سے گزرنے والے حیرت اور دلچسپی کے ساتھ دونوں بوڑھوں کی طرف تاک رہے تھے۔ ان میں سے کچھ تو رک بھی گئے تھے۔

"لگ رہا ہے بوڑھوں کی بتیسی گم ہو گئی ہے،" ایک جوان لڑکے نے فقرہ کسا اور دونوں سکے کی تلاش چھوڑ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ دونوں بنچ کا کنارا تھام کر ہانپ رہے تھے جیسے کوئی لمبی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ پھر دونوں کی نظریں ملیں اور انھیں احساس ہوا کہ واقعی سکے کا گم ہو جانا تو عین ان کی خواہش کے مطابق ہوا تھا۔ اگر سکہ مل جاتا تو؟ کم از کم اب تو دونوں خوش تھے۔

مگر دوسرے بوڑھے کو تشفی نہیں ہوئی۔

"ہم کوئی دوسرا طریقہ اپنا سکتے ہیں،" اس نے کہا۔

"کیا؟"

"وہ آدمی جو ہماری طرف آ رہا ہے ہم اس سے نام پوچھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہوا تو تم زیادہ عرصے تک زندہ رہو گے اور اگر ہندو ہوا تو میں۔"

"اور اگر وہ عیسائی نکلا تو؟ اس اطراف کی آبادی میں عیسائی بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔" دوسرے بوڑھے نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"پھر تو ہمیں کسی تیسرے کو اپنے کھیل میں شریک کرنا پڑے گا۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں اس سے کیا فائدہ! یہ دنیا ہر معاملے میں اتنے خانوں میں بٹی ہوئی ہے کہ ٹاس کے لیے ہمارے پاس دنیا کے سارے سکے بھی کم پڑ جائیں گے۔"

پہلا بوڑھا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کھیل میں دلچسپی لینے لگا تھا، ساتھ ہی اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ مگر ہر دوسرے دن ان کی ملاقات تو گویا قسمت کا اٹوٹ فیصلہ بن کر رہ گئی تھی۔ جب وہ اپنی کمزور ٹانگوں اور چھتری کے سہارے اپنے گھر سے پارک تک کا فاصلہ طے کرتا تو اکثر وہ گھر کی طرف واپس لوٹنا چاہتا۔ مگر کوئی ان دیکھی طاقت اسے دوسرے بوڑھے کی طرف، پارک کے اس مخصوص گوشے کی طرف کھینچ کر لے جاتی۔

"تمھیں اس کا اندازہ ہے۔۔۔" ایک دن دوسرے بوڑھے نے دوبارہ کہا۔ "اپنی باقی زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے ہم اب بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"تمھارا ارادہ کیا ہے؟ کیا میں پھر سے کسی کام سے لگ جاؤں؟ یا کسی سماجی تحریک میں شامل ہو جاؤں؟"

"ارے نہیں!" دوسرا بوڑھا مسکرایا۔ "ہماری عمر کے بوڑھے بھلا کس کام کے ہوتے ہیں؟ ہم تو بس جیسے ہیں ٹھیک ہیں۔ مجھے تو ورن آشرم بالکل صحیح لگتا ہے جس کے مطابق بوڑھوں کو بن پرست ہو جانا چاہیے اور پھر سنیاس لے لینا چاہیے۔ اس سے دنیا کی بہت ساری خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ نئی دنیا نئے لوگوں کی ملکیت ہو گی۔ کیا خیال ہے تمھارا؟ میں نے تو آشرم میں ایک کٹیا بھی خرید رکھی ہے۔ بس اس کا باتھ روم بننا باقی ہے۔ بالکل سمندر کے کنارے ہے یہ۔"

"میں نے اپنا دھرم ۱۹۴۷ کے ہندو مسلم دنگوں میں کھو دیا، بلکہ یوں سمجھو کہ آگ میں جھونک دیا۔"

"عجیب بات ہے۔"

"ہے نا!"

"اور تمھیں لگتا ہے اس سے تمھاری آتما کو شانتی ملی ہے؟"

"کم از کم اب اس طرح کے غلیظ واقعات سے اوپر اٹھ کر میں انھیں صحیح صحیح دیکھنے کا عادی تو ضرور ہو گیا ہوں۔"

دوسرا بوڑھا کسی وجہ سے پھر مسکرانے لگا تھا۔

"ایک بات بتاؤں،" اس نے سرگوشی کی۔ "مجھے لگتا ہے ایک بار ہمیں پھر سے کوشش کرنی چاہیے۔ شاید اس بار کوئی نتیجہ نکل آئے۔"

"آخر اس سے ہم میں سے کسی کو کیا فرق پڑ جائے گا؟ پہلے کوئی بھی مرے، دوسرے کے لیے بات ایک ہی ہے۔ جلد یا دیر ہم اپنی اپنی چتا میں ہوں گے۔ پھر بھی اگر تمھاری ضد ہے تو یہی سہی۔"

"ارے نہیں، مذاق نہیں۔ میں تو سنجیدہ ہوں۔ اچھا چلو اسے کچھ دیر کے لیے ٹالتے ہیں۔ جانے کیوں کبھی کبھی مجھے تم سے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

دوپہر کی طرف بارش ہوئی تھی اس لیے کلکتہ کی فضا دھل گئی تھی اور آسمان میں اس وقت تارے بڑے بڑے اور روشن دکھائی دے رہے تھے۔ دوسرے بوڑھے نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ شاید وہ کسی نئے فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے انگلی اٹھا کر قطب تارے کی طرف اشارہ کیا جو سورج ڈوبتے ہی طلوع ہو گیا تھا۔

"دیکھ رہے ہو نا، یہ بادام کے دونوں پیڑوں کے بیچ چمک رہا ہے۔ مگر میرا خیال ہے، آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ داہنے پیڑ کی چوٹی پر ہو گا۔ کیوں نہ ہم میدان کا ایک چکر لگا کر لوٹ آئیں؟ اگر تارہ پیڑ کی چوٹی کو چھو نہ سکا تو تم لمبی عمر پاؤ گے۔"

"لمبی عمر کسے چاہیے؟ پھر بھی اگر تمھیں ضد ہے تو یہی سہی۔"

اور دونوں بوڑھے میدان کے کنارے بچھی ہوئی تارکول کی سڑک پر چل پڑے۔ پہلے بوڑھے کی رفتار ارادی طور پر تیز تھی۔ دوسرا بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے اپنی لمبی پتلی ٹانگوں پر چلتا آ رہا تھا۔

"بڑے تیز چل رہے ہو،" پیچھے سے دوسرے بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے لمبی عمر پا کر ہی رہو گے۔"

"بکواس ہے یہ تو،" پہلے بوڑھے نے رفتار دھیمی کرتے ہوئے کہا کیونکہ خود اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی جس سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ "قدرت کے انتظام میں اس طرح کی بکواس سے کیا فرق پڑنے والا ہی؟"

"پھر تم اتنی تیز کیوں بھاگ رہے ہو؟ تم اپنے دل کا کباڑا کر لو گے۔ اپنی بوڑھی عمر کا کچھ تو خیال کرو۔"

"ایک عجیب بلا ہو تم،" پہلے بوڑھے نے چلتے چلتے کہا۔ "تمھیں تو سیاست میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ جگہ تم جیسے گندے لوگوں کے لیے ٹھیک ہے۔"

وہ بغیر پیچھے مڑے چلتا رہا اور اس نے میدان کی نیم روشنی میں آدھا راستہ طے کر لیا۔ دوسرا بوڑھا، جو بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا، معنی خیز انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ پہلا بوڑھا رک گیا اور سانسیں درست کرنے لگا۔

"اتنا دھیمے چلو گے تو قطب تارا ہاتھ سے جاتا رہے گا،" اسے اپنے پیچھے سے بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

"شٹ اپ! تم چپ نہیں رہ سکتے؟ تمھارے منھ سے بدبو آتی ہے بوڑھے۔"

وہ پھر سے چل پڑا۔ مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی جیسے اس کی پسلیوں کے اندر کوئی بھاری ہتھوڑا چل رہا ہو۔ وہ بار بار آسمان کی طرف تاک رہا تھا۔ اسے تمام ستارے تیزی سے آگے کی طرف نکلتے دکھائی دے رہے تھے جیسے انھوں نے بھی اسے شکست دینے کی ٹھان لی ہو۔ اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی، اتنی تیز کہ اس کی چندیا پر پسینے کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے نکل آئے۔ اسے اپنے سینے میں ہلکے ہلکے درد کا احساس بھی ہونے لگا جو دیکھتے ہی دیکھتے اتنا زیادہ ہو گیا کہ وہ چھتری کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر زمین پر بیٹھ گیا اور لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے اس نے فضا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں چاروں طرف پھیلے لوگوں اور روشنیوں کو آپس میں گڈمڈ ہوتے محسوس کیا۔

دوسرا بوڑھا اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"اتنی تیز دوڑو گے تو یہی حال ہو گا۔ یہ تمھاری صحت کے لیے اچھا نہیں۔ اتنا لالچ، وہ بھی عمر کے اس آخری دور میں؟"

سینہ مسلتے ہوئے اس نے دوسرے بوڑھے کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا درد کچھ کم ہو رہا تھا۔ کانپتے پیروں سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دور چل کر دوبارہ تھم گیا۔ درد پھر سے جاگنے لگا تھا۔

"چلو چھوڑو بھی اسے۔" دوسرے بوڑھا اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ "بھلا تارا بھی کبھی چلتا ہے۔ وہ سرک کر کسی پیڑ کی چوٹی پر کیوں جانے لگا! یہ تو زمین گردش کرتی ہے جس سے ایسا لگنے لگتا ہے۔"

پہلا بوڑھا تلملا کر رہ گیا۔ اس نے چھتری اٹھا کر اس کی نوک سے دوسرے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ بڑبڑایا۔

"غصہ تھوک دو،" دوسرے بوڑھے نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تمھیں گھر تک چھوڑ آؤں؟"

"بھاڑ میں جاؤ تم!" پہلے بوڑھے نے اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "گھر پہنچنے کے لیے مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت نہیں۔ مگر مجھے لگتا ہے ہمیں اپنی اس پہچان پر پھر سے غور کر لینا چاہیے۔ شاید ہم ایک دوسرے کے لیے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔"

میدان کے نیم اندھیرے میں چھتری کے سہارے دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ جنوبی پھاٹک کی طرف چلا گیا۔ دوسرے بوڑھے نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"عجیب بات ہے۔ اگر تارے اپنی جگہ ساکت ہیں تو اس میں میرا کیا قصور!"

دوسرے دن بوڑھے کی خیریت لینے کے لیے وہ وقت سے قبل ہی پہنچ گیا تھا، مگر اس دن پہلا بوڑھا پارک کے اندر دکھائی نہ دیا۔ وہ متواتر دو ہفتوں تک دکھائی نہ دیا گرچہ دوسرے بوڑھے نے تمام بنچوں کو چھان مارا۔ اب تو اس کے اندر احساسِ جرم جاگنے لگا تھا۔ کون جانے، شاید اس عمر کے لیے یہ مذاق صحیح نہ تھا! آخر کار اس سے رہا نہ گیا اور ایک دوپہر وہ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے اسے ہمیشہ جنوبی پھاٹک سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اس لیے وہ پارک کے جنوبی پھاٹک سے باہر نکلا اور ایک کشادہ سڑک پر چلنے لگا۔ وہ اس کشادہ سڑک کے ذیلی راستوں اور گلیوں میں چکر اتا پھرا، عمارتوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں میں بوڑھے کو ڈھونڈتا رہا یہاں تک کہ کلکتہ پر رات اتر آئی۔ وہ ایک سہ راہے کے فٹ پاتھ پر کھڑا اطراف و جوانب کی عمارتوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ جانے کہاں سے ایک کتا نکل آیا اور ٹانگ اٹھا کر اس کے جوتوں پر پیشاب کرنے لگا۔ جب تک اسے پتا چلتا بہت دیر ہو چکی تھی۔ کتا جا چکا تھا۔ وہ مفتوح و ناکام، گیلے پیروں کے ساتھ گھر واپس لوٹ آیا۔ اس نے اپنی جرابیں دھوئیں اور انھیں سوکھنے کے لیے بالکنی کی ریلنگ پر لٹکا دیا۔

ہے بھگوان، کہیں وہ مر نہ گیا ہو! اس نے اپنے پپوٹوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے سوچا۔

مگر تین دن کے بعد اچانک پہلا بوڑھا ایک دوسرے بنچ پر ایک دوسرے گوشے میں دکھائی دیا۔ دوسرا بوڑھا اس کی طرف لپکا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچ پاتا پہلے بوڑھے نے اپنی چھتری کھول لی اور اس کی آڑ میں چھپ گیا۔ دوسرا بوڑھا چھتری کے سامنے ٹھہر کر مسکرایا۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"میں اس دن کے واقعے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔"

جواب میں چھتری خاموش رہی۔

"میں نے پرسوں تمھارے علاقے میں تمھیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ میری بے وقوفی تھی شاید۔ سچ تو یہ ہے مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تمھارا علاقہ کون سا ہے، کس سڑک پر اور کتنے نمبر میں رہتے ہو تم۔"

چھتری چپ چاپ تھی۔ دوسرے بوڑھے نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے میں آشرم چلا جاؤں گا۔ میں اب اسی لائق رہ گیا ہوں۔ اگر چاہو تو میں آشرم کا پتا دے سکتا ہوں۔ اچھی جگہ ہے، پسند آئے گی تمھیں۔ ایک آدھ ہفتے تم میرا مہمان بن کر رہ سکتے ہو۔"

خاموشی برقرار رہی۔ آخر کار دوسرے بوڑھے نے ہار تسلیم کر لی اور مڑ کر پارک سے باہر چلا گیا۔

تین سال کے بعد وہ کلکتہ واپس لوٹا تھا۔ دن کے دو بج رہے تھے اور پارک کے اندر سناٹا تھا۔ سامنے میدان میں ایک بچہ بادام کے پیڑ کے نیچے اکیلا ربر کی گیند سے کھیل رہا تھا۔ پارک کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے پیر خود بخود اس بنچ کی طرف اٹھ گئے تھے جو جوں کا توں اپنی جگہ زمین پر ترچھا کھڑا تھا جیسے یہ کل ہی کی بات ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر گیا ہو۔ وہ بنچ پر چپ چاپ بیٹھا رہا اور درختوں کے سائے میدان پر لمبے ہوتے گئے۔ میدان سے حال ہی میں شاید کسی سرکس نے کوچ کیا تھا۔ جگہ جگہ گڈھے چھوڑ دیے گئے تھے۔ ایک آدھ جگہ جانوروں کی آلودگیاں پڑی تھیں۔ پہلے بوڑھے کو یاد کر کے وہ مسکرایا۔ کون جانے اس بنچ پر اس سے ایک بار پھر ملاقات ہو جائے۔ اور اس بار ملاقات ہوئی تو وہ اسے آشرم کی زندگی کے بارے میں بتائے گا، اس شانتی کے بارے میں جسے اس نے آشرم میں رہ کر پراپت کیا تھا۔ اسے بتائے گا کہ سمندر کے کنارے کنارے چلتے رہنا بھی کتنا خوبصورت تجربہ ہوتا ہے، جیسے تم زمین کو پیچھے چھوڑ آئے ہو اور تمھارے سامنے قدرت کا وہ نیلگوں اسرار ہے جس سے ایک انڈے کو توڑ کر برہمانڈ اور اس کی پوری سرشٹی باہر آئی تھی، ہر جیو جنتو رینگ کر باہر آیا تھا۔ دیکھو بوڑھے، اگر تم مجھے سن رہے ہو اور اگر تمھیں لمبی زندگی چاہیے، اگر تم صحیح معنوں میں زندہ رہنے میں یقین رکھتے ہو تو تمھیں اس شہر کے شور شرابے کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اس شہر کی مانگیں انسان کو اندر سے کھرچ کھرچ کر کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ مجھے تو اس پر کوئی حیرت نہ ہوا گر لوگ خود اپنے اندر پچکنے لگیں۔ جانے وہ کیسی تیلیاں ہوں گی جو انھیں پچکنے سے روکتی ہیں، جانے وہ کون سی ڈوریاں ہوں گی جو ان کے چلنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اسے بوڑھے کے ساتھ اپنی شرطیں یاد آئیں۔ اس وقت بظاہر لاپرواہوتے ہوئے بھی اندر سے جیتنے کے لیے دونوں کتنے اتاؤلے ہو رہے تھے جیسے ان کی ساری

زندگی کا دارومدار ایک حقیر سے سکے یا قطب تارے کی چال پر ہو۔ کیا برا تھا اگر اس کا ہم عمر اس پر سبقت لے جاتا؟ اگر پوری انسانی زندگی کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا میں انسان کے پاس کھونے اور پانے کے لیے کچھ نہیں؟

اس کی محویت بچے سے ٹوٹی تھی جو اس کے بنچ کے سامنے کھڑا تھا۔

"کچھ چاہیے تمھیں؟ ایسا کیا دیکھ رہے ہو؟"

"گیند!" بچے نے ڈرتے ڈرتے وہ لفظ ادا کیا اور اس کی انگلی بنچ کے نیچے کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے گردن موڑ کر بنچ کے پیچھے نظر ڈالی جہاں ربر کی گلابی گیند ہری گھاس کے منحنی جنگل میں گویا نکالے جانے کی منتظر تھی۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ گیند چن رہا تھا کہ کوئی چیز گھاس کے اندر گیلی مٹی پر چمک اٹھی۔

"او بھگوان!" گیند کو بچے کی طرف اچھال کر اس نے اپنا لاغر جسم ٹانگوں پر اٹھایا اور بنچ کے پیچھے جا کر اس چمکدار چیز کے سامنے ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔ یہ ایک سکہ تھا، پانچ روپے کا جس کا اشوک استمبھ والا پہلو گویا کسی حالیہ بارش میں دھل کر اپنی ٹھنڈی دھندلی روشنی کا نیزہ پھینک رہا تھا۔

"ہیڈ!" اس کی چیخ نکل گئی اور اس کا ذہن دوڑتا ہوا تین سال پیچھے چلا گیا جب ایک شام اس نے پہلے بوڑھے سے لمبی زندگی کی شرط لگائی تھی۔ "اوہ، اوہ! تو اس دن جیت میری ہوئی تھی۔ یہ تو کمال ہو گیا۔ یہ اتنے دنوں تک یہاں کیسے رہ گیا!"

سکے کو گیلی مٹی سے الگ کر کے وہ واپس بنچ پر جا بیٹھا اور اسے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ رکھ کر مسلنے لگا۔ بچہ بادام کے پیڑ کے نیچے ربر کی گیند پر ٹھوکر مار رہا تھا۔ درختوں کے سایوں کے ناہموار حاشیوں نے بڑھتے بڑھتے میدان کی فینسنگ وال کو چھو لیا۔ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہوا اور اس نے اپنے ڈھیلے کندھے اٹھائے۔

"لعنت ہے مجھ پر! کسی نے ٹھیک کہا ہے انسان کا کردار ہی اس کا نصیب ہے۔ شاید میں اپنی آخری سانس تک ایک بدکردار بوڑھا ہی رہوں گا۔" جھریوں پر پھسلتے آنسوؤں کے قطروں کو مسلتے ہوئے وہ اٹھا اور اس نے بنچ کے پیچھے جا کر سکے کو واپس گھاس کے اندر گیلی مٹی سے اس طرح چپکا دیا کہ اب اس کا نمبر والا سرا آسمان کی طرف ہو گیا تھا۔

نل کی پیاس

یہ چھ فیٹ کشادہ ایک گلی ہے، بالکل پختہ، جس میں داخل ہوتے ہی ایک ٹیوب ویل سے ٹکرانا پڑتا ہے جو اب کام نہیں کرتا۔ یہ گلی سرخ پرچم کا ایک ناقابلِ شکست گڑھ ہے۔ الیکشن کے دنوں میں یا پارٹی کی برسی کے موقعے پر یا کسی بڑے نیتا کی آمد پر اکثر اس پر ایک سرخ جھنڈا لہرا دیا جاتا ہے جو اپنی درانتی اور ہتھوڑے کا بوجھ شاید سنبھال نہ پانے کے سبب زیادہ تر اپنے پتلے بانس پر گرا رہتا ہے۔

ایک دن میں اسے کام کے لائق بنانے کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ اور چونکہ میں نے اتنے بڑے کام کا تہیہ کیا ہے، تھوڑا بہت میرے بارے میں بھی۔

میں اس گلی میں رہتا ہوں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ یہ گلی میرے اندر رہتی ہے۔ ہمارے مکان کے صدر دروازے پر لوہے کے دو کڑے دیوار سے لٹک رہے ہیں جو اس بات کا غماز ہے کہ کبھی ان سے گھوڑے باندھے جاتے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بہت ہی پرانا مکان ہے، بہت ہی خستہ حال جس کی دیواروں کے کارنس پر کبوتروں نے ٹھکانہ بنا رکھا ہے۔ ان کی آوازیں عموماً صبح کے وقت گونجا کرتی ہیں۔ باقی وقتوں میں یہ اپنے سروں کو جسموں کے اندر چھپائے دنیا ومافیہا سے بے خبر رہتے ہیں یا بلاوجہ پاس پڑوس کی چھتوں کے اوپر چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ مجھے کبوتر اچھے نہیں لگتے۔ یہ پوری گلی کو گندا کرتے رہتے ہیں، خاص طور پر موسم سرما میں۔ ایک بار ایک کبوتر کے مردہ جسم کو میں نے گلی میں دیکھا تھا، اسے ایک بلّی نوچ رہی تھی۔ میں نے بلّی کو بھگا تو دیا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب اس نچے نچائے کبوتر کا کیا کروں۔ اس شام جب میں آفس سے گھر لوٹا تو میں نے دیکھا گلی میں کبوتر اپنی جگہ اسی طرح اپنے پنجوں کو اوپر اٹھائے پڑا تھا۔ صرف اس کی دونوں آنکھیں کالی چینٹیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ دیر تک اپنے دروازے پر کھڑا میں اسے تاکتا رہا یہاں تک کہ دروازے کے اوپر کی قدِ آدم کھڑکی کھل گئی اور مجھے اپنی بیوی بندنا کی آواز سنائی دی۔

''اب اندر آ بھی جاؤ، باہر کتنی شبنم ہے۔''

باہر کتنی شبنم ہے، میں اپنی ہتھیلی کو سر پر رکھ کر دیکھتا ہوں، میرے بال واقعی گیلے ہو رہے ہیں۔ پہلی بار مجھے ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے اور میں گھر کے اندر داخل ہوتا ہوں۔ نیچے کا صحن حمّام کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو کرایہ داروں کے کپڑے دھونے اور نہانے کے سبب ہمیشہ گیلا رہتا ہے۔ اس کے حوض کے پانی میں پرندوں کی بیٹ اوپر تیرتے رہتے ہیں، کبھی کبھار کوئی مرا ہوا چوہا بھی اس سے نکال کر پھینکنا پڑتا ہے۔ دیواروں پر ایک دائمی سیلن ہے۔ ان نیم تاریک کمروں میں جو لوگ رہتے ہیں وہ اسی مکان کی طرح ہی پرانے ہیں۔ ایک بار ایک بوڑھے کو میں نے دیکھا تھا۔ وہ کھانستے ہوئے میری طرف تاک رہا تھا۔

''دادو موئے، کچھ چاہیے؟'' میں نے ان سے پوچھا تھا۔

''بھوانی شیو شنکر کے بعد یہاں ذرا بھی لوگوں کے دل میں دَیا نہیں ہے،'' وہ میرے دادا کے بارے میں کہنے لگے۔ ''اور تم اتنے بھی نہ تھے اور ننگے گھومتے تھے جب میں یہاں آیا، جب ہم نے کچھ اچھے دن گزارے۔ لیکن کتنے دن؟ ملک آزاد ہوا اور شکرے بڑی تعداد میں آسمان پر آ گئے۔''

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ کسی غیر ضروری بحث کو روکنے کا اس سے زیادہ موثر طریقہ اور بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ مگر پریمل دا سے چھٹکارا پانا کیا اتنا آسان تھا؟

''کچھ چھ سو شکرے،'' انھوں نے گننا شروع کیا۔ ''اور نوچنے والے گدھ، اور چیل اور کوّے اور گیدڑ، جن کے بعد کتّے اور لگاتار کتّے، تمام کے تمام لنڈورے اور نطفۂ نا تحقیق۔'' وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کس کے پاس اتنی فرصت تھی۔ چھ سال پہلے پریمل دا کو ایک بار ہم لوگوں نے علی پور کے پاگل خانے میں بھرتی کروایا تھا۔ آج تک وہ اس کا غصّہ ہم لوگوں پر اتارا کرتے ہیں۔ سیڑھی سے اوپر جاتے ہوئے میں نے دیکھا، پریمل دا اچانک چپ ہو گئے تھے اور اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے اندر سے مجھے تاک رہے تھے۔

اوپر کے کمروں میں سے دو ہمارے حصے میں آئے تھے۔ یہاں ایک کمرے میں میں بندنا کے ساتھ ایک اونچے پلنگ پر سوتا تھا، دوسرے کمرے میں میرے دو بچے بڑے ہو رہے تھے۔ سلاخوں والی قدِ آدم کھڑکیوں کے باوجود گلی کی تنگی کے سبب ان کمروں میں روشنی کا گزر کم ہوتا تھا۔ اوپر سے ہم نے ایک کتّا پال رکھا تھا، ہیرامن، جو زیادہ تر وقت اندر صحن کی طرف کھلنے والی گیلری میں جو لوگوں کی گزرگاہ بھی تھی، اپنا چہرہ کسی فلاسفر کی طرح لٹکائے بیٹھا رہتا یا چوہوں کا پیچھا کیا کرتا؛ چوہے جو پرانے ڈرین پائپوں کے رخنوں سے نمودار ہوتے مگر انسانوں کا سایہ دیکھتے ہی جانے کہاں چھپ جاتے۔

ٹیوب ویل سے اتنی دور بھٹک جانے کا میرا مقصد اور کچھ نہیں، بلکہ اس ٹیوب ویل کے آس پاس کی دنیا کی تصویر کھینچنا تھا تاکہ اس کی کہانی مکمل ہو سکے۔ ورنہ یہ نٹ بولٹ اور پائپ کا بے جان ٹکڑا اپنی کوئی کہانی بھی رکھتا ہے؟ اسے دباؤ تو یہ کراہتا ہے، لگاتار دباؤ تو یہ پانی اگل دیتا ہے۔ مگر اس ٹیوب ویل کی ٹونٹی تو اب کچھ بھی نہیں اگلتی، ایک بوڑھے آدمی کی طرح جس کی شہوانی طاقت دم توڑ چکی ہو، یا کسی سالخوردہ کنواری کی طرح جو اپنی شہوانی خواہشات کا گلا دباتے دباتے ایک ٹھنٹھ میں بدل گئی ہو۔ یہ ٹیوب

ویل اندر سے پوری طرح ناکارہ ہو چکا ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ پانی کا وہ زمین دوز چشمہ جس سے یہ منسلک تھا اپنا راستہ بدل چکا ہو، یا ہمیشہ کے لیے سوکھ چکا ہو۔ گلی کے لوگ نکڑ پر آنے والے ایک بڑے ٹینکر کا انتظار کرتے ہیں۔ کارپوریشن کا یہ ٹینکر کبھی صحیح وقت پر نہیں آتا، لیکن جب آتا ہے اس کی ایک آنکھ والا ڈرائیور اپنی سیٹ سے اتر کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے جبکہ لوگ پلاسٹک کی بالٹیاں یا پیتل کے گھڑے اٹھائے قطار باندھے دشوار گذار چہرے لیے کھڑے رہتے ہیں۔

''ذرا سوچو، اتنا پانی ہمارے معدوں، ہماری پیشاب کی نالیوں سے گزر جاتا ہے اور ہم لوگوں کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔'' یہ اس کا محبوب طریقۂ کلام ہے جسے وہ ہر بار ایک ہی انداز سے دہراتا ہے جیسے یہ الفاظ کسی سے سن کر اس نے رٹ لیے ہوں۔ ''یہ دنیا ہم انسانوں کے سبب اب رہنے کے لائق نہیں رہ گئی ہے۔ اچھا کھاؤ گندا نکالو، اچھی چیز پیو بری چیز باہر کرو، صاف ہوا اندر لو بدبودار خارج کرو، ہم گندگی پیدا کرنے والی مشینیں ہیں۔''

وہ واقعی ایک فلاسفر تھا!

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ڈرائیور ہر بار وہی آدمی نہیں نکلتا اور ایک بار تو ہم نے ایک ایسے ڈرائیور کو دیکھا جسے کھجلی کی بیماری تھی اور جس کے چہرے کا رنگ گرا ہوا تھا اور جب لوگ ٹینکر کی ٹونٹی سے پانی بھر رہے تھے وہ دیوار سے اپنے جسم کو رگڑ رہا تھا اور اس کا داہنا ہاتھ لگاتار اپنے فتق کو کھجائے جا رہا تھا۔ اور جب پانی لینے والوں کی بھیڑ مفقود ہو گئی وہ ہاتھ کے اشارے سے گویا گلی کے تمام موجود اور غیر موجود لوگوں سے مخاطب ہو گیا تھا۔

''لو دیکھو۔ پہلے تو لوگ پانی کے لیے اتنا شور مچا رہے تھے، اور اب کوئی نہیں آتا۔ اب میں اس باقی پانی کا کیا کروں گا؟ اب تو کتے بھی اس میں نہانے نہیں آتے۔''

واقعہ یہ تھا کہ اس وقت تک نکڑ پر جمع ہونے والے سارے کتے ٹینکر کے نیچے گرے ہوئے پانی میں لوٹ پوٹ کر جا چکے ہوتے۔

اور جب ٹینکر چلا جاتا تو ایک بھکاری نمودار ہوتا اور ٹینکر کی گیلی جگہ پر اپنا کیلوں مہاسوں سے ڈھکا چہرہ لٹکا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی ایک آنکھ پتھر کی تھی اور دوسری آنکھ پر موتیابند نے تین چوتھائی سے زیادہ حملہ کر رکھا تھا۔ اس موتیابند کے علاج کے لیے اس کے پاس یا تو پیسہ نہیں تھا یا شاید اسے بتایا گیا تھا کہ اس کے سبب لوگ اس پر زیادہ ترس کھانے پر مجبور تھے۔

''سارے رشتے من کے دھوکے،'' وہ بیچ بیچ میں تکرار لگاتا۔ ''دے کر شناتو کون روکے۔''

دراصل اسے دیوار گیر مندر کا پجاری مہالٹ گوسوامی کہیں سے ڈھونڈ لایا تھا اور اپنے مندر کی آمدنی بڑھانے کے لیے اس نے اسے اس جگہ لا کھڑا کیا تھا۔ اکثر دیر رات گئے ان دونوں کے جھگڑنے کی آواز محلے والے سنتے جب وہ نشے میں دھت بھیک کے پیسے آپس میں بانٹا کرتے اور یہ معاملہ زیادہ تر ہاتھا پائی میں بدل جاتا۔

تین سو برس قبل یہ شہر سندر بن کا ہی ایک حصّہ تھا۔ پھر ایک دن ایک آدمی ایک گھڑیال کے سر پر پیر رکھ کر اپنے مستولی جہاز سے نیچے اترا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ افیم کے نشے میں دھت تھا اور چاروں طرف پھیلی ہریالی اور دلدلی زمین سے قدرے ہراساں نظر آ رہا تھا جو سانپ اور کھڑیالوں سے اٹے پڑے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور سوچا، سارے کا سارا معاملہ ہی یہاں بے تکا ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک دن اچانک انگریزوں نے بگل بجا کر اپنا جھنڈا اوا پس لپیٹ لیا اور دلّی کی طرف کوچ کر گئے، جس کے بعد لوگوں نے دیکھا معاملہ کچھ اور بے تکا ہو چکا تھا۔ یا شاید جب سب کچھ ہو چکتا ہے تو بے تکا ہونے کا احساس کچھ اور زیادہ گہرا ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہوگلی ندی میں پانی بھلا کب رکنے والا تھا۔ وہ بہتا رہا، دن بدن اور گدلا ہوتا رہا، فیکٹری کی چمنیاں آسمان کو داغدار کرتی رہیں، ہمارے گھر کی دیواروں سے پلستر جھڑتے رہے، کچھ لوگ کھڑکیوں پر چہرہ رکھ کر بھول گئے اور کچھ لوگ بے چہرہ ایک لمبی زندگی جی کر شمشان گھاٹ کے راستے ہو لیے۔ اور میں جس نے ٹیوب ویل سے پانی نکالنے کا بیڑا اٹھایا تھا، مجھے نئے سرے سے سارے معاملے کی چھان پھٹک کرنی پڑی۔ آخر مجھے دیکھنا بھی تھا، کیا میں واقعی اس کام کا اہل بھی تھا؟

کیا میں اس کام کا اہل بھی تھا؟ یہ سوال پہلی اور آخری بار میں نے خود سے کیا تھا۔ میں نے اپنے جوتوں کے تسمے باندھتے وقت لاپروائی سے سر ہلا کر ایک طرح سے اس سوال کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے بڑے لڑکے سے کہا وہ اپنی پڑھائی میں زیادہ دھیان دے کیونکہ وقت بہت برا آ گیا ہے اور اب انجینئر اور ڈاکٹر بھی بیکار گھومنے لگے ہیں۔ میرا ارادہ اس کی دل شکنی کرنے کا نہ تھا، مگر میری بیوی نے اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔

''تمھارے آسمان پر صرف کالے بادل ہی کیوں منڈلاتے ہیں؟'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''بچوں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ ان سے ہمیشہ اچھی باتیں کیا کرو۔ بچے پھول کے مانند ہوتے ہیں۔ وہ کم دھوپ میں مرجھا جاتے ہیں اور تیز دھوپ میں مر جاتے ہیں۔''

''بندنا، تم تو شاعر ہو!'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''تم کویتا کیوں نہیں لکھتیں؟ ٹاؤن ہال کے ایک کلرک سے میری پرانی پہچان ہے۔ تم وہاں کی تقریبات میں شاعرہ کے طور پر شرکت کر سکتی ہو۔ انھیں اپنی ادبی محفلوں کی شوبھا بڑھانے کے لیے زنانی شاعروں کی ہمیشہ ضرورت پڑتی ہے۔ اور پھر میں تمھاری کویتاؤں کے لیے ایک ناشر ضرور ڈھونڈ لوں گا جو تمھاری کویتا کی کتاب شائع کرنے کے بعد پہلے سے کچھ اور زیادہ غریب ہو جائے گا۔ کالج اسٹریٹ میں ایک سے ایک پاگل پبلشر بھرے پڑے ہیں۔''

"کیا کویتا لکھنا اتنا آسان ہے؟" بندنا نے جواب دیا۔ "کیا آج کے آدمی کے پاس کویتا کے لیے وقت ہے بھی؟ میں پچھلے پندرہ برس سے تمھیں دیکھ رہی ہوں، میں نے تو تمھیں کبھی کویتا کی کتاب پڑھتے نہیں دیکھا، جب کہ تم ہر وقت فٹ بال کی خبروں میں مست رہتے ہو۔ تمھارے لیے تو دنیا کا مرکز موہن بگان کلب ہے۔"

"تم پریسیڈنسی کی چھاترا رہ چکی ہو نا، اس لیے مجھے تم سے ڈر لگتا ہے،" میں مسکرا کر کہتا ہوں۔ "اور دیکھو، تم مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آئے ہوئے لوگوں کی بھاشا مت بولا کرو۔"

"میں نے کب ایسٹ بنگال کلب کا سپورٹ کیا ہے؟"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ تم ایس ایف آئی کی ممبر رہ چکی ہو اور اس میں کن لوگوں کی تعداد زیادہ ہے؟"

"تم تو بس۔۔۔" بندنا ہنس کر کہتی ہے۔ "ایسا نہیں کہ مجھے فٹ بال پسند نہیں۔ صرف اس میں مجھے دیسی اور بدیسی بنگالیوں کی بات نہیں بھاتی جس طرح کرکٹ میں مجھے ہندوستان پاکستان والا معاملہ اچھا نہیں لگتا۔ یہاں نفرت کو حب الوطنی کا نام دے کر لوگ سینہ پھلائے گھومتے ہیں اور کھلاڑی اسی درمیان امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔"

"یہ ہماری نفرت ہی ہے جس کے ذریعے ہم زیادہ متحرک رہتے ہیں، بلکہ اب تو ساری دنیا کو اس کا پتا چل چکا ہے کہ یہ دنیا نفرت کے لیے کتنا اچھا بازار ہے۔ ایک لبرل کا نقاب پہن کر تم اس کی اہمیت کم نہیں کر سکتیں،" میں کہتا ہوں۔ "اور پھر ان سب کا اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ یہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ تم کو تو ساری دنیا میں کہیں پر کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا جبکہ پہاڑوں پر لوگ ناٹے ہیں اور سانپ کھاتے ہیں اور میدانوں میں لوگ زیادہ چترہوتے ہیں، زیادہ بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں اور انھیں اخبار بینی کا شوق ہوتا ہے۔"

بندنا جب ہارنے لگتی ہے تو میرے سینے سے لپٹ کر میری کھردری داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے، "مجھے پتا ہے تم کالج میں ڈبیٹ میں ہمیشہ اوّل آتے تھے۔ مگر گھر میں تو کبھی کبھار مجھے جیتنے دیا کرو۔"

"یہی تو،" میں اس کے خوبصورت بالوں میں انگلیاں ڈال کر کہتا ہوں جن پر فدا ہو کر میں نے اس کے ساتھ سات پھیرے لیے تھے، اس سے بے خبر کہ یہ خوبصورت زنجیریں ہیں جو مردوں کو تاعمر قید کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ "ہم فٹ بال کے شائقین اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ہماری لغت میں شکست کی اصطلاح موجود نہیں۔ اسے تم ہماری کمزوری سمجھو یا طاقت، یہ ایک بڑی تحریک ہے ہمارے اندر جینے کی۔ جس دن ہم ہار تسلیم کر لیں، ہم انسان نہ رہیں، ایک بغیر ہوا کی گیند میں بدل جائیں۔"

ٹیوب ویل! اوہ معاف کیجیے، ہم ٹیوب ویل کے پاس واپس چلتے ہیں۔ مجھے دوسری بار کہنے دیں، یہ ایک بہت ہی پرانا ٹیوب ویل ہے۔ اور اب تو اس گلی سے باہر جاتے یا واپس اندر آتے لوگوں کو ایک طرح سے اسے ناکارہ دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

"تمھیں خبر بھی ہے،" ایک بار گلی کے ایک مکین کو میں نے اپنے ساتھی کو بتاتے سنا تھا جو باہر کا آدمی تھا۔ "اس ٹیوب ویل کے بارے میں بہت ساری افواہیں مشہور ہیں۔"

"اچھا؟ اور میں سمجھتا تھا یہ بس یوں ہی سا ایک ہینڈ پمپ ہے جیسے بہت ساری جگہوں پر نظر آتے ہیں جو اپنا دن دیکھ چکے،" باہر کا آدمی کہتا ہے۔ "میں جب بھی تمہارے گھر آتا ہوں اس سے ٹکرا جاتا ہوں۔ تم لوگ اسے کیسے برداشت کرتے ہو؟ ویسے وہ افواہیں کیا ہیں؟ وہ افواہیں یقیناً کافی طاقتور ہوں گی جو یہ ہینڈ پمپ گلی کے بیچوں بیچ اس طرح کھڑا ہے۔"

"افواہ یہ ہے کہ اس ٹیوب ویل سے کبھی پانی نہیں نکلا۔"

"یہ کوئی نئی بات ہے؟" اسے جواب ملا۔ "اس سے اس کی اہمیت بھلا کیسے بڑھ سکتی ہے؟ اس ملک میں سینکڑوں چیزیں ہیں جنھوں نے شروع سے ہی اپنا کام کرنا بند کر دیا ہے۔ شاید اور بھی کوئی وجہ ہو جسے تم نہیں جانتے۔"

"میں کیسے نہیں جان سکتا؟ مجھے یہاں رہتے بیس برس سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ٹیوب ویل پندرہ برس پہلے مقامی لوگوں کی مانگ پر الیکشن کے اعلان سے قبل لگوایا گیا تھا۔ مگر ایک لمبی تقریر کے بعد جب لیڈر نے اس ٹیوب ویل کا افتتاح کیا تو اس سے ایک قطرہ پانی نہ نکلا جبکہ ٹیسٹ کے دوران یہ لگاتار پانی اگلتا رہا تھا۔ اسے فوراً نیتا نے سبوتاژ قرار دیا اور مخالف پارٹی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس کے دوسرے دن ایک کتا اس ٹیوب ویل کے سامنے مرا ہوا پایا گیا۔ چونکہ اس کا ایک سیاسی پہلو نکل آیا تھا کسی نے بھی اس کتے کو وہاں سے ہٹانے کی جرأت نہیں کی اور وہ کئی دنوں تک نل کے سامنے پڑا مہکتا رہا۔ لیڈر کو تو اسمبلی الیکشن میں ہر حال میں جیتنا تھا مگر یہ ٹیوب ویل ان دنوں کی یادگار کے طور پر رہ گیا۔ اس سے کم از کم ہم پر یہ راز تو کھلا کہ ہمارے کچھ نیتا کچھ کرنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آخر میں ٹیوب ویل پیاسا کا پیاسا رہ جاتا ہے۔

ہمارے محلے کا کاؤنسلر گمنوئے گنگارام ہمیشہ ہمارے گھر آیا کرتا ہے کیونکہ ہر الیکشن کے موقعے پر بندنا اپنی مانگ میں سیندور سجائے، کندھے پر اوڑھنی یا شال رکھے پارٹی کے لیے پرچار کرنے نکل پڑتی تھی۔

''ہمیں اس ٹیوب ویل کو کام کے لائق بنانا چاہیے،'' ایک دن میں اس سے کہتا ہوں۔

''کیا فائدہ؟'' گنگارام کہتا ہے۔ ''اس سے خوامخواہ گلی میں آنے جانے والوں کو تکلیف ہوگی۔ پانی کی نکاسی کا انتظام تو اب اس جگہ ہونے سے رہا، خوامخواہ یہ گلی گندی دکھائی دے گی۔ ویسے اب اس کی ضرورت بھی بھلا کسے ہے؟ زیادہ تر گھروں میں نل کا انتظام ہو چکا ہے۔ اوپر سے گرمی کے دنوں میں کارپوریشن کا ٹینکر یہاں روز پانی لے کر آیا کرتا ہے۔''

''تو اس ٹیوب ویل کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سنکھو دا نے خود اسے لگوایا تھا۔'' وہ ایم ایل اے کا ذکر کرتا ہے جو ان دنوں سرکار میں منسٹر کے عہدے پر فائز ہے۔ ''گھودا، آپ بھی کانگریسیوں جیسی باتیں نہ کیا کرو۔ بندنا، تم گھودا کو سمجھاتی کیوں نہیں؟''

''میرا اتنا دماغ نہیں کہ تمھارے گھودا کو سمجھاؤں،'' بندنا نے جواب دیا۔ ''وہ ہر آئے دن کوئی نہ کوئی نئی بات دماغ میں بھرتے رہتے ہیں۔''

''میں تو اس سے پانی نکال کر ہی دم لوں گا،'' میں نے الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا۔ ''اور گنگارام، تم لوگ اسے سیاست کا معاملہ نہ بناؤ۔''

''ارے نہیں گھودا، یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم کیا آپ کو نہیں جانتے؟ یہاں کون آپ کی عزت نہیں کرتا؟'' مجھے پتا ہے وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ یہ سالے سیاست دان، یہ اپنے منھ کے اندر جانے کتنی زبانیں رکھتے ہیں۔

اس دن گلی میں میں دیر تک چہل قدمی کرتا رہتا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے کھمبوں پر بلب جل اٹھے ہیں۔ ٹیوب ویل کا سایہ کسی تیر انداز کی طرح نکڑ سے اندر کی طرف پھیل گیا ہے۔ اسی گلی میں کھیل کر میں جوان ہوا تھا۔ ایک دن اس گلی سے میری ارتھی اٹھنے والی تھی اور لوگ مجھے ٹرک میں لاد کر موڑھی پھینکتے ہوئے نیم تلہ کا راستہ لینے والے تھے۔ کیا میں یوں ہی مر جاؤں گا؟ ایسا کچھ کر کے گزر جانا کیا برا ہوگا جس سے اس گلی کے لوگ کم از کم مجھے جوڑ کر دیکھتے رہیں، تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، بلا وجہ ہی سہی۔

میں جس آرکیٹیکچر فرم میں نقشہ نویس تھا وہاں ایک سائٹ انجینئر سے میں نے فون پر رابطہ قائم کیا۔

''یہ سرکاری نل ہے، اور پھر اندر پائپ کی خرابی نکلی تو اس میں سامان کے خرچ کے ساتھ ساتھ مزید کھدائی کا خرچ بھی آ سکتا ہے۔''

''اس کا میں انتظام کر لوں گا،'' میں نے کہا۔ ''اس میں سیاست کا اب کوئی معاملہ نہیں رہا اور گلی میں بہت سے لوگ اس معاملے میں میرے ساتھ ہوں گے۔''

''تو تم اس کے بارے میں کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''یا تو اسے کام کے لائق بناؤ، یا اسے اکھاڑ پھینکو۔''

''تمھیں یقین ہے کہ یہ اتنا آسان ہے؟''

''لگتا ہے تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے۔ مجھے دوسرا آدمی ڈھونڈنا ہوگا۔''

''ارے نہیں، تم تو بلاوجہ بھڑک اٹھتے ہو۔'' سائٹ انجینئر کی آواز میں نرمی آ گئی۔ ''کیا مجھے نہیں پتا کہ تم کس طرح کے انسان ہو؟ اس فرم میں تمھاری کون عزت نہیں کرتا؟''

''مجھے چکنی چپڑی باتوں میں نہ گھیرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا، کتنے پیسے کا انتظام کرنا ہوگا۔ آخر کنزیومر کورٹ کس دن کام آئے گی۔''

''خرچ کے بارے میں تو میرے آدمی کے دیکھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔ ویسے اگر زمین کے اندر کا پائپ صحیح سلامت رہا تو خرچہ بس برائے نام آئے گا۔''

''ویسا ہی ہو۔'' میں فون رکھ دیتا ہوں۔

میں جس میز کے سامنے کھڑے ہو کر نقشے بنایا کرتا تھا اس کے سامنے ایک کافی بڑی قدِ آدم کھڑکی تھی جس کے پٹ باہر کی طرف کھلے ہوئے تھے۔ اس سے پرانے کلکتہ کی خستہ حال عمارتیں کسی بدرنگ پینٹنگ کی طرح نظر آتی تھیں۔ ان قدیم عمارتوں کی بھیڑ میں ایک مسجد کے دو یکساں جسامت کے گنبد ابھرے ہوئے تھے جن پر کبوتروں نے اپنا ڈیرا بنا رکھا تھا۔ میں نے ان دونوں گنبدوں کے بیچ جاڑے کے موسم میں ہمیشہ سورج کی لال ٹکیا کو پگھلتے دیکھا ہے۔ یہ میں بھی جانتا ہوں، یہ دنیا اتنی آسان جگہ نہیں ہے، میں خود سے کہتا ہوں۔ مگر یہ میری بنائی ہوئی دنیا نہیں ہے۔ اور پھر ہمیں یہ ثابت تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ ہم کسی قابل ہیں، کہ ہم اس سیارے پر تھوڑا بہت تو دکھائی دیتے ہیں۔

نمائی گھوشال کے پاس کوئی گردن نہیں ہے۔ اس کے سامنے تپائی پر چائے رکھتے وقت میری بیوی اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے، مگر اس پوری گلی میں وہ میرا سب سے پسندیدہ آدمی ہے۔ کنزیومر کورٹ کا خیال اسی نے میرے دماغ میں ڈالا ہے۔ نمائی گھوشال کے ساتھ میں بچپن سے جوانی تک موہن بگان اسٹیڈیم میں فٹ بال کھیل چکا ہوں اور جب اسے اپنے باپ کی لانڈری سنبھالنی پڑی تو اس نے چار سال کے اندر اندر اس کا دیوالیہ نکال دیا۔

"مجھے یہ سب بکھیڑا اچھا نہیں لگتا،" اس نے میرے سامنے اعلان کیا تھا۔ "کیا آدمی اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ساری زندگی دوسروں کی غلاظت دھوتا رہے؟"

"ہم اپنی روٹی کے لیے محنت کرتے ہیں۔" میں نے ایک کمزور سا احتجاج پیش کیا کیونکہ یہ وقت کی مانگ تھی۔ مگر مجھے پتا تھا گھوشال اپنی منطق کے سیلاب میں اسے بہالے جائے گا۔

"یہ ہم اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے کہتے ہیں،" گھوشال نے جواب دیا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ہم سب بوجھ ڈھونے والے جانور ہیں۔ جس کی پیٹھ پر جتنا بوجھ ہو وہ اپنے آپ کو اتنا ہی خوش قسمت سمجھتا ہے۔"

لانڈری کے بند ہونے کے بعد نمائی نے کچھ دنوں تک ایک پتریکا نکالنے کی کوشش کی تھی اور کندھے سے ایک جھولا لٹکائے گھومتا پھرتا تھا۔ اپنے قلم کار کی شخصیت کو مکمل روپ دینے کے لیے اس نے اپنی ٹھوڑی پر انتہائی سرکش داڑھی اگالی تھی۔ وہ پتریکا تو نہیں چلی، ہاں صحافی کے طور پر نمائی گھوشال چل نکلا اور اس کے تعلقات تجارت اور سیاست کے گلیاروں میں دور دور تک پھیل گئے۔

"یہ گنموئے گنگارام تو اوّل نمبر کا گدھا ہے،" اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر اپنے قلم کی طرح نوکیلے دانتوں سے اسے چور کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے میں سیدھے سنکھو دا سے بات کروں گا۔ پھر آگے۔ ہر معاملے کی ایک صحیح شروعات ہونی چاہیے، ایک صحیح دِشا ہونی چاہیے۔ ارے ہمیں تو اس کے بارے میں بہت پہلے سوچ لینا چاہیے تھا۔ ہم بنگالی اسی لیے تو مار کھا جاتے ہیں۔ کبھی بنگال جو آج سوچتا تھا کل سارا بھارت اسے سوچا کرتا تھا۔ آج یہ حالت ہے کہ سارا بھارت جو آج سوچتا ہے ہماری کھوپڑی میں وہ بات تین سال بعد آتی ہے۔"

"سب کہتے ہیں یہ اتنا آسان کام نہیں۔ یہ پرانا نل ایک پرانے کرایہ دار کی طرح ہے۔ اسے اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں۔ اور کام کے لائق بنانا تو اور بھی مشکل ہے۔ بہت سارے معاملات اس سے جڑے ہوئے ہیں جن کا ہمیں پتا نہیں مگر جو دھیرے دھیرے سامنے آجائیں گے۔"

"وہ سب سامنے آئیں تو!" گھوشال نے اپنے بغیر گردن والے سر کو ایک فاختہ کی طرح پہلے گھڑی کے رخ اور پھر اس کے مخالف موڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے کچھ سوچنے کی کوشش تو کی، ورنہ آج کل کس کے پاس سوچنے کے لیے وقت ہے۔ سچ پوچھو تو ہم سب مشین بن چکے ہیں، مشین جسے دوسرے چلا رہے ہیں۔"

"یہ نمائی داخو دا اپنے کسی کام کا آدمی نہیں، تم اس سے کیا امید رکھتے ہو؟" اس کے جانے کے بعد میری بیوی نے کہا۔ "یہ عجیب سنک پال لی ہے تم نے۔"

"ذرا انتظار کرو بندنا،" میں نے نمائی گھوشال کے چھوڑے ہوئے بسکٹ کو طشتری سے اٹھا کر چباتے ہوئے کہا۔ "اور میرے لیے ایک کپ گرم چائے بنالاؤ۔ میں ذرا چھت کی دھوپ میں بیٹھتا ہوں۔ یہ معاملہ سنگین ہے۔ مجھے اس میں تمھاری مدد چاہیے۔"

"کیسی مدد؟" بندنا نے چونکتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے معاملات میں نہ لپیٹو۔ میں کیا تمھیں نہیں جانتی۔ یہ سارا پاگل پن تم اپنے تک ہی محدود رکھو۔"

"اب شاید اس دنیا کو پاگلوں کی ہی ضرورت ہے،" میں مسکرا کر کہتا ہوں۔

دو ہفتے گزر گئے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دو ہفتوں میں ایک طرح سے میں اس معاملے سے ذرا سا اکتا گیا ہوں۔ اس کی جو بھی وجہ رہی ہو، میری اپنی مصروفیات کا اس میں کوئی دخل نہیں کیونکہ یہ اپنے معمول پر ہیں۔ ان میں نہ کوئی خاص اضافہ ہوا ہے نہ ہی کوئی کمی آئی ہے۔ دوسرے دنوں کی طرح آج بھی میں میز کے سامنے کھڑا پنسل سے لکیریں کھینچتے کھینچتے اکتا گیا ہوں اور کھڑکی سے باہر تاک رہا ہوں جہاں عمارتوں کے ہجوم میں مسجد کے گنبدوں پر کبوتر پر پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ ابھی سورج کی ٹکیا کا وقت نہیں آیا ہے۔ ابھی ہماری طرف کی کھڑکی عمارت کے سائے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ نیچے سڑک سے گزرتی گاڑیوں کے ہارن لگاتار بج رہے ہیں۔ میں شہر کی اس سمفنی کا 'لطف' اٹھا رہا ہوں جب کریم چائے کی پیالی لیے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ پیالی تھام کر میں اپنی گدّے دار کرسی کے اندر دھنس جاتا ہوں اور دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا کر ہانک لگاتا ہوں۔

"کریم!"

"ہاں حضور۔" کریم اس عمارت کا لفٹ مین ہے جو لفٹ کے دائمی طور پر ناکارہ ہو جانے کے بعد ہمارے آفس میں کام کرنے لگا ہے۔ اس کے کان کے لوؤں کے بال کبوتروں کی طرح اجلے اور سفید ہیں۔ وہ ہمارے آفس کے اندر ہی سوتا ہے، آفس کے اندر ہی نماز پڑھتا ہے اور آفس کے پرانے فرنیچر جو برسوں کے استعمال کے سبب چکنے اور سیاہ ہو رہے ہیں ان ہی کا ایک حصہ نظر آتا ہے۔

"کریم، مرنے کے بعد کہاں دفن ہونے کا ارادہ ہے؟"

"جہاں بھائی لوگ دفن کر دیں حضور۔ گوبرا، باگماری یا سولہ آنا قبرستان۔ سسرے، اور کہاں لے جائیں گے۔"

"تمھارا کوئی رشتہ دار نہیں؟"

"اب تو آپ ہی لوگ سب کچھ ہیں حضور۔"

"تم اپنا گاؤں کیوں نہیں لوٹ جاتے؟ گاؤں کی مٹی، وہاں کی ہوا، وہاں کے لوگ، وہ تمھیں یاد نہیں آتے؟"

"پچاس برس بعد اب وہاں کون ہمیں پہچانے گا حضور!" کریم نے بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "خود اپنا گاؤں اب گاؤں کہاں رہا۔ اب گاؤں کے لوگ شہریوں سے زیادہ سیانے ہو گئے ہیں۔ سالے زمین جائداد کے لیے زیادہ مار کاٹ کرنے لگے ہیں۔ اب تو ان لوگوں سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنی انگلیوں کو گن لینا پڑتا ہے۔"

دیہات کے لوگ سیانے ہو گئے ہیں، گاؤں قصبوں میں بدل گئے ہیں، قصبے شہروں میں، شہر میگا سٹی میں، میٹروپولس کوسموپولس میں ڈھل گئے ہیں۔ اب ہمارے یہ مہانگر کسی ملک سے کم نہیں، سب لوگ ایک ملک کے اندر ایک دوسرے ملک میں آباد ہیں، ان کی نہ نظر آنے والی اپنی سرحدیں ہیں، اپنی خاردار باڑھیں ہیں، No man's land ہیں، ان پر مخصوص پارٹیوں کی سیاسی پکڑ ہے، غنڈوں کی دہشت کا خاص انتظام ہے۔۔۔ ایک ملک کو اور کیا چاہیے؟ میں اپنی عمارت کے نیچے سڑک سے گزرتے وقت ٹرام کی پٹری پر رک گیا ہوں۔ سڑک پر دھواں پھیل رہا ہے۔ بہاری ٹھیلے والے ٹھیلوں پر سامان لادے گزر رہے ہیں۔ بنگالی کلرک اپنی ٹائپ مشینوں پر اونگھ رہے ہیں۔ یہ انگریزوں کے زمانے سے وہاں بیٹھے اونگھتے آ رہے ہیں۔ یہ بہت زیادہ بھات خوری کا نتیجہ ہے۔ ہائی کورٹ کے وکیل اور پیادے اپنی وردیوں میں گھوم رہے ہیں۔ ایک کتا اپنی پچھلی ٹانگ اٹھائے ایک ہائیڈرنٹ پر پیشاب کر رہا ہے۔ اس کے پیشاب کا رنگ بھی کچھ ہوگلی ندی کے پانی کی طرح گدلا ہے جو اس ہائیڈرنٹ سے باہر آتا ہے۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ سب لوگوں کو جلدی ہے۔ مجھے بھی جلدی ہے۔ ایک کافی رنگین اسٹیٹ آف دی آرٹ ٹرام گھنٹی بجاتے ہوئے ہلال کی شکل میں لال دیگھی کے کنارے سے گزر رہا ہے، پٹریاں بدلتے وقت اس کے پہیے بری طرح کھڑکھڑا رہے ہیں، اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے سر ہل رہے ہیں۔

نمائی گھوشال میرے گھر پر میرا انتظار کر رہا ہے۔

"میں نے سنگھو داسے بات کی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اور پھر یہ مسئلہ میرے اکیلے کا نہیں ہے۔"

"تو تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔ تمھارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔"

"اب بھی نہیں ہوں،" میں کہتا ہوں۔ "مگر میں اس کے پاس کیوں جاؤں؟ یوں بھی یہ نیتا لوگ مجھے نہیں بھاتے۔"

"تم ایک ناممکن آدمی ہو۔" نمائی گھوشال مسکرا رہا ہے۔ "ویسے سنگھو داسے تمھیں ملاقات کرنی ہی پڑے گی۔ گھبراؤ مت، وہ اتنا برا آدمی نہیں۔ منسٹر ہے، مگر اب بھی اپنے پرانے مکان میں اپنی معمولی زندگی گزار رہا ہے۔"

"ہم سب اپنی معمولی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ اس سے ہم کوئی تیر نہیں مار لیتے،" میں کہتا ہوں۔ اس کے چلے جانے کے بعد بندنا مجھ پر برس پڑتی ہے۔

"عجیب طریقہ ہے یہ تمھارا۔ وہ بیچارا تمھارے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور تم ہو کہ۔۔۔ آخر تم میں تبدیلی کب آئے گی؟"

"اب اس عمر میں میرے اندر کیا تبدیلی آئے گی۔ ایک بوڑھے مرغے سے تم کسی نئے پینترے کی امید مت کرو،" میں اپنے کمرے کی اونچی پلنگ پر چڑھتے ہوئے کہتا ہوں جس کے نیچے ہمارے گھر کا الم غلم سامان بھرا پڑا ہے۔ ہم نچلے متوسط طبقے کے لوگ، چاہے ہمارے سامانوں کا کوئی بھی مصرف نہ رہ گیا ہو، انھیں پھینکنے میں یقین نہیں رکھتے۔ "اور نمائی گھوشال کے بارے میں فکر نہ کرو۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہماری دوستی اس وقت کی ہے جب ہم ننگے گھوما کرتے تھے۔ تم تو بہت بعد کی چیز ہو۔"

اور گرچہ بندنا کو میری بات سے چوٹ پہنچتی ہے، میں اس کا نوٹس نہیں لیتا۔ اس رات مجھے بہت دیر سے نیند آتی ہے۔ خواب میں بار بار میں اسٹیٹ آف دی آرٹ ٹرام کو اپنی پٹری سے گزرتے دیکھتا ہوں۔ ہر بار مجھے اس کے اندر کریم بیٹھا نظر آتا ہے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے ٹرام کے اندر آنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ آخر کار میں ٹرام کے پائیدان پر لٹک جاتا ہوں۔ مگر ٹرام کا کنڈکٹر مجھے ٹرام سے نیچے اترنے کی ہدایت دے رہا ہے جو دیر سے میری تنگ ودو پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

"آپ کو سمجھنا چاہیے۔ ٹرام ڈپو کے اندر جا رہا ہے۔"

صبح میں جاگ کر سر تکیہ پر ٹکائے اسی واقعے کو سوچ رہا ہوں۔ شہر دھیرے دھیرے دھوئیں اور دھند کی چادر سے ابھر رہا ہے۔ ایک عجیب باسی مہک ہے جو در و دیوار سے آ رہی ہے۔ کیا میری ناک اچانک زیادہ کام کرنے لگی ہے؟ ہاتھ منھ دھو کر میں کھڑکی کے سامنے زیر جاموں سے لدی بید کی کرسی پر بیٹھا سورج کی کرنوں کو عمارتوں کے

درمیان کے خلاؤں میں نیزوں کی طرح داخل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ گلی میں لوگوں کی آمد ورفت شروع ہو چکی ہے۔ ہمارا کتا ہیرامن جاگ چکا ہے اور ایک عجیب دبی دبی سی آواز نکال رہا ہے جیسے اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہو۔ اخبار والا اخبار پھینک کر جا چکا ہے۔ گوالا اپنی سائکل پر کنستر کھڑکاتے ہوئے گزر رہا ہے۔ خاکروب گلی میں جھاڑو لگا رہا ہے۔ مشنری اسکول میں جانے والے بچے اسکول کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے ایک ہی فلم ہے جسے میں روز دیکھنے پر مجبور ہوں۔ بندنا نمودار ہوتی ہے اور چائے کی گرم پیالی اخبار کے ساتھ میری ہتھیلی میں تھما دیتی ہے۔

''گڈ مارننگ،'' وہ مجھ سے کہتی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب بندنا مجھے دنیا کی سب سے خوبصورت عورت نظر آتی ہے اور میں سوچا کرتا ہوں وہ میری زندگی میں نہ آتی تو شاید میں پتھر بن کر کسی دیوار سے لگا رہ جاتا۔ مگر آج وہ کچھ زیادہ مسکرا رہی ہے۔ یہ مسکراہٹ بلا وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہماری بہت سی عادتوں کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔

اس دن آفس سے میں جلدی نکلتا ہوں۔ آج میرا ارادہ نمائی گھوشال کے ساتھ سنگھو دا سے ملنے کا ہے۔ گلی سے مڑتے وقت میں ہمیشہ کی طرح ٹیوب ویل سے بچنے کے لیے کنارے کی طرف دبنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں گرتے گرتے بچتا ہوں۔ ٹیوب ویل اپنی جگہ پر نہیں ہے۔

کیا میں کسی دوسری گلی میں آنکلا ہوں؟ نہیں، یہ گلی تو ہماری ہی ہے صرف ٹیوب ویل اپنی جگہ سے غائب ہے جس کے سبب گلی کچھ زیادہ ہی کشادہ اور قدرے اجنبی نظر آ رہی ہے۔ ٹیوب ویل کی جگہ پر کھڑے ہو کر میں دیکھتا ہوں، زمین پر ایک بیضوی سوراخ بن گیا ہے جسے مٹی سے لبالب بھر دیا گیا ہے۔

میں اس جگہ دیر تک کھڑا رہتا ہوں کہ مجھے دیوار گیر مندر کا پجاری مہالٹ گو سوامی آتا دکھائی دیتا ہے۔

''یہ ٹیوب ویل کہاں گیا؟'' میں اس سے پوچھتا ہوں جیسے وہ اس کے لیے جواب دہ ہو۔

''تین مستری آئے تھے کھودا۔ دن بھر کام کرتے رہے۔ سارا سامان یہاں تک کہ اندر سے زنگ کھائے ہوئے پائپ تک نکال کر لے گئے۔ آخر آپ نے یہ کر ہی دکھایا۔''

''میں نے کیا کیا ہے۔ خوامخواہ میرا نام مت لو!'' میں تنک کر کہتا ہوں اور اپنے گھر کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں آج میرے ہر قدم پر دروازے اور کھڑکیاں کھل رہی ہیں، لوگوں کے مسکراتے چہرے نظر آ رہے ہیں۔ سب لوگ اپنائیت کے ساتھ میری طرف تاک رہے ہیں۔ ایک مکان کے سامنے ایک ہاتھ رکشا بھی زمین پر ٹکا ہوا ہے جسے چلانے والا اس کے پائیدان پر بیٹھا اطمینان سے بیڑی پی رہا ہے۔ کل تک کوئی رکشا اندر نہیں آپاتا تھا۔ اب تو یہ گلی ایسی ہو گئی ہے کہ ڈرائیور اگر راضی ہو تو ٹیکسی بھی اندر تک آسکتی ہے۔

''سارا محلہ تم سے بہت خوش ہے۔'' ہاتھ منھ دھو کر باتھ روم سے باہر آنے پر بندنا میرے ہاتھ میں تولیہ دے کر مسکراتی ہے۔ ''واقعی یہ نل یہاں سے ہٹ نہ گیا ہوتا تو ہمیں کبھی اندازہ نہ ہوتا کہ ہماری گلی کتنی کشادہ ہے۔''

''آخر گدھا گنگارام نے یہ کر ہی ڈالا،'' میں کہتا ہوں۔

''گنگارام؟'' بندنا کی آنکھوں میں حیرت ہے۔ ''وہ تو خود آپ کو بدھائی دینے کے لیے آیا تھا۔''

''مجھے کیوں؟ میں نے کیا کیا؟'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ گنگارام نہیں تو یقیناً نمائی گھوشال کا کارنامہ ہے۔ مگر جلد مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ نہ یہ نمائی گھوشال کا کام تھا نہ سائٹ انجینئر بیّارائے کا جس سے میں نے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ میں اس گتھی کو سلجھا نہیں پا رہا تھا اور اگرچہ اس دن کے بعد ہمیشہ میں ایمانداری کے ساتھ اس بات سے انکار کرتا رہا مگر سارے محلے کا خیال میرے اس انکار کے سبب اور بھی یقین میں بدل گیا۔ نہ صرف لوگ میری طرف احترام سے تاکنے لگے تھے بلکہ سنکی پریمل دا بھی میری پیٹھ ٹھونکنے سے باز نہ آئے۔

''میں بھوانی شیو ٹھاکر کی بہت ساری باتیں تم میں دیکھ رہا ہوں۔''

شاید ٹیوب ویل نے لوگوں کو کچھ زیادہ ہی ستایا تھا!

دو ہفتے گزر گئے ہیں۔ میں نے احتجاج کرنا بند کر دیا ہے۔ اب تو اس جگہ سے گزرتے ہوئے خود مجھے یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ یہ میرا ہی کارنامہ ہے۔

''یہ پی ڈبلیو ڈی والے ہوں گے۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے،'' سائٹ انجینئر نے مجھ سے کہا تھا۔ ''یہ اتفاق ہے کہ تمھیں اس کا خیال آیا اور انھوں نے ٹھیک وقت پر ایسا سوچا۔ یا پھر کون جانے لوہے کا کوئی کباڑی اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر سارا سامان لے کر چلتا بنا ہو۔ کلکتہ جیسے پرانے شہر میں تو یہ روز کا قصہ ہے۔ اب اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ اچھا ہوا نا، سر درد بھی جاتا رہا اور سر بھی بچ گیا۔''

یہ اس انجینئر کے مذاق کرنے کا بھونڈا طریقہ تھا۔ بیّارائے! مجھے یہ آدمی پسند نہیں۔ میں اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح جان گیا ہوں۔ وہ صرف کام ٹالنے میں ماہر ہے۔ اگر اس نے ایمانداری سے کام لیا ہوتا تو مجھے یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ہمیں زندگی میں زیادہ تر لوگ اچھے اس لیے نظر آتے ہیں کیونکہ انھیں آزمانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس تھوڑا سا تیزاب ان پر ڈالو اور اوپر کی دھات زائل ہونے لگتی ہے، اندر کا بھوت باہر نکل آتا ہے۔

اب اس بات کو چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ میرے آفس میں مصروفیات پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ شہر کے مضافات میں بڑے بڑے رہائشی علاقے بننے لگے ہیں۔ اچانک اس میگا سٹی میں لوگوں کو گھر بنانے کا جنون سا ہو گیا ہے۔ کاغذ پر پنسل کی مدد سے لکیریں کھینچتے ہوئے اب مجھے مسجد کے گنبدوں کے اوپر پر پھڑ پھڑاتے کبوتروں کے لیے کم موقع ملتا ہے۔ کبھی کبھی تو ان کے بیچ سورج کی ٹکیا پوری طرح پگھل چکی ہوتی ہے اور مجھے اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔ پھر ایک دن میرے پاس کام نہیں رہتا اور میں چائے پیتے ہوئے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا کر ہانک لگاتا ہوں۔

"کریم!"

"ہاں حضور۔" کریم کے دبلے پتلے جسم کا سیلہوئٹ پرانے فرنیچروں کی دھند سے ابھرتا ہے۔

"کریم، تم تو لفٹ مین کے طور پر اس عمارت میں کام کرتے تھے نا؟"

"ہاں حضور۔"

"تب تو تمھیں تنخواہ بھی ملتی ہو گی؟"

"کیسی تنخواہ حضور۔ لفٹ ہی کون سا کام کرتا ہے؟"

"کیا کہا، لفٹ کام نہیں کرتا؟ تو اس میں تمھارا کیا قصور؟ انھیں اس کی مرمت کروانی چاہیے۔"

"یہ انگریزوں کے زمانے کا لفٹ ہے۔ اب اس کے کل پرزے نہیں ملتے۔ وہ بیچارے بھی کیا کریں گے۔"

"سب ملتے ہیں۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ ہم ہندوستانی ایک بہت ہی چالاک قوم ہیں۔ میں نے اس سے بھی پرانے لفٹ کو کلکتہ کی عمارتوں میں کام کرتے دیکھا ہے۔ تم کل دس بجے مجھ سے ملنا۔ ہم ٹرسٹ کے سیکرٹری سے ملنے جائیں گے۔ اگر انھوں نے کچھ نہ کیا تو میرا ایک دوست ہے نمائی گھوشال۔ اسے کنزیومر کورٹ کے بارے میں پورا تجربہ ہے۔ ہمیں اس معاملے کو ویسے بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ تمھاری تنخواہ کا ہی نہیں بلکہ ہم لوگوں کے دل کا سوال ہے۔ کتنی پرانی عمارت ہے یہ، کتنی اونچی اونچی سیڑھیاں ہیں اس کی، اور ہمیں کتنی ساری سیڑھیاں ہر روز طے کرنی پڑتی ہیں۔ کوئی حادثہ ہو گیا تو؟ کیا لوگ کرایہ نہیں دیتے؟"

(جبکہ مجھے پتا تھا لوگ جو کرایہ دیتے ہیں اس سے اس عمارت کا میونسپلٹی کا ٹیکس بھرنا بھی ممکن نہ تھا۔)

"حضور آپ کو لگتا ہے یہ لفٹ پھر سے چلنے لگے گا؟" کریم کی آنکھوں میں ایک روشنی جاگ اٹھی ہے۔ وہ ایک نیا انسان نظر آ رہا ہے جیسے پھر سے اسے زندگی میں ایک مقصد ہاتھ آ گیا ہو۔

"بالکل!" میں اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ "اس ملک میں کیا نہیں ہو سکتا؟ صرف ہمارے اندر ارادے کی کمی ہے۔ میں تمھیں ایک ٹیوب ویل کی کہانی سناتا ہوں جو بلاوجہ لوگوں کا راستہ روکا کرتا تھا۔"

خدا کے بندے

دس کا گجر بجتے ہی آتمائیں برجوں، گنبدوں اور کنگوروں سے اتر آتیں۔ وہ غیر مستعمل گرجاگھر کے ہر تاریک اور نیم تاریک گوشے پر قبضہ جما لیتیں۔

"انسانوں کا کیا حال ہے؟" وہ آپس میں دریافت کرتیں۔ بھوت اگر بدصورت ہوتے تو چڑیلوں کے بال ان کے کولھوں پر گرے ہوئے ہوتے۔ انہیں آتماؤں کا یہ تجسس بڑا ہی مضحکہ خیز نظر آتا۔

"مرنے کے بعد بھی لوگ ایک دوسرے کی غیبت سے باز نہیں آتے۔" وہ آپس میں سرگوشی کرتیں۔ ان کے قہقہوں سے پرانی دیواریں اور ستون ہلنے لگتے۔ "انسانوں سے کسی دوسری چیز کی امید بھی کیسے کی جاسکتی ہے؟"

چڑیلیں پورے معاملے سے بیزار لگتیں۔ انہوں نے دنیا کو ہر زاویے سے دیکھا تھا، پرکھا تھا۔ انہیں زندہ انسانوں کے کتنے ہی ٹونوں ٹوٹکوں سے گذرنا پڑتا، انکا ستم سہنا پڑتا ۔ اوپر سے انسان کا تعصب، بے جا خوف اور بے رحمی الگ۔ چڑیلیں اکثر اپنے لٹکتے پستانوں کو مسلتی مروڑتی رہتیں۔ وہ رونے کی کوشش میں دانت کچکچاتیں۔ مگر آنسو پر تو بہر حال انسانوں کا قبضہ تھا۔ انسان جس نے اپنی آہوں سے آسمان کو سیاہ کر رکھا تھا۔ انسان جس نے اپنے آنسوؤں سے سمندر کو نمکین بناڈالا تھا۔

مگر یہ کہانی اس کے بعد سے بھی شروع کی جاسکتی ہے۔

جس دن مرلی نسکر پوری طرح پاگل ہوا اس کے گھر کے پچھواڑے ایک کتیا نے بچے دیے۔ اس کتیا کو ایک بار مرلی نسکر نے اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کی تھی۔ مرلی کے بال لانبے تھے اور گھر والے اس کی موت کی دعا مانگا کرتے تھے۔ دراصل مرلی نسکر کا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ آپ اس سے برے سے برے کام کی امید کرسکتے تھے۔ صرف تھوڑی سی رقم کے عوض اس نے اپنے جسم کو عام گذرگاہ بناڈالا تھا۔ جیب کترے اس کے پاس پیسے رکھتے اور طوائفیں اسے ساتھ لے کر ڈاکٹروں کے پاس جاتیں۔

مگر کوئی اس کے دل سے پوچھے! وہ ان جراثیم برداروں کے شوہر کی اداکاری کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کوئی صحیح معنوں میں اس کا بچہ اپنے پیٹ میں لے کر اسے گرانے ڈاکٹر کے پاس جائے۔ ڈاکٹر جو بیماری کا آلہ گردن سے لٹکائے اپنی پہلی فرصت میں عورتوں کو میز پر لیٹ جانے کی ہدایت دے ڈالتے۔ عورتیں جو پیشے سے تو طوائف تھیں مگر جنہیں مردوں کی انگلیوں سے ٹٹولے جانا اچھا نہ لگتا۔ مگر خدا کے بعد اگر آپکی آتما پر کسی کا پورا حق بنتا ہے تو وہ ڈاکٹروں کا ہے جس کے بعد آپ کا جسم پوری طرح آپ کا نہیں ہوتا۔ مرلی نسکر کو پڑھنے کا شوق کولکاتا کھینچ لایا تھا۔ اس کے ماں باپ دونوں سوتیلے تھے اور کسی نہ کسی طرح مرلی نسکر جیسے مرض سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ مگر کولکاتا آکر اس نے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی کہ زندگی میں پڑھائی لکھائی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اس کے پاس نہ ہاسٹل کے اخراجات کے لئے پیسے تھے نہ کتاب اور کاپیوں کے لئے۔ شاید وہ بھی دوسرے لڑکوں کی طرح آوارہ گردی کرتے کرتے ایک پتلی کاپی تھامے بی اے پاس کرلیتا اور کہیں کلرک یا ٹیچر کا عہدہ سنبھال کر ایک بکواس اور بزدلانہ زندگی گذارتا۔ مگر سونا گاچھی کے دلال گرجا شنکر نے اسے سنبھال لیا اور اس گھسی پٹی زندگی سے نجات دلائی۔ گرجا شنکر سے اس کی ملاقات لوکل ٹرین کے اندر ہوئی تھی جہاں سے وہ اسے اپنے ساتھ سونا گاچھی لے آیا اور مہندی لکشمی کے کمرے میں اس کا ٹھکانہ طے کر دیا۔ ٹھیک اس کے ایک ہفتے بعد گرجا شنکر کو پولیس اٹھا کر لے گئی۔ گرجا شنکر تھانے کے انچارج گیا پرساد کے لئے کوٹھوں سے ہفتہ وصولتا تھا۔

یہ بات مہندی لکشمی نے مرلی نسکر کو بتائی۔ مہندی لکشمی کی عمر ڈھلنے لگی تھی اسی لئے وہ اب گاہک شاذ و نادر ہی رجھا پاتی۔ پھر بھی سونا گاچھی کے پورے امام بخش لین میں وہی سب سے مقبول حرافہ تھی جو بیک وقت گاہکوں کے ساتھ 'بیٹھ' بھی جاتی اور ماسی کا فرض بھی نبھاتی۔ اپنا پاپ کم کرنے کے لئے اس نے اپنی چاروں دیواروں کو دیوی دیوتاؤں کے طغروں سے ڈھانک رکھا تھا۔ مرلی نسکر جیسے پڑھے لکھے لڑکوں کی مدد کرنا، یہ اس کی دوسری ہابی تھی۔ اپنے کمرے میں چادر لٹکا کر مہندی لکشمی نے اسے دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اپنے حصے میں مرلی نسکر نطشہ اور آچاریہ رجنیش کی کتابیں پڑھا کرتا جنہیں وہ گول پارک کی ایک لائبریری سے چرا کر لاتا اور پڑھنے کے بعد ایک سندھی کو بیچ دیا کرتا جسکی فری اسکول اسٹریٹ میں پرانی کتاب کی دکان تھی۔ دوسرے حصے میں مہندی لکشمی اپنا دھندہ چلاتی، کھانا پکاتی، رامائن کا پاٹھ کرتی یا اپنے فرضی شوہر نول پروہت کے لئے مانگ میں سیندور بھرا کرتی۔

"نول پروہت؟" مرلی نسکر پوچھتا۔ "وہ زندہ ہے تو اسے تمہارے ساتھ ہونا چاہئے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟ تم نے دو چار اکھیر کیا پڑھ لئے پورے گیانی ہوگئے ہو کیا؟" مہندی لکشمی کہتی۔ "اپنی بات واپس لے مرلی۔ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ پورے مندر ہاٹ میں اس کے جیسا بڑھئی کوئی دوسرا نہیں۔"

"عجیب بات ہے۔" مرلی نسکر کہتا۔ نطشہ کو پڑھ کر اس کے اندر جو جوش بیدار ہوتا وہ فوراً مر جاتا۔ وہ سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگتا اور یہ سب کچھ اس وقت تک چلتا جب تک مہندی لکشمی کے دھندے کا وقت نہ آجاتا۔ اپنے گاہک کے ساتھ مہندی جب کمرے کے دوسرے حصے میں داخل ہوتی تو ڈوری سے لٹکتی چادر کا کونا کھسکا کر اپنے پان خوردہ دانت چمکا کر ہنستی۔

"بہت آنکھ خراب کرلی تو نے مرلی۔ اب کچھ ٹی وی بھی دیکھ لے۔" اور مرلی نسکر اپنی کتابیں سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل جاتا۔ مگر کبھی کبھار وہ بھی سفید وسیاہ ٹی وی سے جا چپکتا جو گلی کے کونے میں پنواڑی کی دکان میں چلتی رہتی۔ یہاں بوڑی اور کم عمر طوائفوں جنہوں نے اپنا پیشہ ابھی شروع نہیں کیا تھا، ناکام دلالوں اور منتظر گاہکوں کی عجیب بھیڑ لگتی۔ یہاں گلیوں کی سرنگوں سے گذرتی ہوئی ٹھنڈی ہوا آتی۔ لوگ دیواروں پر تھوکتے یا پان کی پچکاریاں مارتے۔ اکثر ایک آدھ سیاسی لیڈر کا بھاشن بھی ہو جاتا۔ یعنی یہاں پر بھی زندگی کچھ اسی ڈھنگ سے چل رہی تھی جس ڈھنگ سے ایک عام مصروف گذرگاہ پر چلا کرتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شریف محلوں میں لوگ گناہوں کے خوف سے سہمے دبے زندگی گذارا کرتے ہیں جبکہ یہاں انسان کا ضمیر پاک وصاف تھا۔ سب کچھ عیاں تھا اور طوائفیں اپنا دھندہ کسی دن مزدور کے انداز سے ہی چلاتیں۔ اور دلالوں کے اپنے گھر سنسار تھے اور گاہکوں کو ایک مہذب دنیا میں واپس لوٹنا ہوتا۔

صرف مرلی نسکر اس پورے منظر میں کہیں فٹ نہ ہوتا۔

تو اس نے سریندر ناتھ کالج کی یونین کے دنگوں میں پناہ لی۔ اس نے مہاتما گاندھی روڈ پر سیاسی جھنڈا اپنایا اور ٹرام کی پٹریوں کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر چھرے چمکائے، بم بنانے کے گر سیکھے اور کانگریس پارٹی کے ایک حمایتی غنڈے گوپال کے کان کاٹ کر اسے "کن کٹا گوپال" کی شہرت عطا کی۔ اور جب فائنل امتحان شروع ہوا، اس نے مہندی لکشمی کے کمرے میں لمبی نیند کی عادت ڈال لی۔ اکثر مہندی جگہ نہ پا کر اس لے لپٹ کر سو جاتی۔ وہ خواب کی حالت میں مہندی لکشمی کو ڈھکیلتا رہتا۔ مگر گاہکوں سے بے رحمی کے ساتھ پیسے جانے کے بعد مہندی کے اندر بیداری کی سکت کہاں تھی۔ وہ اس وقت تک نہ جاگتی جب تک کھڑکی سے دھوپ اتر کر اس کے چہرے کو توے کی طرح گرم نہ کر ڈالتی۔ جاگنے پر اسے مرلی نسکر پر ترس آتا۔ وہ اس کے لئے چائے بناتی، اسے ٹوتھ برش تھماتی اور اسے آڑے ہاتھوں لیتی۔

"تو پڑھنے آیا ہے کہ کیا! میں سمجھی تھی میں پنیہ کمارہی ہوں۔ پنیہ میری جوتی۔ تو آخر کار بھڑوا ہی نکلے گا۔ مرلی چل بھاگ۔ جلدی سے پڑھ لکھ کر دور ہو۔ مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

"جیسے؟"

"تجھے اس سے مطلب؟ جا پڑھ لکھ کر سبھیہ سماج میں لوٹ جا۔ ڈھیر ساری لڑکیاں سیندور سجا کر تیرے بچے جننے کے لئے اتاولی بیٹھی ہیں۔"

مرلی نسکر کھکھلا کر ہنستا۔ چلو یہ بھی سہی، وہ سوچتا۔ جب یہ طوائفیں بچے جننے سے نہیں چوکتیں تو شریف گھرانے کی لڑکیاں کیوں پیچھے رہیں۔ شریف گھرانے، وہ دوبارہ کھکھلا کر ہنستا۔ طوائفیں بھی سیندور پہنتی ہیں، طغرے ٹانگتی ہیں، شوہر کا ڈھونگ رچاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سبھیہ سماج میں جہاں بیویاں کماؤ ہوتی ہیں وہاں لوگ شوہر اور بیوی میں نہ جانے کیسے امتیاز کرتے ہوں گے؟

مرلی نسکر مارکس کے بتائے گئے عورت مرد کے تعلقات میں استحصال کے پہلو سے بے چین تھا۔ وہ طوائفوں کو تو سمجھ سکتا تھا، مگر بیویاں؟ اسے ان پر ترس آتا۔ صبح سے آدھی رات تک کے کاموں کے لئے انہیں تو انکا ایک چوتھائی معاوضہ بھی نہیں ملتا، بلکہ اکثر دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے بھی صحیح ڈھنگ کے نہیں ہوتے۔ سونا گاچھی کی حرافائیں اکثر مردوں کو، جو جنسی عمل ختم کرنے کا نام نہ لیتے، یوں طعنہ دیتیں:

"اپنی جورو سمجھا ہے کیا، سالا۔ چل ہٹ۔ دھندے کا ٹیم ہے۔"

مگر اپنی فرصت کے لمحوں میں، یا اس وقت جب وہ ذہنی طور پر ان غلیظ لوگوں کے بیچ نہ ہوتا، وہ سوچتا، ان سب سے باہر نکلنے کا کوئی تو راستہ ہوگا۔ راستے تو کئی تھے اور اسے روکنے والا بھی کوئی نہ تھا، مگر وہاں سے نکل جانے کے بعد کون سے دنیا تھی بھلا، سوائے اس سبھیہ دنیا کے جو اسے اور بھی اوٹ پٹانگ دکھائی دیتی۔ اس نے ایک دن اپنے اندر کو لمبس کو جاگتا محسوس کیا۔ مگر اس نے دیکھا کہ اس سبھیہ دنیا کی شروعات دراصل ٹرام راستہ پہ کھڑے پولیس کے لوگوں سے ہوتی تھی جو کوٹھوں سے اپنے حصے کا ہفتہ وصولتے تھے، دلالوں کی دی ہوئی کھینی پھانکتے تھے اور طوائفوں سے گپیں لڑاتے تھے۔ اور ان سے پرے دکاندار دکانوں میں بورسے بیٹھے تھے، وہ بزنس مین تھے جو اپنے کالے پیسوں کو سفید کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے اپناتے یا سرکاری آفس کے بابو تھے جو رشوت کے پیسوں سے پنپتے، گاڑیوں میں گھومتے، گھروں میں ایر کنڈیشنر لگاتے اور اپنی بیویوں کی آنکھوں میں ابتا بھ بچن تھے۔ یا پھر اسکول اور کالج تھے جو ان کے لئے اپنے معنی کھو چکے تھے۔

وہ اصلی شہر کہیں تو ہوگا جس پر ہمیں شرمندہ نہ ہونا پڑے، وہ دل ہی دل میں سوچتا۔ نہ جانے اس کے باشندے کیسے ہوں گے؟ ایک بات طے ہے، بڑا ہی دلچسپ ہوگا وہ اور وہ اس خواب میں زندہ تھا۔ لیکن آخر میں۔۔۔ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں، وہ خود کو سمجھاتا۔ اچھا فرض کرلو ہم نے اسے پالیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں کیا ہم لوگ اس

کے اندر دوسرا سونا گاچھی نہ اگاڈالیں گے، کیا ٹھوس کاروباری لین دین وہاں نہ ہوگی جو ابھی ہے، کیا اس کے سیاست داں آج سے کچھ مختلف ہوں گے؟ کیا اس شہر کی تاریخ اس سے جدا ہوگی جو ہم موٹی موٹی کتابوں میں بچا کر رکھتے ہیں۔

"مرلی نسکر تو ہندو ہے؟"

"ہاں۔"

"جھوٹ، تیرے پاس قرآن ہے۔"

"بائبل بھی ہے، گیتا بھی ہے۔"

"چل پتلون اتار کر دکھا، آج فیصلہ ہو جانا چاہئے، مجھے لگتا ہے تو مسلمان ہے۔"

"اگر میں مسلمان نکلا تو اس سے نہ تیری دنیا بدل جائے گی نہ میری۔ مگر تیرا دھیان اس بات کی طرف کیوں گیا؟ ٹی وی میں خبریں بہت دیکھنے لگی ہے لکشمی۔ آج کل دھرم کے نام پر لوگ اپنی سیاست چمکانے میں خوب مصروف ہیں "۔

"تو ڈرتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کس سے؟"

" یہ پتہ ہوتا تو اس ڈر کو نہ سمجھ لیتا، اسے مار نہ ڈالتا؟"

"کسے مار ڈالتا۔۔۔؟" مہندی لکشمی کا ذہن گڈمڈ ہو جاتا۔ مرلی نسکر مسکراتا۔

"مہندی، کتنے سارے دیوی دیوتاؤں کو تم نے دیواروں سے ٹانگ رکھا ہے۔ کوئی تمہارے بارے میں نہیں سوچتا؟"

"کیسے نہیں سوچتا؟ اس عمر میں اتنے سارے گاہک کیا آسمان سے ٹپک کر آتے ہیں؟ یہ تو انہیں دیوی دیوتاؤں کی کرپا ہے۔"

"میرا مطلب ہے۔۔۔" پھر مرلی ہار مان کر مسکراتا۔ "ہاں، سو تو ہے۔"

"پھر؟" مہندی لکشمی اپنی جیت سے سرشار چھت کی دھوپ میں بال سکھانے بیٹھ جاتی۔

" یہ میرے بچپن کی بات ہے۔۔" وہ جاری ہو جاتی۔ "ان دنوں سکہ ماسی کا دور دورہ تھا۔ میں لال فیتہ لگا کر اسکول جاتی۔ میرے جوبن کے ابھار سے پہلے ہی میرے دو عاشق پیدا ہو گئے، بِلّا اور تارا۔"

"بیچ میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تو بھی ایک ویشیا کی بیٹی تھی۔"

"وہ تو ہئی ہے۔ تو بلا اور تارا میرے دو عاشق تھے۔ بلا کو کتوں سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ گیلف اسٹریٹ سے کتے چرا کر لاتا اور مجھے تحفے میں دیتا۔ بڑے پیارے پیارے کتے ہوتے، گھنے بالوں والے، بٹنوں جیسی آنکھوں والے، کبھی کبھی بغیر دم کے، کبھی بالکل ہی چھوٹے چھوٹے پاؤں والے جیسے ان کے گھٹنوں کے نیچے کا حصہ جمین کے اندر ہو۔ تارا کم بولتا تھا۔ سکہ ماسی کا چھوڑا ہوا جاسوس تھا۔ پولس کے لئے بھی مکھبری کرتا تھا۔ تو ایک دن بلا اور تارا میں استرا چل گیا۔ پھر دونوں جانے کہاں غائب ہو گئے۔"

"عجیب کہانی ہے تیری بھی مہندی۔ نہ سنو تو دل تجسس سے بے چین، سنو تو اس میں کوئی دم نہیں۔"

"کیا؟"

"میرا مطلب ہے کہانی اچھی تھی۔ بس تو اس میں ذرا پہلے آگئی لگتی ہے۔"

"چل جامرلی۔ میری جندگی کہانیوں سے بھری ہے۔ تیری طرح نہیں کہ بس پستک ہی پستک۔ میں بتاؤں۔ ایک بار ایک گجراتی سیٹھ مجھے ممبئی لے جانے کے لئے بے چین ہو اٹھا۔ میں اس وخت بہت کم سن تھی۔ میں نے اس سے پوچھا ممبئی میں کیا ہے سیٹھ؟ اس نے کہا سمندر ہے۔ میں نے پوچھا سمندر کے علاوہ کیا ہے؟ بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں کے علاوہ کیا ہے؟ فلم سٹی ہے۔ تو میں نے پوچھا وہاں سونا گاچھی ہے؟ اس نے کہا اس سے بھی بڑی بڑی۔ مثلاً؟ میں پوچھ بیٹھی۔ محمد علی روڈ! تو وہاں سے کوئی مہندی لکشمی کو کیوں نہیں اٹھالیتا بھڑوے؟ اس پر اس نے سکہ ماسی کو میرے خلاف اتنا بھڑکایا، اتنا بھڑکایا کہ مجھے کوٹھی چھوڑنی پڑی۔ بعد میں سکہ ماسی کھود مجھے واپس لینے آئی۔ مگر تب تک میرے دن پھر چکے تھے۔"

زیادہ تر وقت مرلی نسکر چھت کی کمزور منڈیر پر جھکا ماؤتھ آرگن پر کوئی ہندی فلمی گیت مشق کیا کرتا۔ اسے کوئی گاہک مہندی لکشمی کے بستر پر چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ اس کی مشق سے اکتا جاتا تو دور تک ان کھنڈر نما پرانی عمارتوں کے سلسلے کو تاکتا رہتا جن کی چھتوں میں طوائفیں نہاتی دھوتیں، کھانا بناتیں، بچے کھلاتیں اور چھت کی دھوپ میں

بال سکھاتیں نظر آتیں۔ نیچے خدا کی مخلوق اپنی زندگی جی رہی تھی اوپر خدا کا بنایا ہوا آسمان تھا جس میں انسانوں نے جگہ جگہ پتنگ ٹانگ رکھے تھے جیسے ان کی ڈوریوں سے یہ زمین اور اس کی کھنڈر نما عمارتیں لٹک رہی ہوں۔ وہ سوچتا، میرے یہاں ہونے کا مقصد؟ اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ سوچتا، یہاں نہ ہو کر بھی میں کون سا تیر مار لیتا؟ تو وہ مڑ کر مہندی لکشمی سے مخاطب ہوتا۔

"اچھا مہندی، میں اگر چلا گیا۔ بلا اور تارا کی طرح تمہیں یاد رہوں گا؟"

"نہ تو میرا بلا نہ تو میرا تارا، تجھے یاد کرنا کیا اور نہ یاد کرنا کیا۔"

"تبھی تو میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ کسی کو تو میری فکر ہو!"

اور اس دن مرلی نسکر نے سوچا اسے ایک نئی شخصیت چاہئے اور اس نے مونچھیں اگانا شروع کر دیا۔ مگر اس معاملے میں اسے کسی کی مدد چاہئے تھی۔ گرجا شنکر؟ اب گرجا شنکر سے اس کے تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ گرجا شنکر چونا گلی کی ایک طوائف سے بیاہ رچا کر کنونٹ روڈ پر تین نمبر پل کے نیچے ایک ممنوعہ جھونپری کھڑی کر چکا تھا اور بچے اگانے میں مصروف تھا۔ اس نے چور گارد میں چائے کی ایک دکان بھی کھول لی تھی جہاں گپی لوگ اڈا دینے جاتے۔ ایک دن مرلی نسکر کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اسے لکڑی کے بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے آنکھ ماری۔

"کس نے کہا تجھے موچھ اگانے کے لئے؟ ویسے اس میں تو اتنا برا نہیں لگتا۔ مگر کس نے کہا؟"

"دل نے۔"

"دل کی بات مانا کر۔ میں نے دل کی بات مانی، اب دیکھ میرے تین بچے ہیں اور یہ میری چائے کی دکان کچھ بری نہیں چلتی۔ اور تیری بھابھی ہر دوسرے مہینے بیمار پڑی رہتی ہے۔"

"کون سی بیماری؟"

"عورت کی بیماری۔ اس سے زیادہ نہیں پوچھا کرتے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں اب ہمارے حالات اتنے تو برے نہیں مگر اتنے اچھے بھی نہیں رہے۔"

"تم پچھتا رہے ہو گرجا؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں اتنا جانتا ہوں آدمی ہر بار بدل کر خود کو ہی پاتا ہے۔"

واپسی میں ایک سنسان گلی میں ایک غیر مستعمل گرجا گھر کے پھاٹک کے سامنے مرلی نے پیشاب کرنے کے بعد زپ اوپر کھینچا تو اس کا عضو تناسل اٹک گیا۔ درد سے اس کی چیخ نکل گئی، آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ احتیاط سے زپ لگا کر وہ لوہے کے ڈھلائی لوہے کے پھاٹک کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس کا سینہ کانپ رہا تھا۔ اسنے اپنے آنسو پونچھے اور ٹیس کے مدھم پڑنے کا انتظار کرتا رہا۔ درد کی متواتر ٹیس ابھر رہی تھی جیسے اس کی ملائم جلد کو کوئی چیونٹی رہ رہ کر کاٹ رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اس کے حواس درست ہوئے تو اسے زخم کی جگہ دیکھنے کی ہمت ہوئی۔ کہیں خون نہ بہہ گیا ہو۔ اس نے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ اس پر ایک بھاری بھرکم زنجیر لٹک رہی تھی۔ مگر جنگلوں کے نچلے حصے کو آگے پیچھے ہلا کر اتنی جگہ نکال لی گئی تھی کہ انسان کسی قدر محنت کے بعد اور کتے آسانی سے اندر جا سکیں۔ وہ اندر پہنچ کر دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور اس نے زپ کو نیچے سرکایا۔ ایک جگہ جلد اس طرح کٹ گئی تھی کہ خون کی ننھی ننھی بوندیں نکل کر جم گئی تھیں۔ زپ لگا کر وہ گرجا گھر کے ٹوٹے پھوٹے صحن پر چلتا ہوا چبوترے کے پاس پہنچا اور ایک کہنہ پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اس نے سر کو جھکا لیا۔

گرجا گھر کی کھڑکیوں کے زیادہ تر شیشے دھندلے مگر محفوظ تھے۔ داخلے کے چوبی دروازے کا ایک سرا ٹوٹ کر پیچھے لٹک گیا تھا۔ یقیناً کچھ لوگوں نے اس کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور نکال لیا ہو گا۔ اس رخنے سے گرجا گھر کے اندر کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ ہاں بائیں طرف ایک مرغولے دار سیڑھی مینار کی طرف چلی گئی تھی۔ اندر سے چمگادڑوں کی بیٹ کی مہک اتنی دور تک آ رہی تھی۔

اگلی بار اس کی گرجا شنکر سے ملاقات اس کے ٹھکانے پر ہوئی تو اس کے چہرے کا رنگ گرا ہوا تھا۔ گرجا نے سر منڈوا لیا تھا۔ اسے شدید بخار بھی تھا۔

"تمہیں کمبل اسپتال جانا چاہئے۔" مرلی نے مشورہ دیا۔ یہ اسپتال سیالدہ کے قریب واقع تھا۔

"میں جا چکا ہوں۔ انہوں نے میرے خون کی جانچ کی ہے۔ کل رپورٹ مل جائے گی۔" اس نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا جسے سیادلاری بنا کر لائی تھی۔ سیادلاری کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ کبھی وہ چونا گلی میں جسم بیچا کرتی ہو گی۔ لگاتار تین بچوں کے بعد اس کا جسم پھیل گیا تھا۔ سیندور وہ جم کر لگاتی تھی اور بلا ناغہ پوجا پاٹ میں لگی رہتی۔ انکی غیر قانونی جھونپڑی ریلوے کی پٹڑی سے بس ہاتھ بھر کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ جھونپری کے کھلے آنگن میں ایک پتلے بانس پر بھگوا جھنڈا لہرا رہا تھا جس میں ہنومان جی ایک

ہاتھ میں گدا اور دوسرے میں پہاڑ اٹھائے اڑ رہے تھے۔ پٹری پر لوکل ٹرین ہر دس منٹ پر دوڑا کرتی اور جھونپڑی کو ہلاتی رہتی۔ تینوں بچے پٹری کے آس پاس رینگتے ہوئے بڑے ہو رہے تھے۔

"مجھے تو تیرا پہلے کا دھندا زیادہ معنی رکھتا دکھائی دیتا ہے۔" مرلی نسکر نے کہا۔ "اور بھابھی کا تو تو نے ستیاناس ہی کر دیا۔"

"تو جا بھڑوا گری کر۔" گرجا شنکر نے غصے سے کہا۔ "تو ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ کسی رنڈی کا رکھیل بن جا مرلی۔ اس سے زیادہ تیرا دوسرا مصرف بھگوان کے پاس بھی نہ ہو گا۔"

"چائے اچھی تھی بھابھی۔" مرلی نے کہا۔ "بس ایسا ہے کہ میں ذرا دل کی بات کرتا ہوں۔ مجھے وہ انگریزی میں کیا کہتے ہیں Verbal Diarrhea ہے۔"

"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔؟" دونوں پتی پتنی نے ایک ساتھ کہا۔

"جانے دو۔" مرلی نسکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگلی بار آؤنگا تو بچوں کے لئے چاکلیٹ لاؤں گا۔"

"اور اس کے بعد بغیر چاکلیٹ کے آؤ گے تو بچے تمہارے بارے میں کچھ اچھا نہیں سوچیں گے۔" گرجا شنکر کھانستے ہوئے ہنسا۔ "اس چکر میں مت پڑنا مرلی۔ بچے پالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اور بچے کسی کام کے نہیں ہوتے۔ یہ بڑے ہو کر اپنی دنیا کے ہو لیتے ہیں، ہماری طرح۔"

دوسرے ہفتے مرلی نسکر جب گرجا شنکر کے چائے کے اڈے پر پہنچا تو وہ اڈا اٹھ چکا تھا۔ ریلوے کی پٹری کے کنارے جھونپڑی بھی توڑ دی گئی تھی۔ اس نے آس پاس کے لوگوں سے پتہ چلانے کی کوشش کی مگر کوئی گرجا شنکر کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ ویسے بھی پٹری کے کنارے کوئی آبادی تو تھی نہیں صرف جھاڑیاں تھیں یا ایک متروک ریلوے یارڈ کے ٹوٹے پھوٹے سائبان اور کھمبے۔ مرلی چاکلیٹ کھاتا ہوا کولکاتا کی سڑکوں پر لایعنی نظریں ڈالتا واپس لوٹا۔ اس نے مہندی لکشمی کو یہ عجیب و غریب واقعہ بتایا۔

"گرجا نے ٹھکانہ بدل لیا ہو گا۔" مہندی نے پان کی پیک کونے میں مارتے ہوئے کہا۔ "بڑا چالاک ہے گرجا۔ چونا گلی کی سب سے کھبصورت رنڈی سیادلاری پر ہاتھ مار دیا۔"

"ویسے گرجا بہت بیمار تھا مہندی۔"

"یہ پہلے کیوں نہ بتایا۔ اسپتال دیکھا؟"

"بس یہی چوک ہو گئی۔" مرلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کمبل اسپتال سے ضرور کچھ پتہ چل جائے گا۔" مگر اتنے بڑے اسپتال میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں آتے، سینکڑوں کی تعداد میں ڈسچارج ہوتے۔ گرجا شنکر کے بارے میں پتہ لگانا مشکل کام تھا۔ کئی دن تک مرلی دواؤں سے مہکتے اسپتال کے گلیاروں میں گھوما کیا۔ پھر ایک عقلمند دربان نے اسے مردہ گھر کے بارے میں بتایا مگر وہاں بھی رجسٹر میں گرجا شنکر کا نام نہ تھا۔

"میں اب بھی کہتی ہوں گرجا شنکر نے ٹھکانہ بدل لیا ہو گا۔" مہندی لکشمی بولی۔ "جسکی اتنی کھبصورت جورو ہو اسے ٹھکانہ بدلتے رہنا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ گریب کی جورو سارے محلے کی بھابھی ہوتی ہے۔"

"تو تو بس مہندی سٹھیا گئی ہے۔" مرلی نے کہا۔ "جانے گاہک تیرے میں کیا مزا لیتے ہونگے۔"

"گاہک اپنا مجا خود لے کر آتے ہیں۔" مہندی اپنے پان خوردہ دانتوں سے مسکرائی۔ "ہم لوگ تو بہانے بھر ہیں۔"

"واقعی۔۔۔!' مرلی مسکرایا۔ "میں نے اس نظر سے اس بات کو کبھی نہیں دیکھا۔"

اور اس دن سے اس نے گلی میں آنے والوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ واقعی یہ ایک حقیقت تھی، یہ لوگ اپنا مزا خود لے کر آتے تھے، بھوکی آنکھیں، رال ٹپکاتے ہوئے ہونٹ، گلی میں دور تک کھڑی ویشیاؤں کے سراپے پر گدھ کی نظریں ڈالتے ہوئے یہ لوگ کمسن، دراز عمر، بوڑھے، جوان، شادی شدہ، غیر شادی شدہ، رنڈوے۔ اگر وہ اس مہانگر کی گلیوں میں آوارہ گھومنا شروع کر دے تو ان میں ہزاروں کو پہچان لے۔ مگر اس سے کیا حاصل؟ کیا اس سے اس کی اپنی یا انکی دنیا بدل جائے گی؟ اس نے دھیرے دھیرے دلالوں کے ساتھ بیٹھنا شروع کر دیا۔ لالہ، رحیم، بغیچہ، گلاب چند۔

"کنگن کوٹا کی چھوریاں بس دیکھنے لائق ہوتی ہیں۔" لالہ چھتیس گڑھ کے ایک گاؤں کا ذکر کر رہا تھا۔ "ان شہری لڑکیوں کی طرح پلپلی نہیں۔ بدن انار کی طرح گدّر، انگلی سے ٹھوکو کہ ٹن۔ مگر سالیاں کولکاتا آنا نہیں چاہتیں۔"

"بنگلہ دیش کی لڑکیوں نے سالا یہاں بجار کھرا اب کر دیا ہے۔" بغیچہ نے کھینی ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "اور بھئیے، آج کل کتنی کم سن لڑکیاں چلی آ رہی ہیں۔ ابے گلاب۔۔۔" اسے یاد آیا۔ "ابے لاریٹو کی جو لڑکی آتی تھی، اب نظر نہیں آتی، کیا نام تھا اس کا؟"

"اسکا بیاہ ہو گیا رہے گا۔" رحیم کھکھلا کر ہنسا۔ اس کے دانت پیلے ہو رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے اور گلی میں داخل ہونے والوں پر نظریں بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن مہندی لکشمی نے اسے وہاں سے بلوا بھیجا۔ ایک ادھیڑ عمر کا ناٹا آدمی مرلی کا انتظار کر رہا تھا۔

"سیادلاری۔" مہندی نے پان خوردہ دانتوں کو چمکاتے ہوئے کہا۔ "وہ چونا گلی میں تیری باٹ جوہ رہی ہے۔"

"معاملہ کیا ہے؟" مرلی نے ناٹے آدمی سے پوچھا جو مہندی لکشمی کی بنائی ہوئی چائے سڑپ رہا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ بھی کوئی دلال ہی تھا۔ "بس سیادلاری نے پرارتھنا کی سو تم تک سندیس پہنچا دیا۔ اچھا بھا بھی، کبھی کو نو جرورت آن پڑے تو یاد رکھئے گا۔ میرا نام ہری ناتھ ہے۔"

"تو چونا گلی نہیں جائے گا؟" ہری ناتھ کے جانے کے بعد مہندی لکشمی نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کارن؟"

"اب کسے کارن دیتا پھروں بھلا۔ بس نہیں جاتا۔"

مگر اس نے جھوٹ کہا۔ فرصت ملتے ہی وہ سیدھا چونا گلی نکل گیا۔

اس نے سیادلاری کو اپنے تین بچوں کے ساتھ چوتھے مالے پر لکڑی کے ایک کھوکھے کے اندر بیٹھا پایا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس نے مرلی کو دیکھ کر اپنا بھاری پستان ساڑی کے آنچل سے چھپا لیا۔

"گر جا کدھر کو ہے سیا؟" مرلی نے پیش کردہ مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اسے چونا گلی نہیں بھا رہی تھی۔ یہاں آس پاس کی گلیوں سے چمڑے کے گوداموں کی کتنی تیز سڑاند بہہ کر آ رہی تھی، جیسے جراثیم ہوا میں تیر رہے ہوں۔

"میرے کو کیا معلوم۔" سیادلاری بولی۔ "بس ایک دن وہ دکھائی نہیں دیا۔ سالا سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

مرلی کو پتہ تھا وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ اس نے پہلی بار سیادلاری کے سراپے کا جائزہ لیا۔ گرچہ اس کا جسم پہلے جیسا نہیں رہ گیا تھا مگر چونا گلی لوٹنے کے بعد شاید اس کا کھویا ہوا کچھ واپس لوٹنے لگا تھا۔ مرلی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"گاہک لینے لگی ہو؟"

"ابھی تو نہیں۔" سیادلاری بولی، پھر دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ "مجھے ایک آدمی چاہئے۔"

"وہ ہری ناتھ کیا برا ہے؟"

"نہیں۔" سیادلاری بولی۔ "نوا آدمی چاہئے۔"

"آج کل گاہک اپنی پسند کی رنڈیاں خود ڈھونڈ نکالتے ہیں، بڑی طاقتور عینکیں لے کر آتے ہیں۔" مرلی نے ماحول کی گمبھیرتا کو کم کرنے کے لئے کہا۔

"میں نیچے نہیں کھڑی ہو سکتی۔" سیادلاری بولی۔ "میرے تین بچے ہیں۔"

"انہیں انا تھ آشرم میں ڈال دو۔"

"تم ہی ڈال آؤ۔" مرلی نے دیکھا سیا کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔ مرلی کھکھلا کر ہنس پڑا۔

"ایسی نرم پڑے گی تو جی سکے گی سیا؟ میں وعدہ نہیں کرتا، مگر گرجا کا لحاظ ہے مجھے۔ گرجا نے ایک بار مجھے بھڑوا گری کے طعنے دیے تھے، آج اس کی جورو مجھے اس راستے پر لگا رہی ہے۔"

"جیون کے سارے راستے ایک ہی جیسے ہیں۔" سیادلاری اپنی ساڑی کے پلو سے آنکھ پوچھتے ہوئے بولی۔ "کہیں پر کچھ اچھا ہے تو کہیں پر کچھ برا۔ مگر کل ملا کر سب ایک ہی جیسا ہے۔"

"یہ تو میں نے کسی کتاب میں بھی نہیں پڑھا۔"

"سیادلاری سے پڑھ لے۔" اس نے بچے کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہا اور اپنے بالوں پر کنگھی کرنے لگی۔ مرلی کے سامنے ہی اس نے اپنی ساڑی بدلی، بال باندھے، میک اپ کیے، بندیا چپکائی اور اس سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کسی ماڈل کی طرح اپنے داہنے کولھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ مرلی کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ واقعی سیادلاری بے انتہا خوبصورت تھی۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں۔

"آنکھیں پھیر لیا۔" سیا کی آواز آئی۔" میں اچھی نہیں لگتی تیکو؟"

"اپنے گاہکوں سے پوچھنا۔"

"تم سے پوچھتی ہوں۔"

"نہیں۔"

"تو پھر گاہکوں سے پوچھنا پڑے گا۔" سیا دلاری مسکرائی۔" مرلی، گرجا سے تیرے بارے میں جتنا سنا تھا اس سے کم نہیں تو۔ ارے تو تو بھڑوؤں سے بھی گیا گذرا ہے۔"

اسے سیا کے لئے گاہک جٹانے میں کٹھنائیاں آرہی تھیں۔ زیادہ تر گاہک کمسن لڑکیاں مانگتے تھے۔ مگر اس نے دیکھا تھا ایک بار جو گاہک سیا کے پاس آتا وہ بار بار آتا۔ مہندی لکشمی کو اس کے اس کام پتہ جب چلا جب مرلی نے اسے خود بتایا۔ مہندی لکشمی کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔

"مرلی، تو بھی بھڑوا!" اس نے کہا۔" ہے بھگوان، میں نے کیا کیا سپنے دیکھ رکھے تھے تیرے لئے۔"

"تو سپنے بہت دیکھتی رے۔" مرلی ہنسا۔" اور یہ بری عادت ہے مہندی۔"

چھ ماہ کے اندر اندر سیا دلاری پوری طرح بزنس میں واپس آچکی تھی۔ اس کے بہت سارے پرانے گاہک بھی اس کے پاس لوٹ آئے۔ ان میں سے بہت سے تو سماج میں بڑے کامیاب بیوپاری بن کر ابھرے تھے۔ آدھی رات کو تھکا ماندا جب وہ مہندی لکشمی کے پاس لوٹتا تو وہ اسے آڑے ہاتھوں لیتی۔

"کِتا پی کے آنے لگا ہے مرلی! سیا نے تجھے کھراب کر دیا، سالی چھنال۔"

"گالی دے لے، پن یاد رکھنا۔۔۔" مرلی نشے کی دھن میں بکتا جاتا۔" وہ چونا گلی کی چندر مکھی ہے۔"

"اور میں، میں کچھ نہیں؟" مہندی لکشمی غرائی۔

"تم ایک پرانی ہانڈی ہو۔ تیرے اندر اب راکھ رہ گیا ہے مہندی۔"

اور مہندی لکشمی جوتی لے کر اس پر پل پڑتی۔ وہ مار کھاتا جاتا اور سیڑھیوں اور دالانوں میں بھاگتا رہتا۔ باقی رنڈیاں کھکھلاتے ہوئے اس دوڑ دھوپ کا مزا لیتیں اور جب دونوں تھک جاتے مرلی مہندی لکشمی کے سینے پر سر رکھ کر کہتا۔

"مجھے زور کی بھوک لگی ہے مہندی۔ سب کچھ کتنا خالی خالی سا لگتا ہے، شاید روٹی سے بھر سکے۔"

اور مہندی اس کے لئے روٹی سینکنے بیٹھ جاتی۔

پچھلے تین دن سے سیا دلاری نے کوئی گاہک نہیں لیا تھا۔ اب وہ اپنا کمرہ بدل چکی تھی۔ نئے کمروں میں ٹی وی اور ریفریجریٹر آچکے تھے، اسنے بچوں کو سنبھالنے کے لئے ایک آیا بھی رکھ لی تھی۔ ان دنوں وہ سلائی مشین پر سلائی سیکھ رہی تھی۔ اسے سلائی سکھانے ایک ٹوپی پہنے داڑھی والے مولانا آتے۔

"سیا؟"

"ہاں۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"نہیں۔"

مرلی نے سر کھجا کر کتاب کے اندر ناک ڈبونے کی کوشش کی۔

"کیا پوچھنا چاہ رہا ہے تو؟" تھوڑی دیر بعد سیا نے سلائی مشین پر اپنا کام روکے بغیر کہا۔

"گرجا کا آخر کیا ہوا؟"

"میں نے بتایا نا میں نہیں جانتی۔"

"تم بتانا نہیں چاہتی۔"

"کیا گرجا کے بغیر جندگی نہیں چل رہی؟" مشین کی کھٹ کھٹ کھٹ۔

"عجیب بات ہے۔" یکایک مرلی کتاب رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسٹول پر بیٹھی سیا کے پیچھے رک کر اس کی گوری ملائم گردن کو سہلانے لگا۔

"کیا چاہئے تجھے؟" سیا نے گردن اس کے ہاتھ سے دور لے جاتے ہوئے اس کی طرف غصیلی آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا۔

"آج تو تو نہا بھی چکی۔ مجھے بھی عورت کی ضرورت ہو سکتی ہے۔"

"دور ہٹ!" سیا اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "کھبر دار جو مجھے ہاتھ لگایا۔"

"مگر کیوں؟" مرلی نے اچنبھے سے کہا۔ "اگر تو سمجھتی ہے کہ میں مفت میں چاہ رہا ہوں تو میں پیسہ دینے کو تیار ہوں۔"

"مرلی، میں کہتی ہوں کھبر دار جو کریب آیا۔" اس نے جھک کر اسٹو کے اوپر سے ٹھنڈا توا اٹھالیا۔

"کمال ہے۔" مرلی نے دست بردار ہوتے ہوئے کہا۔ "آخر تم ہو کیا، ایک ویشیا۔"

"ہاں، مگر سب کے لئے نہیں۔"

"میں کام چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اپنے لئے کوئی دوسرا بھڑواڈھونڈھ لے۔"

"مرلی!" مرلی کو اپنے پیچھے سیا کی سسکی سنائی دی۔ "تجھے پتہ بھی ہے گرجا کو کیا ہوا تھا۔ کتنی بھیانک بیماری ہو گئی تھی اسے۔"

مرلی مڑا۔ سیا کی آنکھوں میں کاجل کے سیاہ قطرے تیر رہے تھے۔

"کھون کا رپٹ ملتے ہی اسے پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔" وہ بولی۔ "پولیس والے ہمیں بھی پکڑنے آئے تھے مگر میں اپنے بچوں کے ساتھ بھاگ نکلی۔"

"گرجا اب پولیس کی حراست میں ہے؟"

"وہ اسپتال سے بھاگ نکلا اور اس نے لوہاپل کے نیچے ریل سے کٹ کر جان دے دی۔"

مرلی کا سر چکرانے لگا۔ اس کے پاؤں جواب دے گئے اور وہ سیا کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "اور تو سیا؟ تجھے بھی یہ بیماری ہے۔"

"میں نہیں جانتی۔ میں نے کبھی جانچ نہیں کروائی۔"

"مجھے پاس پھٹکنے نہیں دیتی۔ کچھ تو گڑبڑ ہے۔"

"میرے پاس تیرے ساتھ جاستی بات کرنے کے لئے ٹیم نہیں ہے۔" سیا سلائی مشین پر بیٹھ گئی اور کھٹ، کھٹ، کھٹ۔ "اور اب شاید تو میرے کسی کام کا بھی نہیں۔ جا، میں کوئی نوا آدمی ڈھونڈ لے گا۔" مشین کے شور کے بیچ اس کی آواز ابھری۔

مرلی کو واپس پا کر مہندی لکشمی خوش تھی۔ وہ مرلی کی نئی کتابوں پر پیار سے انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مگر مرلی کم گو اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔

"سیا نے تجھے نکال دیا؟" مہندی چہکتے ہوئے بولی۔

"مہندی اب بس بھی کر۔" مرلی نے کہا۔ پھر مہندی نے کبھی سیا کا ذکر نہیں چھیڑا۔

ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے سلسلوں میں ایک قریبی مسجد کی اذان بلا تفریق ہر کمرے میں پھیلا کرتی۔ مرلی کمزور منڈیر پر جھکا چیل کوؤں سے لیس آسمان کو تاک رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ماؤتھ آرگن کو بھی ہونٹ سے لگا لیتا مگر اسے بجانا بھول جاتا۔ نیچے گاہکوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے خلا میں تھوک کر اپنے گھنے بالوں کے اندر اپنی انگلیاں پیوست کیں۔ مرشد آباد سے آئی ہوئی طوائف مور بی بی اپنے بچے کو کالکھ کاٹیکا لگا رہی تھی۔

"مرلی تو شادی کیوں نہیں کر لیتا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھ سے کون شادی کریگا مور بی بی۔"

"کون نہیں کرے گا؟"

"یہ بھی کوئی جواب ہوا بھلا۔" مرلی نے گہرے آسمان میں تاکتے ہوئے کہا جہاں بادلوں کے بیچ سرخ دھاریاں تیر رہی تھیں۔ "جانے اس میں کوئی پرلوک ہے بھی کہ نہیں۔" اس نے خود سے کہا اور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے گلی میں اتر آیا جہاں ایک کتیا زمین پر لیٹی درد زہ سے کراہ رہی تھی۔ کچھ خاموش بچے تماشائی بنے اسے گھیرے ہوئے تھے۔

"جاؤ بھاگو گھر۔" مرلی نے انہیں بھگا دیا۔ وہ تیزی سے چونا گلی کی طرف جا رہا تھا۔ سیا نے اسے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

"سیا تجھے یہ دھندہ بند کرنا ہو گا۔" مرلی نے کہا۔ "میرے کو تجھ سے شادی بنانے کا ہے۔"

"میں تجھ سے شادی کرنے کے لئے مری جا رہی ہوں۔"

"تجھے ہر حال میں دھندا بند کرنا ہو گا۔ تو یہ خطرناک مرض نہیں پھیلا سکتی۔"

"کس نے تجھ سے کہہ دیا کہ مجھے کوئی بیماری ہے۔ اور کون بھرے گا ہمارا پیٹ۔۔۔" سیا مسکرائی۔ "سیا دلاری کا بھڑوا؟"

"ہاں۔" مرلی نے کہا۔ "میں تیرے بچوں کی پرورش کریگا، تیری جانچ کرائے گا۔"

پل بھر کے لئے سیا خاموش رہی۔ پھر جیسے اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔

"دور ہٹ میری نظروں کے سامنے سے، دور ہٹ، دور ہٹ، دور ہٹ، دور ہٹ، دور ہٹ۔"

اپنے جنون میں اس نے چاقو کو نہیں دیکھا جو مرلی کے بائیں ہاتھ میں چمک رہا تھا۔

مرلی نسکر کے پاگل پن کی خبر پورے سونا گاچھی میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ مہندی لکشمی کتیا کے نوزائیدہ بچوں کو اٹھالائی تھی اور انکی دیکھ بھال کرنے میں مصروف تھی جب اسے یہ اطلاع ملی۔ وہ دوڑتی ہوئی مرلی تک گئی مگر اسنے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ کچھ باوردی پولیس والے مرلی کے پیچھے لگے تھے کیونکہ اس پر چونا گلی میں سیا دلاری کے خون کا الزام تھا۔ پولیس والے دوسرے دلالوں کی مدد سے اسے باندھ کر لے تو گئے مگر کچھ دنوں کے بعد وہ پھر سے واپس آ گیا۔ اس نے مہندی لکشمی کی بالکنی کے نیچے اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ بڑے بڑے بال اور داڑھی کے اندر اس کا چہرہ یوں نظر آنے لگا تھا جیسے وہ اپنی صلیب سے کچھ ہی فاصلے پر جی رہا ہو۔ وہ زیادہ تر کسی غلیظ دیوار سے پیٹھ لگائے گلی سے گذرتے لوگوں پر ہانک لگایا کرتا۔

"اس سے دور رہو، اس سے دور رہو، اس کے اندر بچھو کلبلا رہے ہیں، اس سے دور رہو۔"

مہندی نے اس کی یادداشت واپس لانے کے لئے اس کی ساری کتابیں اس کے پاس بھجوادیں مگر وہ کتابیں اس کے پاس پڑی کی پڑی رہیں۔ اس نے انہیں کھولا تک نہیں تھا۔ پھر ایک دن وہ انہیں اٹھا کر ایک نالے میں پھینک آیا۔

"ان سے دور رہو۔" اس نے نالے کے کنارے بیٹھے دست کرتے بھکاری سے کہا جو اپنی اکلوتی آنکھ سے اسے تاک رہا تھا۔ "اچھی چیزیں نہیں ہیں یہ، ان کے اندر بچھو کلبلا رہے ہیں۔"

گرجا گھر کے نیم اندھیرے میں آتمائیں گرتی پڑتی داخلے کی طرف بھاگی رہی تھیں۔ گرجا شنکر کی آتما نے اپنا ہاتھ دونوں طرف پھیلا کر انہیں روکا۔

"وہ سیا ہے۔" اس نے کہا۔ "سب دور رہو۔"

مگر آتمائیں اس کے اندر سے نکلتی چلی گئیں۔ سیا دلاری کی آتما اپنے لمبے گھنے بال بکھیرے نوکیلی دیوار پر چل رہی تھی۔

"دیکھو دیکھو۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "اب مجھے کیا کچھ آ گیا ہے۔"

وہ ننگی تھی اور خوبصورت تھی اور اس کی آنکھیں سبز تھیں اور اس کے پستانوں سے دودھ بہہ رہا تھا اور اس نے گرجا کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ گرجا نے اپنے لانبے لانبے ناخنوں سے اس کی آنکھیں نکالنے کی کوشش کی۔

"کیوں؟" سیا کی آتما نے احتجاج کیا۔ مگر اس کی ایک آنکھ گرجا نکال چکا تھا، جس سے لاپرواسی کی دوسری آنکھ مٹک رہی تھی۔

"تم میرے بچوں کو کیوں چھوڑ آئی؟"

"وہ ہمارے بغیر زیادہ خوش ہیں۔" سیا کی آتما نے کہا۔ "اور مرلی نے آتم ہتیا کر لی ہے۔ وہ چھت پر ہو گا۔"

ساری آتمائیں گرتے پڑتے چھت کی طرف بھاگیں۔ آسمان تاروں سے ڈھکا ہوا تھا جن کی روشنی میں مرلی منڈیر پر جھکا ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے انہیں دیکھ کر اپنی ناک حقارت سے سکوڑ کر شہر کی طرف اشارہ کیا جو روشنی میں نہا رہا تھا۔ "تمہیں اس شہر سے متلی نہیں آتی؟"

"اور تمہیں؟" آتماؤں نے پوچھا۔

"چپ رہو۔" مرلی نے جواب دیا اور جیب سے ماؤتھ آرگن نکال کر بجانے لگا۔ یہ آواز کسی ان دیکھی آتما کی طرح روشن شاہراہوں پر پھیلا کی۔ مگر اپنی روزمرہ کی زندگی میں مصروف لوگوں نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ انہیں اس سے زیادہ ضروری کام تھے۔

فور سیپس

بالی گنج روڈ پر ایک شخص سیاہ کارڈیگن پہنے تنہا کھڑا بس کا انتظار کر رہا ہے۔ تین ماہ قبل اس نے اپنی پرانی تین منزلہ عمارت سے کود کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اور نیچے سڑک پر معلق بجلی کے تار کے سبب ناکام رہا تھا جس نے اسے نیچے فٹ پاتھ سے بارہ فیٹ اوپر روک لیا تھا۔ تار سے نیچے گر کر اس کا ایک ہاتھ اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ سرکاری اسپتال میں دو ماہ زیر علاج رہا۔ مگر اس حادثے کے بعد ایک عجیب واقعہ یہ ہوا ہے کہ وہ جس ذہنی تناؤ سے گزر رہا تھا اچانک وہ ختم ہو گیا ہے۔

سندیپن۔۔۔ہاں، آپ مجھے سندیپن کولے کے نام سے بلا سکتے ہیں، سندیپن کولے، اور یہاں سے میں اپنی کہانی خود سنانا چاہتا ہوں۔ یہ صدیق عالم، یہ ایک انتہائی بکواس قسم کا کہانی کار ہے، وہ سچ کو بھی کہانی بنا دیتا ہے اور کہانی کو سچ، جو اور بھی زیادہ برا ہے۔ وہ ہمارے ہی محلے میں ایک دوسری پرانی عمارت میں رہتا ہے جس کی سیڑھیاں ہمیشہ اندھیرے میں ڈوبی رہتی ہیں۔ وہ رات کے آخری پہر تک جاگتا ہے اور دن سے اسے نفرت ہے۔ وہ مذہب کو قدیم قبائلی جنگ کی صورت میں دیکھتا ہے جس کے خدوخال اکیسویں صدی میں زیادہ واضح ہوتے جا رہے ہیں، قومیت کے تصور کو ایک غیر فطری جوہر سے عبارت کرتا ہے، ہندوستان کی آزادی کو ایک مِتھ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا، وہ مغربی کلاسیکی موسیقی کا دیوانہ ہے، ہمیشہ تنہا رہنا چاہتا ہے مگر ایک شہر خبرا کی طرح شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہتا ہے، وہ لفظوں میں یقین نہیں رکھتا، انھیں انسان کی ملمع کاری سمجھتا ہے، ادبی محفلوں سے گھبراتا ہے اور اس کی نظر میں انسان خدا کا لکھا ہوا سب سے بے تکا ڈراما ہے جس کے سارے کردار یا تو بری طرح کنفیوزڈ ہیں یا ایک احمقانہ یقین سے سرشار ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، اس کے لیے کچھ بھی مقدس نہیں ہے۔ ایسے انسان کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ جانے وہ مدیر کیسے ہوں گے جو اس کی کہانیاں شائع کرتے ہیں اور وہ قاری، میں انھیں سمجھنے سے قاصر ہوں، جو اس کی کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ شاید اس کرۂ ارض پر، اس خدا کی بنائی ہوئی زمین پر، اس خاک آباد پر انسان کی آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ آپ کو ہر طرح کے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نظر آئے گی۔ ہر طرح کے لوگ، ہر طرح کے خیالات، ہر طرح کا عقیدہ، ہر طرح کا نظریہ، اب اس سیّارے پر سب کچھ ممکن ہے۔ یہاں تک کہ ایسے لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد آپ کو مل جائے گی جنھوں نے اپنی ماں کی کوکھ سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا تھا اور انھیں چمٹے سے پکڑ کر باہر لانا پڑا۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میرے کان کے دونوں پردوں اور ہڈیوں پر اب بھی ان چمٹوں کا درد گاہے بگاہے جاگتا ہے۔ یہی نہیں، میں اپنا دایاں ہاتھ تیس ڈگری سے اوپر لے جانے سے بھی معذور ہوں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ میرے سر کا درد بالکل نفسیاتی ہے اور میں چاہوں تو اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا ہوں گرچہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ اس جبری پیدائش کے سبب ہی میں اپنا دایاں ہاتھ اٹھا نہیں پاتا۔ اس تیس ڈگری کے بعد کا سارا کام میرا بایاں ہاتھ کرتا ہے ۱۵۱ میرا پیارا، اکلوتا بایاں ہاتھ۔ میں نے اپنے سر کے درد کو سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے، اپنے کالج کے ان ساتھیوں سے بھی مشورہ لیا ہے جو اب سرکاری اسپتال کے گندے گلیاروں میں بھٹکتے رہتے ہیں یا پرائیوٹ نرسنگ ہوم کی صاف ستھری راہداریوں میں اسٹیتھسکوپ اٹھائے گھومتے ہیں۔ میں نے نیشنل لائبریری میں بیٹھ کر کافی میڈیکل جرنل چھانے ہیں، سائبر کیفے میں بیٹھ کر دنیا بھر کی میڈیکل ویب سائٹس کو لاگ آن بھی کیا ہے۔

"ڈاکٹر، کہیں یہ میرے بھیجے میں Serotonin کی کمی کے سبب تو نہیں؟" میں نے اپنے آخری ڈاکٹر سے کہا تھا۔ "ہو سکتا ہے میں اس کے سبب ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہوں جو درد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔"

"جہاں دھوپ میں کمی ہوتی ہے وہاں یہ کیمیائی اجزا بن نہیں پاتے، مثلاً لنڈن، امسٹرڈم یا سان فرانسسکو،" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا تھا۔ "مگر کلکتہ کا آسمان تو بالکل روشن ہے، بلکہ مجھے کہنے دیں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی روشن ہے۔"

میں نے ایک بار اس ڈاکٹر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جس نے یہ گھناؤنا کام کیا۔ کسی نے مجھے اس کا پتا نہیں بتایا تھا مگر مجھے اس گندے سے نرسنگ ہوم کا علم تھا جہاں میں پیدا ہوا۔

اس نرسنگ ہوم میں صرف ایک ڈاکٹر بیٹھتی تھی اور اس میں صرف زچگی کے لیے ہی لوگ جاتے۔ مگر یہ سارا کام یہاں کی آیائیں انجام دیتیں جن کے چہرے ہر طرح کے جذبات سے عاری تھے۔ کلکتہ کے نچلے اور متوسط درجے کے تمام نرسنگ ہوم کی طرح اس نرسنگ ہوم میں بھی کوئی سندیافتہ نرس نہیں تھی، یہی آیائیں تھیں جو یونیفارم اور کیپ پہنے گھوما کرتیں۔ اس ڈاکٹر کے بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے اور سیندوری لکیر کی دونوں جانب اس کے سر کے گنجے پن کو پتلے پتلے گھنگریالے بالوں کے اندر صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ جب میں نے اسے وہ تاریخ بتائی جب میں پیدا ہوا تو اس نے غیر یقینی کی حالت میں سر ہلایا۔

"اتنے پرانے رجسٹر تو اب کارپوریشن کے آفس میں ہی ملیں گے۔"

"آپ کو پورا یقین ہے وہ آپ نہیں تھیں؟"

"میں دو سال پہلے سرکاری اسپتال سے ریٹائر ہو کر اس میٹرنٹی ہوم میں آر ایم او کے طور پر آئی ہوں،" اس نے کہا۔

"ویسے آپ اگر جھوٹ کہہ رہی ہیں تو اس کا آپ کو حق ہے،" میں کہتا ہوں۔ "کیا میں وہ چمٹا دیکھ سکتا ہوں جس کے ذریعے آپ لوگوں کو دنیا میں لاتی ہیں؟"

وہ تذبذب میں مبتلا ہے۔

"شاید آپ کا مطلب ڈیلیوری فورسیپس سے ہے جو عملِ جراحی میں استعمال ہوتا ہے، خاص طور پر زچگی کے وقت۔"

"ہاں، ظاہر ہے میں کسی گھڑی ساز کی دکان پر تو ہوں نہیں۔ لیکن وہ ہے تو چمٹا ہی نا؟"

"شاید!" وہ ایک آیا کو بلاتی ہے جو بالکل پتلی دبلی بلکہ ہڈی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر کی بات سن کر اس نے غصے اور بیزاری سے میری طرف دیکھا ہے۔ وہ چمٹا لے آتی ہے جسے میں میز سے اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہوں۔ اس کے ٹھنڈے لوہے کو چھوتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس چمٹے کے مقابلے میں اپنا سر کافی بڑا نظر آتا ہے۔

"بچوں کے سر پیدا ہوتے وقت اتنے بڑے نہیں ہوتے،" مجھے چمٹے کو اپنے سر پر آزماتے دیکھ کر آیا ٹوکتی ہے۔ میں اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

"میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟" میں ڈاکٹر سے پوچھتا ہوں۔

"نہیں، یہ میٹرنٹی ہوم کی پراپرٹی ہے۔" شاید اس کے بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ وہ چمٹا واپس لے کر آیا کے حوالے کرتی ہے۔ "ویسے اگر آپ کو یہ فورسیپس چاہیے تو کالج اسٹریٹ میں کلکتہ میڈیکل کالج کے باہر کسی بھی میڈیکل ایکوئپمنٹ کی دکان پر مل جائے گا۔"

"دیکھا جائے گا،" میں کہتا ہوں۔ "میں ایک بار کسی بچے کو اس کے سہارے پیدا ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرا فون نمبر نوٹ کریں گی؟"

"میرا خیال ہے یہ غیر ضروری ہے،" ڈاکٹر نفی میں اپنا سر ہلاتی ہے، "مگر میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

"کیونکہ میں اس بچے کا ردعمل دیکھنا چاہتا ہوں جو اپنی مرضی کے خلاف اس دنیا میں لایا جا رہا ہو۔"

"کیا اس بچے کو جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا اس کی مرضی کا پتا ہوتا ہے؟" وہ ایک آہ بھر کر شاید خود سے کہتی ہے۔ پھر میری طرف تاکتی ہے۔ "صرف ایک صورت ہے اگر کوئی عورت اور اس کا شوہر اس کی تحریری منظوری دے۔ مگر یہ بھی میرے خیال میں ممکن نہیں۔ ہمیں بالکل ہی آخری وقت میں یہ پتا چلتا ہے کہ یہ کیس نارمل ڈلیوری کا ہے، قیصری ہے یا جیسا کہ آپ کہتے ہیں، چمٹے کا۔"

"اور یہ فیصلہ ہمیشہ کافی جلدی میں کیا جاتا ہو گا۔" میں مسکراتا ہوں۔ "کبھی جلد بازی میں، کبھی موٹی فیس کے لیے اور کبھی کنفیوزن کا شکار ہو کر، اور اس پورے عرصے میں وہ بچہ آخری شے ہوتا ہو گا جس کی رائے کے بارے میں سوچا جائے۔"

"میرا خیال ہے ہم نے آپ کو کافی وقت دے دیا ہے۔ ایکسکیوزمی، مجھے لیبر روم کی طرف جانا ہے۔"

وہ گھنٹی بجاتی ہے اور میں نرسنگ ہوم کے پھاٹک سے باہر کا راستہ لیتا ہوں جہاں آسمان سفید ہے، سورج سوا نیزے پر ہے (آپ دیکھ رہے ہیں، صدیق عالم، وہ احمق کہانی کار، وقت کو کبھی اتنے اچھے ڈھنگ سے بیان نہ کر پاتا) اور ایک بس کی کھڑکی سے ایک عورت سر نکال کر صبح کا کھایا ہوا سارا کھانا ثابت و سالم قے کر رہی ہے۔ مجھے سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہے اور میں سوچتا ہوں ایک دن میں اس گتھی کو سلجھا کر ہی رہوں گا کہ کیوں لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف پیدا ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے، اور جو کچھ ہوتا ہے اسے کہیں زیادہ انسانیت کے ساتھ، زیادہ جمہوری طریقے پر کیوں نہیں انجام دیا جاتا؟ کیا میڈیکل سائنس میں انسان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں؟

آہ، دیکھیے، میرا سر اس جگہ پھر سے دکھنے لگا ہے جہاں مجھے اس دنیا میں لاتے وقت چمٹے کا استعمال کیا گیا ہو گا۔ میرا جی چاہتا ہے میں اسے کسی دیوار پر دے ماروں۔

کارڈیگن کے اندر اسے پسینہ آ رہا ہے، مگر اسے پتا ہے کلکتہ میں جو چاروں طرف سے آبی گزرگاہوں، ماہی گاہوں اور نمکین دلدلوں سے گھرا ہوا ہے، لوگ ہوا میں مرطوبیت کے سبب ٹھنڈ کو سمجھ نہیں پاتے اور اندر ہی اندر سردی کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ دراصل اسے کہیں نہیں جانا ہے اور اسے کسی خاص بس یا ٹرام کا انتظار بھی نہیں ہے، مگر عین ممکن ہے کہ وہ کسی بھی بس کے اندر بیٹھ کر کہیں بھی چلا جائے، یا تو دریا کی طرف بابو گھاٹ، یا بڑا بازار کی بھیڑ بھاڑ میں ستیہ نارائن پارک یا سیالدہ اسٹیشن جو ہر دس منٹ پر چھوٹنے والی لوکل ٹرین کے ذریعے اس عروس البلاد کو بنگال کی کھاڑی میں بکھرے ہوئے دور دراز کے گاؤں دیہات سے جوڑتا ہے۔ یا پھر ممکن ہے وہ اگلے ہی بس اسٹاپ پر بس سے اتر کر اپنا گھر لوٹ آئے جہاں اس کی بیوی اس کے لیے سویٹر بن رہی ہے جسے تیار ہوتے ہوتے جاڑا ختم ہو چکا ہو گا، اور اس کا بوڑھا پنشن یافتہ باپ جو پرانا شرابی ہے، بنگلہ کا اخبار دیکھ رہا ہے اور بالکنی سے باہر نظریں دوڑا رہا ہے جہاں دوسرے مکان کی چھتوں کے اوپر چیل اور کوے اڑ رہے ہیں۔ ایک بلّا بوڑھے کے سائے میں بیٹھا اس کے تھوکے ہوئے مچھلی کے سر کی ہڈیوں اور کانٹوں کو کھا کر اپنی مونچھیں پنجوں سے صاف کر رہا ہے۔

''میں کھانا لگادوں۔'' اس کی بیوی اسے دیکھ کر آدھا بُنا ہوا سویٹر اور کروشیئے رکھ دیتی ہے۔

''کھانے میں کیا ہے؟''

''بھات، مچھلی، دال، چٹنی، کریلے۔''

''کریلے مجھے پسند ہیں۔'' وہ سر ہلاتا ہے۔

بوڑھا اخبار سے سر اٹھا کر اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ ان دونوں کے لیے اسے ایک لمبے عرصے تک جینا ہوگا۔ عمارت سے کرایہ برائے نام آتا ہے اور اب اس کی پنشن ہی ان دونوں کی زندگی کا آخری سہارا ہے۔ وہ آہ بھرتا ہے۔ شراب کی قیمت دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ سرکار محصول پر محصول لگاتی جارہی ہے۔ اس ملک میں ہمیشہ دقیانوسی خیالات کے لوگوں کی حکمرانی رہے گی جو محصول کے ذریعے لوگوں کو سدھارنے کے مہم میں لگے رہیں گے۔ ان سے زیادہ روشن خیال تو اس کی بہو ہے جو ہر رات شراب نوشی کے لیے آلو یا مچھلی کے قتلے یا بیسن کے پکوڑے تل کر اس کے سامنے طشتری پر رکھ دیا کرتی ہے۔ یہ مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے گھرانوں کی لڑکیاں کھانا پکانے میں ماہر ہوتی ہیں۔ وہ مچھلی کے فلس اور ہڈیوں نیز معمولی سے معمولی ساگ سبزیوں کے ڈنٹھلوں اور پتوں سے جنھیں اس ملک کی عورتیں عام طور پر پھینک دیا کرتی ہیں، لذیذ سے لذیذ کھانا بنالیتی ہیں۔ بہو کے لیے اسے سندر بن جانا پڑا تھا جہاں مرد لکڑی اور شہد کی تلاش میں شیر، سانپ یا گھڑیال کا شکار ہو جایا کرتے ہیں اور عورتوں کے بیوہ بننے کی ایک پرانی روایت چلی آرہی ہے۔ کہیں اس کے اندر یہ خوف قائم تھا کہ اس کا لڑکا زیادہ دن زندہ رہنے والا نہیں۔ گوساہ کے جزیرے سے سیتا جب بھٹ بھٹی پر، جو ایک گہرے نیلے آسمان کے نیچے گاڑھا سرخی مائل دھواں اڑاتی چلی جارہی تھی، تین گھنٹے کے آبی سفر اور پھر ایک ڈھڈر سرکاری بس میں تین گھنٹے کے خشکی سفر کے بعد لائی گئی تو اسے کلکتہ پسند نہیں آیا۔ وہ اتنی بھیڑ بھاڑ کی عادی نہیں تھی۔ اس نے گوساہ میں لوگوں کو ہر طرف اتنی شتابی سے بھاگتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا جیسے گھڑی کے کانٹے شہر کی سڑکوں پر گھومتے پہیوں کو دیکھ کر اچانک تیز ہو گئے ہوں۔ اس پر اس کے شوہر نے پھول سنچارات میں ہی اسے بتادیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا جسمانی تعلق قائم کرنے سے معذور ہے، کہ وہ بچے کے سلسلے میں اس کی مرضی جانے بغیر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ گاؤں کے اسکول میں آٹھ کلاس تک پڑھی سیتا الگ سونے کی عادی ہو چکی تھی۔ مگر اس کا دل کہتا ایک دن سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یا پھر وہ گوساہ لوٹ جائے گی، جو اتنا برا نہیں۔

''شٹ اپ!''

آخری آواز میری تھی۔ آپ نے دیکھا، یہ صدیق عالم کس درجے کا قلم کار ہے! وہ آپ کی خواب گاہ کے اندر تک داخل ہونے سے نہیں چوکتا۔ اس کا قلم کب فحش نگاری پر اتر آئے خود اسے نہیں معلوم۔ اس کے بارے میں مجھے اطلاع ملی ہے وہ شہر کے ہر حصے میں، ہر عمارت میں، ہر جھوپڑپٹی میں، یہاں تک کہ طوائف کے محلوں، مسافر خانوں، کیل خانوں، اسپتال کے مردہ گھروں، بلکہ قبرستان اور شمشان گھاٹ تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے پاس لوگوں کی ذاتیات کے اندر جھانکنے کے ہر طرح کے ذرائع، ہر طرح کے آلے موجود ہیں، اور جہاں یہ اینٹھے خان جھانک نہیں پاتا وہ اپنے تصورات کے ذریعے یا لوگوں کی نفسیات کا غلط یا صحیح مطالعہ کر کے ان کا خاکہ کھینچ ڈالتا ہے۔ ایک بار میں نے اسے ایک ٹرام کے اندر ایک تنہا سیٹ پر بیٹھے ایک کتاب پڑھتے پایا۔ اور میرا یقین کریں، اس نے کتاب الٹی تھام رکھی تھی۔ شاید اس طرح وہ بھیڑ سے خود کو مستثنیٰ قرار دینا چاہتا تھا۔ مجھے ایسے لوگ نہیں بھاتے جو بھیڑ سے الگ جیتے ہیں۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں، انھیں جلد سے جلد تختۂ دار تک پہنچانا لازمی ہوتا ہے، یا پھر ان پر نظر رکھنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے لوگوں نے ہمیشہ نئی طرح کی مصیبتیں کھڑی کی ہیں، نئے نئے فرقے قائم کیے ہیں، انھیں ہر طرح کی چیزوں کو توڑنے کا جنون ہوتا ہے، ایک بچے کی طرح، یا ایک پاگل کی طرح یا ایک پیغمبر کی طرح جو پرانے عقائد کو توڑ کر ان کے ملبوں سے نئی عمارتیں تعمیر کرتا ہے۔

''ٹکٹ!'' کنڈکٹر کی آواز پر میں سر اٹھا کر دیکھتا ہوں۔

''میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں،'' میں کہتا ہوں۔

''تو ٹرام سے اتر جایئے،'' کنڈکٹر میرے ہی لہجے کی نقل کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر ایک دھندلی عینک پڑی ہے جو غلیظ ہو رہی ہے اور اس کی انگلیاں لانبی ہیں جن سے وہ ٹرام کے دروازے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جہاں مسافر بھاری تعداد میں لٹکے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر وقت اسے مسافروں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس ٹرام سے مسافروں کی ایک بڑی تعداد کرایہ ادا کیے بغیر اتر جاتی ہے یا انھیں اترنا پڑتا ہے کیونکہ بھیڑ میں انھیں کنڈکٹر تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

''میں ٹکٹ کے پیسے دیتا ہوں،'' مجھے صدیق عالم کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ دس روپے کا ایک نیا نوٹ نکال کر کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیتا ہے۔

''کہاں جانا ہے؟'' کنڈکٹر نوٹ لے کر مجھ سے پوچھتا ہے۔ مگر میرے بتانے سے پہلے ہی صدیق عالم کہہ اٹھتا ہے، ''کالج اسٹریٹ!''

وہ باقی کے پیسے لے کر ٹکٹ میری طرف بڑھا دیتا ہے اور کنڈکٹر کے آگے بڑھ جانے کے بعد اپنی کتاب کے درمیان انگلی دبا کر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''تمھیں نہیں لگتا میں بھی اس کرۂ ارض پر آباد ہوں اور تمھارے آس پاس ہی جی رہا ہوں؟''

آہ، تو اسے میرے خیالات کی آہٹ مل چکی ہے۔ شاید ان سے اسے سخت چوٹ پہنچی ہے۔ مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ اس شخص کا ردعمل تو ایک عام انسان سے بھی گیا گزرا ہے۔

''بھلے آدمی۔۔۔'' میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں۔ ''میں تمھاری کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ انھیں پڑھ کر کسی کا بھی بھلا نہیں ہو سکتا۔ شاید اب اس دنیا کو تم جیسے قلم کاروں کی ضرورت نہیں۔ تم سے زیادہ بہتر تو وہ لوگ ہیں جو چوراہوں پر بھیڑ لگا کر نقلی دوائیاں بیچتے ہیں، اس سے کم از کم کچھ لوگ تو زندگی کے بوجھ سے نجات پاتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں میں ایک اوسط درجے کی صلاحیت کا مالک ہوں۔ شاید میرے اندر وہ مہارت نہیں کہ لوگوں کی بھیڑ جما سکوں،'' وہ کہتا ہے۔ ''یہ لوگ جن کا تم ذکر کر رہے ہو، ایک ایک بار میں سو سے زیادہ لوگوں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتے ہیں اور اپنی فصاحت کے بل پر ان میں سے پچیس فیصد لوگوں کو اپنی دوائیں بیچ ڈالتے ہیں۔ جبکہ میرے جیسا قلم کار تو اپنی تین سو کاپیاں چھپوا کر ساری عمر اس کی دو سو کاپیاں تک بیچ نہیں پاتا۔''

''اس دنیا میں صرف وہی چیزیں بکتی ہیں جو لوگوں کا اچھا یا برا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں،'' میں کہتا ہوں۔ ''میرے عظیم قلمکار، تم تو کسی بھی لائق نہیں۔ اب اس سماج میں تمھاری حیثیت ایک appendix کی طرح ہے۔ اس کا ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔''

مجھے پتا ہے میں نے اسے شدید چوٹ پہنچائی ہے۔ میں اس کا ازالہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ وہ اپنی کتاب کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور چلتی ٹرام سے نیچے اتر جاتا ہے۔ اس عمر میں بھی اس کی پھرتی حیرت انگیز ہے۔ ہو سکتا ہے اور بھی لاکھوں احمقوں کی طرح اسے بھی لمبی عمر جینے کا جنون ہو۔ میرا خیال ہے یہ سماج کے لیے ایک بری خبر ہے۔

کالج اسٹریٹ میں کلکتہ یونیورسٹی کے پھاٹک کے باہر کافی بھیڑ ہے۔ پرانی کتاب کی دکانوں پر معمول کے مطابق دکاندار گاہکوں کو روک رہے ہیں، ان کی تھیلیاں کھینچ رہے ہیں۔

''وکٹر ہیوگو!'' ایک دکاندار میرا کندھا تھام کر کہتا ہے۔ ''وکٹر ہیوگو، صرف پانچ روپے میں۔''

''وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں؟'' میں حیرانی سے کہتا ہوں۔ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے جو اپنے پرانی کتابوں کے کھوکھے کے باہر اپنے سر کے استخوانوں پر مفلر لپیٹے کھڑا ہے۔ میں اس کی بڑھائی ہوئی کتاب کو کھول کر دیکھتا ہوں۔ کیڑوں نے اس کے اندر آر پار سرنگ بنا ڈالے ہیں۔ ''Notre-Dame de Paris'' کتاب کہتی ہے۔ اس کتاب کی جلد کبھی کافی خوبصورت رہی ہوگی، مگر اب بے رنگ اور داغدار ہو چکی ہے۔ اس کے صفحے پاپڑ کی طرح پیلے ہو رہے ہیں اور موڑنے پر ٹوٹ سکتے ہیں۔ شاید غلامی کے دنوں میں یہ انگلینڈ سے سمندر کا سفر طے کر کے ہندوستان آئی ہوگی۔ وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں! مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب پانچ ستارہ ہوٹلوں میں بیس بیس ہزار کے ڈنر کے اشتہار دیے جا رہے ہوں، جب ملٹی پلیکس میں لوگ دو دو سو روپے کے ٹکٹ کے لیے فلموں کے لیے لائن لگاتے ہوں، جب فلم اسٹار اور کرکٹ کے کھلاڑی ایک ایک اشتہار کے لیے کروڑوں روپے لیتے ہوں، وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں، اور اس کے لیے بھی لوگوں کو کندھے سے پکڑ کر روکنا پڑے۔ آہ، میں وکٹر ہیوگو کے ساتھ یہ بے انصافی نہیں کر سکتا۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ مجھے اس دکان کی تلاش ہے جہاں وہ فور سیپس مل سکے جس کی مدد سے لوگوں کو کھینچ کر اس دنیا میں لایا جاتا ہے۔ کلکتہ میڈیکل کالج کے باہر مجھے اس طرح کی کچھ دکانیں نظر آتی ہیں۔ میں ٹرام کی پٹری کے بیچوں بیچ کھڑا آسمان پر نظر ڈالتا ہوں، آسمان جو ہمیشہ کی طرح بے رنگ مگر پراسرار ہے۔ آخر کار انسان کو اس کی منزل مل ہی جاتی ہے۔

وینس سرجیکل ہوم!

میں اندر داخل ہوتا ہوں۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا آدمی سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لے رہا ہے۔

''آپ ڈاکٹر ہیں؟'' وہ پوچھتا ہے۔

''نہیں،'' میں کہتا ہوں۔ 'مگر مجھے ایک فور سیپس کی ضرورت ہے۔ کیا اس کے لیے ڈاکٹر ہونا ضروری ہے؟''

''ارے نہیں۔ یہ تو ہم نے آپ سے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔''

اس دکان کی الماریوں میں نقلی ٹانگیں اور ہاتھ رکھے ہیں۔ پیشاب اور دست کے مرتبان اور ہاتھ پاؤں سے معذور لوگوں کے لیے اسٹول اور کرسیاں فرش پر اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ ہر طرح کے آلات، ربر، پلاسٹک اور گلاس فائبر کے ساز و سامان شوکیسوں کے اندر ترتیب اور بے ترتیبی سے سجے ہوے ہیں، دیواروں سے لٹک رہے ہیں۔ مجھے ایک آلہ خاص طور پر متاثر کرتا ہے جو کافی دھار والا اور قدرے مڑا ہوا ہے۔ شاید اس سے ہڈیاں کاٹی جاتی ہوں۔ اسے تو کسی بوچڑ کی دکان پر ہونا چاہیے تھا۔

قیمت بتا کر فور سیپس میرے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا گیا ہے مگر سیلز مین کی آنکھوں میں تذبذب ہے۔ خاموشی کے ساتھ وہ میرے چہرے کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ دکان کا بوڑھا مالک صاف شفاف دھوتی کرتا پہنے کیش کاؤنٹر پر بیٹھا ہے۔ اس نے چہرہ دوسری طرف موڑ رکھا ہے۔

"واقعی۔۔۔" میں آلہ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ "واقعی اس کی شکل جتنی پیچیدہ، جتنی بھیانک ہے، اس کا اسٹیل اتنی ہی بے رحمی سے چمک رہا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے یہ سچ مچ ایک گھناؤنا کام کرنے کے قابل ہے۔"

"گھناؤنا کام؟" سیلز مین کا ردعمل فطری ہے۔ دکان کا مالک میری طرف تاکتا ہے۔

"کیا میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں،" میں چمٹے کے پیچ کو ڈھیلا کرتے ہوے، پھر کستے ہوے کہتا ہوں، جیسے اس کے لوہے کے حلقوں کو کسی بچے کے فرضی سر کے موافق بنانا چاہتا ہوں۔

"کیوں نہیں،" سیلز مین کہتا ہے۔ "چھ سو روپے۔"

میں پلٹ کر دکان کے اندر اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں۔ وہاں میں تنہا گاہک ہوں۔ میں دکان کے باہر تاکتا ہوں جہاں ٹرام کی روشن پٹریوں کے اوپر ایک لاغر رکشا والا اپنے رکشا پر ایک بھاری بھرکم عورت کو لادے تیزی سے گزر رہا ہے۔ مجھے صدیق عالم کہیں نظر نہیں آتا۔ میں نے کیا کہا تھا، وہ ایک انتہائی چالاک قسم کا انسان ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں۔ ٹرام کے اندر ٹکٹ کے پیسے تو کوئی بھی ادا کر سکتا ہے۔ مگر جب آپ کی ضرورت واقعی اہم ہو، جب سچ مچ اس کی آپ کو ضرورت ہو، یہ صدیق عالم دور دور تک دکھائی نہیں دے گا۔ یہی اس کا کردار ہے۔

"شاید اگلی بار میں اسے خرید لوں۔" میں فور سیپس کاؤنٹر پر واپس رکھ دیتا ہوں۔

بوڑھا اپنی پرانی عمارت کے نیچے کھڑا سڑک پر لڑکوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھ رہا ہے۔ پندرہ برس پہلے جب وہ رائٹر زبلڈنگ سے ریٹائر ہوا تھا تب اس سڑک پر کلکتہ امپرووومنٹ ٹرسٹ کی جانب سے پودے لگائے جا رہے تھے جو اَب تناور درختوں میں بدل گئے ہیں اور اپنے پتے پھول اور پھل نیچے پھینکنے لگے ہیں۔ وہ جب ان لڑکوں کی عمر کا تھا تو یہ سڑک ایک پگڈنڈی کی شکل میں ایک تالاب کے کنارے واقع تھی جو سنگھاڑوں کی بیلوں سے نصف ڈھکا ہوا تھا اور جس کی جھاڑیوں میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جنگلی مرغ اور گلہریاں پکڑا کرتا تھا، مار آبی مارا کرتا تھا۔ تالاب اب اپنے سنگھاڑوں اور جھاڑیوں کے ساتھ غائب ہو چکا ہے اور اس کی جگہ خوبصورت دیدہ زیب کثیر المنازل عمارتوں نے لے لی ہے اور وہ پگڈنڈی اب ایک کشادہ صاف ستھری سڑک میں بدل چکی ہے۔ کل ملا کر اب یہ شہر کا ایک بہت ہی متمول رہائشی علاقہ ہو گیا ہے جس میں سب سے پرانی عمارت اسی بوڑھے کی ہے جس میں آزادی کی افراتفری کے دوران مغربی پاکستان سے آ کر بسے ہوے پنجابی اور سندھی اب بھی پچاس یا سو روپے ماہانہ کرایہ دیتے ہیں، کلب جاتے ہیں اور تین تین لاکھ کی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ اس عمارت کا مالک ہوتے ہوے بھی اب اس علاقے میں وہی سب سے غریب آدمی ہے۔ شہر میں ٹھنڈک کافی کم ہو گئی ہے۔ سامنے بادام کے پیڑ کے پتے سرخ ہو کر مرجھانے اور زمین پر گرنے لگے ہیں۔ دور دور کی گلیوں سے بچے پتھر اکٹھا کر کے اس پیڑ کے نیچے بادام توڑنے آیا کرتے ہیں۔ لوگ اپنی کھڑکیوں سے حقارت کے ساتھ ان غلیظ بچوں کو گھورتے ہیں اور ان کے پتھروں سے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ بوڑھا سر اٹھا کر بجلی کے تار کو دیکھتا ہے جو خودکشی کے واقعے کے بعد دو ہفتے قبل تک زمین سے پانچ فیٹ کی بلندی پر جھول رہا تھا مگر اب پھر سے اسے برابر کر دیا گیا ہے۔ بہت اوپر بالکنی پر اس کی بہو نہا کر کپڑے پسار رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنا لڑکا آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے کشمشی رنگ کی ایک منکی کیپ پہن رکھی ہے اور پان چبا رہا ہے۔ بوڑھے کو حیرت ہوتی ہے۔ وہ پان تو کھایا نہیں کرتا۔ اور پھر آج تو اتنی سردی بھی نہیں، پھر یہ منکی کیپ کیوں؟

"ایک ہی سڑک پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام! واقعی میں نے تو کبھی اس پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔" اس کا لڑکا برقی تار والے کھمبے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس کی عمارت کے عین نیچے ایک بلب کے ساتھ کھڑا ہے اور پھر سڑک پار اس اونچے کھمبے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا اوپر کا سرا عمودی ہو کر ایک بڑے سے سوڈیم ویپر لیمپ کو تھامے ہوے ہے۔ اس بڑے کھمبے کا تعلق زمین دوز تاروں سے ہے اور یہ کھمبے پچھلے ہی سال اس سڑک کی دوسری جانب کھڑے کیے گئے ہیں۔ شاید انھیں لگانے کے بعد یہ تار والے کھمبے بھلا دیے گئے ہیں۔ "ہمیں سرکار کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہیے۔"

بوڑھا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اسے معلوم ہے اس کا لڑکا اپنے کالج کے دنوں سے (جہاں علم ریاضی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا) کچھ زیادہ ذہنی عدم توازن کا شکار ہے۔ (اس نے بی ایس سی کے آخری سال میں اچانک کالج جانا بند کر دیا تھا۔) سائنس کا طالب علم ہوتے ہوے بھی نئی نئی زبانوں کو سیکھنے کے سلسلے میں اس کی صلاحیت حیرت انگیز

تھی۔ اپنے کتاب بینی کے جنون کی حد تک شوق کے سبب وہ نہ صرف ان ساری زبانوں کو لکھ اور پڑھ سکتا تھا جو کلکتہ کی سڑکوں پر بولی جاتی تھیں بلکہ اس نے کسی کی رہنمائی کے بغیر فرانسیسی اور جرمن میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ کبھی اس کا زیادہ وقت کلکتہ کی مختلف لائبریریوں میں گزرتا تھا مگر گذشتہ ایک سال سے اس نے کتابوں سے پوری طرح کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ بوڑھے کو پتا ہے خاموشی ہر وقت اس کے ساتھ پیش آنے کا صحیح طریقہ نہیں، مگر اسے اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ لڑکا پان چباتا ہوا قدیم زمانے کی نشیبی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے تیسری منزل پر (جو اس عمارت کی آخری منزل بھی ہے) اپنے فلیٹ پر پہنچتا ہے جہاں بالکنی میں اس کی بیوی پچی کاری کے فرش پر کھڑی اپنے گیلے بالوں کو دھوپ میں سکھا رہی ہے اور پلاسٹک کی کنگھی سے ان کی لٹوں کو درست کر رہی ہے۔ یہ بالکنی موجودہ زمانے کی بالکنیوں کے تناسب سے کافی بڑی ہے اور اسے بالکنی سے زیادہ بند ٹیرس کہا جاسکتا ہے۔

"کیا بات ہے، تم ہمیشہ اپنے بالوں پر کنگھی کرتی رہتی ہو؟" وہ کہتا ہے، پھر اس کے بالوں کو اٹھا کر دیکھتا ہے جو اس کے کنوارے سڈول کولھوں تک لٹک رہے ہیں۔ ان سے ایک عجیب سی تیز خوشبو آرہی ہے جیسے اس کا تعلق بدلتے موسم سے ہو۔ "ویسے تمھارے بال کافی خوبصورت ہیں، ڈیلا کے بالوں کی طرح۔"

"میری اور بھی چیزیں خوبصورت ہیں،" وہ مسکرا کر کہتی ہے۔ "اور یہ ڈیلا کون ہے؟"

"جانے دو اسے۔" وہ منکی کیپ سر سے اتار کر کونے کی میز پر پھینکتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے اس کے سر پر پسینہ جم رہا ہے۔ "وہ ایک کہانی کی فرضی کردار ہے جو ہماری ہی طرح غریب ہے اور اپنے شوہر کو تحفہ دینے کے لیے اپنے بال بیچ ڈالتی ہے۔"

"تحفہ۔۔۔" اس کی بیوی کو کچھ یاد آجاتا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے اندر سے ایک سربہ مہر خاکی نیلا لفافہ نکال کر لاتی ہے جو کافی بڑا ہے اور ایک حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا ہے۔ لفافہ کافی وزنی بھی ہے۔

"اسے کوئی تمھارے لیے چھوڑ گیا ہے۔"

لفافے کا منھ سیلوٹیپ سے بند ہے جسے قینچی سے کاٹنے پر اندر سے وہی فور سیپس نکل آتا ہے جسے اس نے دو روز قبل کالج اسٹریٹ پر وینس سرجیکل ایمپوریم میں دیکھا تھا۔ اس کے ہینڈل سے ایک کارڈ نائلن کے تاگے کے ذریعے منسلک ہے جس پر مارکر پین سے لکھا ہے "To whom it may concern"

آگے کچھ لکھا ہوا نہیں ہے، نہ کارڈ پر کسی کا نام ہے۔

"تم نے نام نہیں پوچھا؟"

"وہ بہت جلدی میں تھا۔"

وہ فور سیپس کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔

"کیسا تھا وہ؟"

"اوسط قد کا۔"

"بال؟"

"کالے، چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے، تمھاری طرح۔"

"عینک؟"

"تھی۔"

"مونچھیں؟"

"نہیں تھیں۔۔۔ شاید تھیں۔۔۔ میں نے غور نہیں کیا۔"

"عمر؟"

"تم کیا سمجھتے ہو، ایک جھلک میں اتنا سب کچھ دیکھنا ممکن تھا؟" اس کی بیوی بولتی ہے۔ "اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی، مجھے یہ لفافہ تھمایا اور مجھ سے کہا۔ 'اچانک اس طرح دروازہ کھولنا ٹھیک نہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہنگر فورڈ اسٹریٹ پر ایک فلیٹ کے اندر کچھ غلط لوگ گھس آئے تھے، بلکہ انھوں نے ایک بوڑھی عورت کا خون بھی کر دیا۔'"

آہ، وہ صدیق عالم کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر فور سیپس سے کھیلنے لگتا ہے۔ یہ وہ آرام کرسی ہے جس پر بیٹھ کر اس کے باپ دادا بوڑھے ہوے۔ یہ آرام کرسی اس نے ستیہ جیت رائے کی ہر دوسری فلم میں دیکھی تھی، بلکہ کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا جیسے یہ کرسی ستیہ جیت رائے کی کسی فلم کے سیٹ سے اٹھا کر لائی گئی ہو۔

"یہ چیز میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" اس کی بیوی کنگھی سے بالوں کو نوچ نوچ کر ایک گچھے کی شکل میں جمع کر رہی ہے تاکہ اس پر تھوک سکے۔ بالوں کا تھوکا ہوا گچھا نیچے سڑک پر کھڑے اس کے سسر کے سامنے گرتا ہے مگر اس کی کمزور آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ان کتے کے پلّوں کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے جو اس کی پھٹی ایڑیوں کو سونگھنے کہیں سے آنکلے ہیں۔ تین ماہ قبل ان کی ماں، جو اس عمارت کی بالکنیوں سے پھینکا ہوا پس خوردہ کھانے اپنے نوزائیدہ بچوں کے ساتھ آیا کرتی تھی، اسی سڑک پر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ڈمپر کے نیچے آگئی تھی۔

"تمھیں اس چمٹے کو دیکھ کر حیرانی ہو رہی ہو گی۔" اپنی بائیں ہتھیلی کو اپنے سر کی پشت پر پھیلا کر آرام کرسی پر جھولتے ہوے وہ مسکرا رہا ہے، گاہے بگاہے فور سیپس کو فرش سے اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ "انسان جب کسی چیز کو سمجھ نہیں پاتا تو وہ خود اپنے سوالوں میں گھر جاتا ہے۔ اپنے لیے یہ پنجڑا وہ خود تیار کرتا ہے اور اکثر ساری عمر اس پنجڑے کے اندر ہی جیتا ہے کیونکہ کچھ سوالوں کے جواب کبھی نہیں ملتے۔"

سبیتا اس کی بات سن نہیں رہی ہے۔ وہ بالکنی سے بہت دور گوسابہ میں خلیج بنگال کی کڑی دھوپ میں کھڑی ہے جہاں کھاڑی کا نمکین پانی کنارے کی کیچڑ پر ہلکورے لے رہا ہے، انھیں فلس کی شکل میں کاٹ رہا ہے، ان کے پشتوں کی کنکریٹ کی دیوار اور سیڑھیوں کے زیریں حصوں پر سیپ چپکا رہا ہے۔ وہ ان سرخ پیڑوں کو دیکھ سکتی ہے جن کے آس پاس رائل بنگال ٹائیگر دہاڑتے رہتے ہیں۔ گرچہ وہ بالکل سانولی ہے مگر ایک اچھے ناک نقشوں والی ایک بھرے پرے بدن کی عورت ہے اور اس کے چہرے میں، جیسا کہ مقامی لوگ کہا کرتے ہیں، کافی نمک ہے۔ اس کا غریب باپ سندر بن کے پانی پر جال پھیلایا کرتا ہے، اور پھیلا تا رہے گا جب تک کوئی گھڑیال اسے کھینچ کر پانی کے اندر نہ لے جائے یا کوئی کوبرا نہ ڈس لے۔ اس کی ماں اسے یاد نہیں۔ وہ ریلنگ سے مڑ کر دیکھتی ہے۔ وہ آرام کرسی پر پہلے کی طرح پینگیں لیتے ہوے اسے میٹھی نظروں سے تاک رہا ہے۔

"تم کچھ سوچ رہی تھیں، سبیتا؟"

"کھانا لگا دوں؟"

"تمھیں صرف کھانے کی ہی فکر کیوں رہتی ہے؟"

"اور میرا کام کیا ہے۔" وہ کمرے کے اندر سے ہوتے ہوے باورچی خانے کی طرف چلی جاتی ہے۔ وہ چمٹے کو زمین پر رکھ کر بنگلہ اخبار اٹھا لیتا ہے جو اس کا باپ صبح سے شام تک پڑھتا رہتا ہے۔ اخبار دھوپ میں پڑے پڑے گرم ہو گیا ہے۔ اسے اخبار کے دفتر کا پتا چاہیے جو اسے آخری صفحے کے بالکل نیچے منحنی حرفوں میں لکھا نظر آتا ہے۔ اسے اس اخبار کے مدیر کو ایک خط لکھنا ہے۔ ایک احتجاجی خط، ایک سڑک کے بارے میں جہاں دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے جب کہ کلکتہ میں ایسی سینکڑوں گلیاں ہیں جن کے کھمبوں پر بلب مہینوں تک نہیں جلتے۔

"جنابِ عالی!" وہ ایک پوسٹ کارڈ پر لکھتا ہے۔ "میں بالی گنج سیکنڈ لین کا رہنے والا ہوں۔ یہ ایک صاف ستھری ذیلی سڑک ہے جس پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے۔۔۔"

"رک جاؤ، تم یہ خط نہیں لکھ سکتے۔"

آہ! یہ صدیق عالم، وہ سمجھتا ہے چونکہ وہ قلم کار ہے وہ خط بھی اچھا لکھ سکتا ہے۔ کہانی لکھنا اور بات ہے مگر اخبار کے مدیر کو خط لکھنا، وہ بھی ایک احتجاجی خط جس کا مقصد شہر بلدیہ کے انتظام میں عملاً ایک تبدیلی، ایک بہتری لانا ہے، یہ ایک کہانی کار کے بس کی بات نہیں جس کی دنیا بس تصورات کے فریم میں بند ہوتی ہے۔ میں نے اس کا لکھا ہوا خط چھین لیا ہے، اس کے پرزے پرزے کر دیے ہیں۔ میں نے ایک نیا پوسٹ کارڈ لے کر ایک دوسرا خط لکھا ہے جس کے لیے مجھے سبیتا سے اس کا قلم ادھار مانگنا پڑا ہے۔ یہ اس کی شادی کا تحفہ ہے۔ اس سے وہ گوسابہ اپنا گھر خط لکھا کرتی ہے جس کا جواب اسی ترتیب سے آیا کرتا ہے۔

میں نے خط کو اپنے کمرے کے لیٹر بکس کے اندر ڈال دیا ہے جو ایک پرانے پیڑ کے تنے سے لٹک رہا ہے۔ یہ لیٹر بکس سرخ رنگ کا ہے اور اس پر چڑیوں کی بیٹ کی زیبر الکیریں ہیں۔ اب میں ہر روز بے چینی سے اخبار کے خطوط کے کالم کا مطالعہ کرتا ہوں۔ پندرہ دن گزر گئے ہیں، مگر مجھے وہ خط اخبار میں دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے دو پوسٹ کارڈ اور بھی چھوڑے ہیں اور آخری پوسٹ کارڈ بذاتِ خود بالی گنج پوسٹ آفس میں ڈال آیا ہوں۔ گرچہ بعد کے دونوں خطوط میں زبان تھوڑی سی بدل گئی ہے مگر میرا خیال ہے مضمون کا متن اپنی جگہ قائم ہے۔ میں نے اپنے آخری خط کی کاپی اپنے علاقے کی کاؤنسلر کو بھی دی ہے۔ وہ ایک غیر شادی شدہ عورت ہے، کمیونسٹ پارٹی کی ممبر ہے،

اپنی ذاتی ماروتی وین میں گھوم گھوم کر غریبوں کے مسئلے حل کرتی ہے۔ غریب جنھیں ڈھونڈنے کے لیے آپ کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، وہ ایک بڑی تعداد میں آپ کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں، کوّوں کی طرح، جنھیں جس روشنی میں بھی دیکھو وہ کوّے ہی نظر آتے ہیں۔

"یہ تو اس سڑک کے لیے اچھا ہی ہے نا۔ آپ کو تو ممنون ہونا چاہیے۔" وہ مسکراتی ہے۔

"یقیناً یہ خوشی کی بات ہوتی اگر تمام سڑکوں پر اس طرح کا انتظام ہوتا۔ اور پھر ان جگہوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جہاں سالوں سال روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا؟"

"کیا کلکتہ میں ایسی کوئی سڑک بھی ہے؟ اپنے علاقے میں میں نے تو خود سے ہر جگہ روشنی کا انتظام کیا ہے۔ جانے آپ کس جگہ کی بات کر رہے ہو۔"

وہ واقعی ایک قابل سیاست دان ہے جس کے پاس ہر موقعے کے لیے مناسب جواب موجود ہے۔ وہ وین کا شیشہ ڈھکیل کر بند کرنا چاہتی ہے کہ اس کے بغل میں بیٹھا ہوا آدمی اس کے کان میں کچھ سرگوشی کرتا ہے۔ میں اس آدمی کو پہچانتا ہوں۔ وہ ہمارے علاقے میں بلاوجہ آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اور اسی طرح آوارہ گردی کرتے کرتے ایک دن بڑا لیڈر بن جائے گا۔ کاؤنسلر مسکرا کر میری طرف دیکھتی ہے۔

"پھر بھی میں اس پر غور کروں گی،" وہ کہتی ہے اور گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اب کچھ ہونے والا نہیں، ان غریبوں کی طرح، مگر میں کوشش جاری رکھتا ہوں۔ میں نے اخبار کو ایک اور خط دیا ہے۔ اور تب وہ خط شائع ہو جاتا ہے گرچہ یہ میرا آخری خط نہیں ہے۔ شاید یہ میرا دوسرا خط ہے جسے میں نے پہلے خط کے ایک ہفتے بعد لکھا تھا۔ مجھے خط کے کالم میں اپنا نام دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی، پھر بھی میں اسے سیتا کو دکھاتا ہوں۔ وہ خط کو سانس تھام کر شروع سے آخر تک پڑھ جاتی ہے۔ وہ میرے نام پر اپنی انگلی رکھ کر مسکراتی ہے جیسے اسے محسوس کر رہی ہو۔ اس میں اس کی شادی کی انگوٹھی چمک رہی ہے۔

"مجھے یقین نہیں ہوتا یہ تم نے لکھا ہے،" وہ کہتی ہے۔ "پھر بھی میں خوش ہوں کہ تم نے واقعی یہ خط لکھا ہے۔"

جانے اس کے بولنے کے انداز میں ایسی کیا بات ہے کہ میں اخبار اٹھا کر خط کو پڑھنے لگتا ہوں۔ اوہ، اوہ، واقعی، یہ تو میرا لکھا ہوا خط ہے ہی نہیں۔ یہ تو اسی ملعون قلم کار کا کارنامہ ہے۔ یہ تو وہی تحریر ہے، وہی خط ہے جسے میں نے پرزے پرزے کر دیا تھا۔

"جنابِ عالی! میں بالی گنج سیکنڈ لین کا رہنے والا ہوں۔ یہ ایک صاف ستھری ذیلی سڑک ہے جس پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے۔۔۔"

آپ دیکھ رہے ہیں، وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ یہ صدیق عالم، مجھے اس کے ساتھ ایک آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں اس کی تلاش میں اس کی عمارت تک جاتا ہوں مگر اس کے گھپ تاریک زینے کی پہلی لینڈنگ پر ہر بار مجھے ایک بیمار خارش زدہ کتّا بیٹھا نظر آتا ہے۔ اس کے بدن کی رستی ہوئی خارشوں سے ایک عجیب دم گھونٹ دینے والی بدبو خارج ہوتی رہتی ہے۔ سیڑھی کے اندھیرے میں اس کی چمکتی آنکھوں سے جانے کیوں مجھے لگتا ہے اسے میرا وہاں آنا پسند نہیں اور اگر میں نے اسے پھلانگنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر حملہ بھی کر سکتا ہے۔ گرچہ ہر بار میں وہاں سے لوٹ آتا ہوں مگر اس کتے کے بدن کی بو گھنٹوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ پھر ایک دن میں دیکھتا ہوں، وہ تار اور کھمبے وہاں سے ہٹائے جا رہے ہیں۔ مجھے وہ کاؤنسلر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ صرف صدیق عالم اوور سیئر سے تھوڑی دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بار میرے اندر اس کے پاس جانے کی خواہش جاگتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے مر جاتی ہے۔ جہنم میں جائے وہ، میں سوچتا ہوں۔ وہ ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں اتنی سنجیدگی سے سوچا جائے۔ دنیا میں ہزاروں ایسی چیزیں ہیں جو بالکل ہی غیر اہم ہوتی ہیں مگر ہماری توجہ کے سبب ایک خاص اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

صدیق عالم سڑک سے گزر کر اوور سیئر کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے اور اس سے بات کر رہا ہے۔ اوور سیئر اسے کچھ سمجھا رہا ہے، پھر خود اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ وہ واپس چلا جاتا ہے اور پیڑوں کے نیچے ٹھنڈ کی ماری چڑیوں کی بیٹ سے داغدار فٹ پاتھ پر قدم رکھتا ہوا غائب ہو جاتا ہے۔

وہ لوگ تار اور کھمبے ہٹا کر جا چکے ہیں۔ میں بالکنی کے جنگلے سے جھک کر نیچے دیکھتا ہوں۔ ہماری عمارت کے سامنے سے کھمبا اکھاڑ لیا گیا ہے اور اب اس جگہ زمین اس طرح ادھڑی پڑی ہے جیسے قرونِ وسطیٰ کے کسی جاپانی سامورائی نے ہارا کیری کر کے اپنی انتڑیاں باہر نکال لی ہوں۔ تار اور کھمبے کی عدم موجودگی میں ہماری بالکنی کافی اونچی اور خطرناک نظر آ رہی ہے۔ میں سہم کر پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ وہاں کنویں کے اندر کا سا گہرا اندھیرا ہے۔ مجھے تھوڑی دیر تک اس کنویں میں کچھ دکھائی نہیں دیتا، پھر دھیرے دھیرے ایک چہرہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ صدیق عالم کا چہرہ ہے۔ پھر اس چہرے کے پیچھے کے مناظر ابھرتے ہیں۔ وہ پیڑوں کے نیچے چڑیوں کی بیٹ کے نشانات پر چلتے ہوئے مڑ مڑ کر میری طرف تاک رہا ہے، مسکرا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ایک خاص منصوبے کے تحت یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ میں اسے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔ اس کی کہانی کو اس کے انجام تک اس کی مرضی کے مطابق چلنے نہیں دوں گا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوتا ہوں اور میز کی دراز سے چمٹا باہر نکال کر واپس بالکنی پر نکل آتا ہوں۔ نیچے سڑک اپنے دونوں کنارے دور تک سنسان پڑی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب سڑک زیادہ تر سنسان رہتی ہے۔ میں جنگلے کے اوپر جھک کر چمٹا نیچے پھینک دیتا ہوں۔ چمٹے کے سڑک سے ٹکرانے کی آواز میرے کانوں تک آتی ہے۔ اتنی بلندی سے تارکول کی سڑک پر پڑا ہوا اسٹیل کا چمٹا

عجیب نظر آرہا ہے جیسے وہ کوئی مشینی پرندہ ہو اور ابھی ابھی اپنے پر پھیلا کر اڑ جائے گا۔ ایک دو کار ہارن بجائے بغیر گزر جاتی ہے۔ ایک تنہا راہگیر کہیں سے آنکلتا ہے۔ اس کی نظر چمٹے پر پڑتی ہے۔ اس نے ایک کافی دبیز سفید رنگ کا ریشے دار سویٹر پہن رکھا ہے جس کے سبب وہ انسان کم اور انٹارٹیکا کا ایک جانور زیادہ نظر آرہا ہے۔ وہ فور سیپس کو اٹھا کر اپنے چاروں طرف سوالیہ نظروں سے تاکتا ہے، پھر چہرہ اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھتا ہے۔ میں چہرہ دوسری طرف موڑ لیتا ہوں۔ وہ چمٹا لیے ہوے، الٹ پلٹ کر حیرت سے اس کا معائنہ کرتے ہوے چلا جاتا ہے۔ آہ، مجھے اس شاطر کہانی کار کو حیرت میں ڈالنا ہو گا، اسے اسی کی چال میں مات دینا ہو گی۔ میں اپنے کمرے کے اندر جاتا ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر سیتا ہلکی نیند سو رہی ہے۔ اس کا بھاری سینہ سانس کے زیر و بم کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا ہے۔ میں اس کے داہنے پستان پر ہاتھ رکھ کر سہلانے لگتا ہوں۔ سیتا آنکھیں کھولتی ہے، مسکراتی ہے۔ میں اس کے داہنے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر چومتا ہوں جس میں اس نے شگن کے سنکھ اور لوہے کے کڑے پہن رکھے ہیں۔ وہ اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیتی ہے۔

"تم دروازہ کیوں نہیں بند کر لیتے؟" سیتا شرما کر کہتی ہے۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" میرے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اکٹوپس کی طرح اس کی ناف سے گزر کر نیچے جا رہی ہیں۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ اپنی ٹانگوں کے بیچ گیلی ہو چکی ہے۔

"گھبراؤ مت۔ گھر پر کوئی نہیں، " میں اس کے صحت مند ننگے پستانوں کو چومتے ہوے کہتا ہوں جو بلاؤز کے کٹے ہوے گلے سے ابھرے ہوے ہیں۔

سیتا لیبر روم کی میز پر لیٹی دردِ زہ سے کراہ رہی ہے۔ میں اسے دلاسا دے رہا ہوں جب ڈاکٹر اندر آتا ہے۔ سفید ماسک سے نکلی ہوئی عینک کے شیشوں کے اندر سے اس کی آنکھیں میری طرف نہیں تاکتیں۔ وہ کافی مصروف بھی دکھائی دے رہا ہے۔

"ہمیں مریض کو اوٹی میں لے جانا ہو گا، " وہ میری طرف توجہ دیے بغیر نرس سے مخاطب ہوتا ہے اور اسٹیتھو سکوپ کو لاپروائی سے ہلاتے ہوے اوٹی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اوٹی کے دروازے پر میں اسے جالیتا ہوں۔

"یہ کیس تو نارمل ڈیلیوری کا ہے نا ڈاکٹر، جیسا کہ مجھے شروع سے بتایا گیا تھا؟" میں اس سے کہتا ہوں۔

"بچہ اس دنیا میں آنا نہیں چاہتا، "ڈاکٹر کہتا ہے۔ " اور پھر پیڑو کے مقابلے میں بچے کا سر بہت بڑا ہے۔ ہمیں فور سیپس کا استعمال کرنا ہو گا۔"

"ارے نہیں، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔" میں سہم کر پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میری دونوں کنپٹیوں پر کوئی ٹھنڈی چیز رکھ دی گئی ہو۔ "میرا خیال ہے کہیں پر کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ صبح تک تو سب ٹھیک تھا۔ اچانک یہ سب کچھ کیسے بدل گیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اور کیوں نہیں ہو سکتا؟" وہ تھوڑا پیچھے ہٹ کر اپنے چہرے سے ماسک ہٹاتا ہے۔

"تم!"

"ہاں، میں۔" اس نے ماسک واپس لگا لیا ہے اور اب اس کے اندر سے اس کی آواز آرہی ہے۔ "اور تم سمجھ بیٹھے تھے کہ تم اپنی زندگی کی کہانی خود لکھ سکتے ہو۔ کیا یہ اتنا آسان تھا؟ دیکھو تم نے اپنا ستیاناس کر لیا نا؟ تم نے مجھ پر اعتبار نہ کیا، تم نے میرا بھیجا ہوا تحفہ سڑک پر پھینک دیا۔ یہی وہ فور سیپس ہے نا جسے تم چمٹا کہتے تھے؟" وہ اپنے ایپرن کی جیب سے چمٹا نکال لیتا ہے۔ "تم نے جلد بازی کی۔ تم نے مجھ سے بازی لے جانا چاہا، اپنے خالق سے۔ تم نے سوچا تم صفحات سے باہر بھی سانس لے سکتے ہو، اپنی مرضی کی زندگی جی سکتے ہو۔ تم نے میرے انتظام میں جو انتشار پیدا کیا اب اس کا نتیجہ تمھارے سامنے ہے۔ یہ فور سیپس۔۔۔" وہ فور سیپس میرے چہرے کے سامنے لٹکا دیتا ہے۔ اس کا اسٹیل راہداری کی ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں بے رحمی سے چمک رہا ہے۔ "تمھارا بچہ، تم نے یہ بالکل نہ سوچا اسے کیا چاہیے، کہ اس کی اپنی کوئی مرضی بھی ہو سکتی ہے جس کے لیے تم ساری عمر لڑتے آئے تھے، تم نے صرف مجھ سے جیتنے کی ضد میں اتنا بڑا فیصلہ لے لیا۔۔۔"

اوٹی کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس کی سرخ بتی جل اٹھی ہے۔ میں ٹھنڈی دیوار سے چپکا کھڑا ہوں۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ میرے سامنے اسٹریچر کے پہیے گھومنے لگتے ہیں۔ اس اسٹریچر پر سیتا درد کی شدت سے نیم بے ہوش لیٹی کراہ رہی ہے۔ گرچہ اس کی آنکھیں بند ہیں مگر جانے کیوں مجھے لگتا ہے اسے میری موجودگی کا علم ہے۔ اوٹی کا دروازہ کھلتا ہے۔ اسٹریچر کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر اندر چلا جاتا ہے۔ اب میں باہر اکیلا کھڑا ہوں۔ نہیں، شاید کوئی میرے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ یہ میرا باپ ہے جو آگیا ہے اور لکڑی کے ایک بنچ پر خاموش بیٹھا ہے۔ مجھے اس کی موجودگی عجیب سی لگتی ہے جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو، صرف میرا اضافہ ہو گیا ہو۔ میرے سر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ اس درد کے سبب میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں، مجھے دیوار کافی بھاری لگ رہی ہے جیسے وہ میرے سہارے کھڑی ہو۔ اندر سیتا کا دردِ زہ اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میرے باپ کی آواز مجھے اس دیوار سے کھینچ کر باہر نکالتی ہے۔ اوٹی کے بلب کی سرخی میری آنکھوں سے رس رہی ہے۔ میں سر موڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا ہوں، اور گرچہ وہ بنچ پر دیوار سے لگا بیٹھا ہے میں اسے دیکھ نہیں پاتا اور لڑکھڑاتے ہوئے باہر جانے لگتا ہوں۔ نرسنگ ہوم کے باہر ایک ایمبولنس کار کھڑی ہے جس کی روشنی تیزی سے گردش کر رہی ہے۔ ایک مریضہ اس نرسنگ ہوم سے کسی دوسری جگہ منتقل کی جا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر آکسیجن کا ماسک لگا ہے جس کے اوپر سے اس کی آنکھیں اس طرح نظر آ رہی ہیں جیسے وہ اپنے ہی اندر مر کوز ہوں۔ میں نے سڑک تیزی سے پار کی ہے۔ آسمان پر آدھی رات کا چاند دہک رہا ہے جو ہمارے محلے کی کشادہ سڑک تک میرا پیچھا کرتا ہے اور میرے رکتے ہی پیڑوں کے اوپر تھم جاتا ہے۔ ہماری عمارت کا صدر دروازہ ہمارے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے اپنے فلیٹ کی لینڈنگ پر آتا ہوں۔ درد سے پھٹتے سر کو ایک طرف گرا کر میں نے جیب سے کنجی نکالی ہے اور داخلے کا دروازہ کھول کر کنجی کو اس کے سوراخ سے لٹکتا چھوڑ دیا ہے۔

اب میں چاند سے روشن بالکنی پر اس کا جنگلہ تھامے کھڑا ہوں اور دور تک نظر آنے والی عمارتوں کے اندر شاید واحد شخص ہوں جو جاگ رہا ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ نیچے سڑک اپنے دورویہ پیڑوں کے ساتھ سنسان پڑی ہے۔ میں ریلنگ پر جھک کر ایک گہری سانس لیتا ہوں۔ ہوا میں کٹھل چمپا کی تیز خوشبو ہے۔ آسمان پر روئی کے گالوں کی شکل کے بادل بکھرے ہوئے ہیں جیسے بے شمار پھاہے نہ نظر آنے والے زخموں پر رکھے ہوں۔ میں نے اپنے داہنے ہاتھ سے جنگلے کو تھام رکھا ہے مگر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اس مادی دنیا سے باہر نکل آیا ہوں۔ جانے کتنا وقت گزر گیا ہے، جب ایک تیز آواز سے میری محویت ٹوٹ جاتی ہے۔ فون کی گھنٹی کمرے کے اندر بج رہی ہے۔ میں جنگلے کو پھلانگ کر بالکنی کی دیوار کے باہری سرے پر قدم جماتا ہوں اور مڑ کر تاکے بغیر بھی سمجھ سکتا ہوں ہمارے فلیٹ کے دونوں نیم تاریک کمرے اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف تاک رہے ہیں۔ فون کی گھنٹی لگاتار بجتی رہتی ہے۔ جانے کتنا وقت گزر جاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے بھول جاتا ہوں۔ جب مجھے دوبارہ اس کی یاد آتی ہے تو میں دیکھتا ہوں فون کی گھنٹی رک چکی ہے اور ایک گہرے سناٹے نے ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، ایک ایسا سناٹا جو میرے کانوں میں کچھ کہنے کے لیے بے چین ہے۔ میں غور سے سننے کی کوشش کرتا ہوں مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میں سر اٹھا کر دیکھتا ہوں، آسمان پر روئی کے پھاہے ہوا کی زد میں آ کر رینگنے لگے ہیں اور چھتوں پر دور تک سوکھنے کے لیے ٹنگے ہوئے کپڑوں نے پریت آتما کی طرح لہرانا شروع کر دیا ہے۔ جنگلے سے میری انگلیوں کی گرفت ہٹ گئی ہے اور اب میں بغیر کسی سہارے کے دیوار پر اپنی جگہ کھڑا ہوں جیسے میں اس پرانی عمارت کا ایک بے جان حصہ ہوں، پرنالے کے طور پر بنایا ہوا کوئی انسانی ڈھانچہ جس کی شرمگاہ سے برسات کا پانی باہر آتا ہے۔

بے جان انسانی ڈھانچے نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ اس نے ایک آخری نظر نیچے بادام کے پیڑ پر ڈالی ہے۔ پیڑ کی ڈالیاں سوڈیم لیمپ کی تیز روشنی میں سونے کی طرح دمک رہی ہیں۔ ان کے زیادہ تر پتے جھڑ چکے ہیں اور ٹہنیوں کے بیچ رکھا ہوا گھونسلا ویران ہے۔

رودِ خنزیر

میں ان دنوں گودی کے علاقے میں سامان اٹھانے کا کام کیا کرتا۔ شام کی طرف، جب میرے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا، میں اپنے وقت کو دو حصوں میں بانٹ لیتا۔ سورج ڈوبنے سے قبل میں لوہے کے پُل پر بیٹھا لوگوں کے جوتے پالش کیا کرتا۔ جب میرے پاس پالش کرنے کے لئے نہ ہوتا میں نیچے کھال میں کشتیوں کو چاند کی کشش کے زیرِ اثر کناروں پر چڑھتے دیکھتا رہتا۔ بانس اور لکڑی کے تختوں سے بنی یہ خستہ حال کشتیاں نائلن کی رسیوں سے ڈھلان پر کھڑے درختوں کے ساتھ بندھی ہوتیں۔ جلد سورج دریا پار دھندلے مکانوں کے اوپر کی کثافت میں غائب ہو جاتا۔ لیکن اس کے بعد بھی قدرتی روشنی کافی دیر تک قائم رہتی۔ آسمان اندھیرے میں دوب چکا ہوتا جب آئس کریم کی ٹرالی کو ڈھکیلتے ہوئے جس پر رنگین چھتری ڈول رہی ہوتی میں میدان کی طرف نکل جاتا جہاں درختوں کی آڑ میں بیٹھے رومانی جوڑوں کو میں اونچے داموں آئس کریم بیچا کرتا۔ ان دنوں میرے پاس بس یہی کام تھے۔ اور اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں بتا سکتا ہوں یہ زندگی اتنی بری بھی نہیں تھی۔ میں خود سے کہا کرتا، تم یہ بھول نہیں سکتے کہ تم ایک ایسے آدمی ہو جس نے دوبار اپنا ملک بدلا ہے۔

اور یہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے۔۔۔

سورج آسمان پر ہمیشہ کی طرح اپنا فرض نبھا رہا تھا اور میرے والد مغربی پاکستان جانے کے لئے چٹاگانگ کی بندرگاہ میں اپنے دو چرمی سوٹ کیس، ایک ہولڈ آل اور ایک کوٹ کے ساتھ جہاز کے عرشے پر کھڑے ہماری طرف تاک رہے تھے۔ ماں کے برعکس جو سانولے رنگ کی ایک معمولی ناک نقشے والی بنگالی عورت تھی، ابا ایک لانبے قد کے گورے چٹے اور کافی وجیہ انسان تھے جن کے گھنے نفیس بال کسی فلمی ہیرو کی یاد دلاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میری ماں نے ابھی ہندوستان واپس لوٹنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ دوسری طرف میں صرف سات برس کا تھا اور اس لائق نہیں تھا کہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ لے سکوں۔ مگر دیکھتے دیکھتے دو برس گذر گئے جب ایک دن اچانک ماں نے اعلان کیا کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنا پیدائشی وطن واپس لوٹ جائیں۔ مجھے ماں کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ اپنا وطن! مجھے تو اس کی یاد بھی نہیں ہے جب کہ اپنے باپ کے برعکس جو کبھی اس ملک کی زبان بول نہ پائے، ہم لوگ تو وہی زبان بولتے ہیں جو اس ملک میں بولی جاتی ہے۔

بہت بعد میں، تقریباً نو برس بعد، بسترِ مرگ پر ماں نے مجھے بتایا، وہ میرے باپ کو کھونے کے صدمے سے کبھی ابھر نہیں پائی تھی۔ جہاز پر جانے کے لئے تختہ پر قدم رکھنے سے پہلے ابا نے ہمیں امید دلائی تھی کہ کراچی پہنچ کر وہ جلد ہمیں بلا لیں گے۔ مگر دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں ڈھلتے گئے۔ سمندر میں غیر ملکی جہاز آتے جاتے رہے۔ انھوں نے کبھی لوٹ کر ہماری خبر نہیں لی۔

"ارسلان، تم اپنے دل پر جبر مت لو۔" ماں نے کہا۔ پچھلے دو سال سے وقفے وقفے سے، جب جب ان پر درد کا شدید غلبہ ہوتا، انھیں اپنی پیٹھ کے نچلے حصے پر الاسٹک کے بریسیز پہننے ہوتے تھے۔ یہ بریسیز پہلے سے استعمال شدہ تھے اور جینیوں کے خیراتی اسپتال سے دئے گئے تھے جہاں ایک مارواڑی تاجر کی سفارش پر ان کی ریڑھ کی ہڈی کی مفت سرجری کی گئی تھی۔ اس تاجر کے گھر ماں نے کچھ دنوں کے لئے نوکری کی تھی۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی کا یہ درد سالوں سال صبح سے شام تک لگاتار لوگوں کے گھروں کو پوچھا لگانے اور بھاری گھریلو سامان ادھر ادھر کرنے کا نتیجہ تھا۔ ان وقتوں میں جب ان کا درد اٹھتا وہ بالکل کام کرنے کے لائق نہ ہوتی اور زیادہ تر انھیں گھر میں پڑا رہنا پڑتا۔ جس کا مطلب تھا وہ ہماری فاقہ کشی کا دور ہوتا کیونکہ لگاتار چھٹی لینے کے سبب ان کا زیادہ تر کام چھوٹ جاتا۔ مگر اس وقت ماں ایک سرکاری اسپتال میں ایک جان لیوا مرض کی شکار بن کر آئی تھی اور اس وقت جب کہ وہ مجھے دلاسا دے رہی تھی، اسپتال کے وارڈ کے اندر بس اتنی بھر روشنی رہ گئی تھی کہ میلی کچیلی دیوار پر سائے کے نام پر ایک ہلکا سا دھبا بن سکے۔ ماں نے میری دونوں مٹھیاں اپنی مٹھیوں میں تھام کر اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر رکھ لیا تھا جیسے میری مٹھیاں وہ اپنے ساتھ دوسری دنیا میں لے جانے والی ہو۔ وہ جن آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی وہ میرے لئے بالکل نئی تھیں۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ اتنے سالوں تک انھوں نے ان آنکھوں کو کہاں چھپا رکھا تھا۔ "وعدہ کرو، تم کبھی اپنے باپ کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کروگے۔ خدا کا شکر ہے وہ ایک ایسے ملک میں جا بسے ہیں جس سے اس ملک کی دشمنی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ مگر وعدہ کرو۔"

ایک بار میرا جی چاہا کہ میں اپنے ہات کھینچ لوں۔ مگر ماں لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھیں اور میں ان کی موت کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا، ماں کی موت کا یا اس بات کا کہ ایسا کچھ ہو جائے

کہ ماں کا موت کا ارادہ ٹل جائے۔ آج یہ بتانا مشکل ہے اس دن میں کس بات کا انتظار کر رہا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کچھ بھی ہو سکتا تھا جس پر اس وقت میرا کوئی بھی اختیار نہیں تھا۔

رات دس بجے میں ٹرالی ڈھکیلتے ہوئے واپس لوٹتا تو ہوٹلوں کے علاوہ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی ہوتیں۔ قریب ہی طوائفوں کا محلہ ہونے کے سبب ان ہوٹلوں میں آدھی رات تک رونق رہا کرتی۔ مجھے کسی بھی ہوٹل کے باہر رکنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ ہر ہوٹل کا اپنا آئس کریم کا کونا تھا جہاں کمسن طوائفیں گاہکوں کے ساتھ آئس کریم کی میز پر ہنسی ٹھٹھول کیا کرتیں۔ میں جب ٹرالی بچے کھچے آئس کریم کے ساتھ فیکٹری کے حوالے کر کے گھر لوٹتا تو یہ وقت سڑک چھاپ کتوں کا ہوتا جو میری بو سونگھ کر ہمیشہ مجھے رد کر دیا کرتے۔ دراصل اس مقصد کے لئے انھیں سڑک پر کوئی نہ کوئی پاگل یا بھکاری آسانی سے مل جاتا جس کا وہ اسٹریٹ لیمپ کی ناکافی روشنی میں دور تک پیچھا کیا کرتے۔

ماں نے مرنے کے لئے مزید تین دن کیوں لگایا یہ آج بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ دراصل انھیں تو اسی دن مر جانا چاہئے تھا جس دن انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ شاید ان کے لئے مرنا کوئی خاص واقعہ نہ ہو۔

سچ بات تو یہ تھی کہ میں ان کے مرض کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ بس ایک دن ان پر شدید دورا پڑا اور وہ بدن اینٹھتے ہوئے بلبلانے لگی۔ بستر سے اٹھنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے بریسیز کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی جنھیں میں نے انھیں پہننے میں مدد دی۔ مگر ان بریسیز کے باوجود وہ پھر کبھی بستر سے اٹھ نہیں پائی۔ وہ ساری رات کراہتی اور ٹھٹھرتی رہی جیسے سردی اپنے شباب پر ہو جب کہ پاس پڑوس کے تمام گھروں میں بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ صبح میں نے دیکھا ان کے جسم میں جگہ جگہ نیلے گومڑ نکل آئے تھے۔ دو دن تک اسی طرح وہ بستر پر پڑے پڑے چھٹپٹاتی رہی جب محلے کے کچھ

لوگ ترس کھا کر اسے سرکاری اسپتال لے گئے جہاں ان پر پانی چڑھا دیا گیا۔ ان کے خون کی جانچ کی گئی اور سرکاری ڈاکٹر نے بتایا، یہ گومڑ کسی کتر کر کھانے والے میمل کے کاٹنے کا نتیجہ ہے، مگر اصلی بیماری تو کچھ اور ہے۔ اور یہ ایک خاص قسم کا مچھر ہے جس کے پیر اسائٹ خون کے راستے سیدھے انسان کے دماغ پر حملہ کرتے ہیں اور دیر ہو جانے پر ڈاکٹروں کے کرنے کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور میرے کان میں سرگوشی کی: بیٹا، تم بڑے ہو گئے ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنی ماں کی موت کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔

جو میں اس دن بھی تیار تھا جب ماں چٹاگانگ کی بندرگاہ میں جیٹی سے کچھ دور ہٹ کر پانی کے بالکل قریب کھڑی تھی جہاں جانے کس امید میں ہم لوگ ہر مہینے ایک آدھ بار بس میں ایک لمبی مسافت طئے کر کے آیا کرتے۔ اس دن آسمان پر کئی رنگ کھیل رہے تھے اور نیچے سمندر کے پانی میں خس و خاشاک ڈول رہے تھے جیسے سمندری مچھلیوں کی طرح ان کی بھی اپنی ایک الگ زندگی ہو۔ اس دن ماں بالکل خاموش تھی۔ شاید ناامیدی نے دھیرے دھیرے ان کے اندر گھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جن نظروں سے سمندر کے پانی کو پشتے کی دیوار سے ٹکراتے دیکھ رہی تھی اس سے ایک پل کے لئے مجھے لگا ماں سمندر میں کود جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ میں نے سختی سے ان کی ساڑی کے کنارے کو اپنی انگلیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے اس عمل کا نتیجہ ہو کہ ماں مزید نو برس زندہ رہی اور ایک ایسے اسپتال میں ان کا انتقال ہوا جہاں کے ڈاکٹر مریضوں سے زیادہ ان کے رشتے داروں سے باتیں کرنے کے عادی تھے۔

تمہیں یاد ہے ارسلان۔۔۔ ماں نے مرنے کے ایک دن قبل کہا۔ اس وقت وہ اسپتال میں لوہے کے پلنگ پر لیٹی ہوئی چھت کی چوبی بلیوں کی طرف تاک رہی تھی جن پر رکھی اینٹیں جگہ جگہ سے پلستر جھڑ جانے کے سبب ننگی ہو گئی تھیں۔۔۔ تمہیں یاد ہے وہ دن جب ہم لوگ مجیب الرحمان کو دیکھنے گئے اور لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر تم پھولے نہیں سما رہے تھے۔ تم نے دو کافی بڑے غبارے تھام رکھے تھے جو ہوا میں اڑنا چاہ رہے تھے۔ تم کتنے خوفزدہ تھے کہ کہیں یہ غبارے تمہارے ہاتھ سے اڑ نہ جائیں! ان دنوں ہم لوگ ڈھاکہ میں تھے۔ اور تمہیں وہ دن بھی یاد ہو گا جب فوج نے لوگوں پر قہر ڈھار کھا تھا اور ہم نے ایک دن ایک زخمی آدمی کو دیکھا جسے رضاکاروں نے ناریل کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا اور کسی فوجی گاڑی کے گذرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ آدمی دشمن ملک کے اجینٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہ آدمی اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا جب بھیڑ اپنے صبر کا دامن کھو بیٹھی اور کسی نے ایک اسکرو ڈرائیور نکال کر اس کے حلق میں پیوست کر دی۔ حملہ آور نے اسکریو ڈرائیور واپس باہر نکالنے کی کوشش کی تو اس کا لکڑی کا دستہ نکل کر اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اور شاید تمہیں یہ بھی یاد ہو کہ جب ملک آزاد ہو چکا تھا تو کس طرح ایک پبلک پارک میں جو ان لڑکوں کو گھاس پر گرا کر ملیشیا ان کے سینوں میں بیونٹ گھونپ رہی تھی اور یہ ہماری طرح ہی ہندوستان سے بھاگ کر آئے ہوئے لوگ تھے فرق صرف یہ تھا کہ یہ تمہارے باپ کی زبان بولتے تھے۔ بعد میں ہمیں سرکاری ریڈیو سے پتہ چلا کہ ان لولوگوں نے جنگِ آزادی کے خلاف پاکستانی فوج کو تعاون دیا تھا۔ میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ مرنے سے قبل ماں نے کیوں ان ناخوشگوار واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ نہ تو مجھے کسی غبارے کی یاد تھی نہ ان واقعات کی جن کا ذکر ماں نے کیا تھا۔ وہ ہمارے بڑے ہی افراتفری کے دن تھے جب ہم لوگ ہمیشہ سفر پر رہا کرتے، کبھی ڈھاکہ، کبھی چٹاگانگ اور کبھی نواکھالی۔ نرس نے مجھ سے کہا کہ میری ماں پر ہذیانی کیفیت طاری تھی، کہ مجھے ان کی باتوں کا بھروسہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس حالت میں سنا اور دیکھا ہوا کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔

ابا کی روانگی کے بعد ہم لوگوں نے اپنی وفاداریاں بدل لی تھیں اور ہماری زبان کے سبب کوئی ہم پر انگلی اٹھا نہیں سکتا تھا۔ لیکن ماں نے بہت جلد فیصلہ کر لیا کہ ہمیں اپنا پیدائشی ملک واپس لوٹ جانا چاہئے۔ شاید وہ روز روز کے خون خرابے سے تنگ آگئی تھی۔ شاید انھیں ڈر تھا کہ یہ ملک ہمیشہ انھیں میرے باپ کی یاد دلاتا رہے گا جس پر یہ الزام آسانی سے اور جائز طور پر لگایا جاسکتا تھا کہ وہ پاکستانی فوج کے مخبر تھے۔ میری پڑھائی رک چکی تھی اور کسی نے میرے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ہم تو بس اس نئے نویلے ملک میں تھوڑے دنوں کے مہمان تھے۔ مگر ماں کو یہ فیصلہ لینے میں دو سال لگ گئے۔ شاید کوئی بھی فیصلہ اکیلے لینے میں وقت لگ جاتا ہے۔ شاید اپنے دل کے کسی گوشے میں اب بھی انھیں اس سمندری ڈاک کا انتظار تھا جو ایک تیسرے ملک کا دروازہ ہمارے لئے کھولنے والا تھا اور وہ اپنے ٹھکانے سے ہٹنا نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن آخر کار وہ دن آ ہی گیا۔ اور پھر ہزاروں لوگوں کی طرح جو چوری چھپے اپنا وطن واپس لوٹ رہے تھے جسے انھوں نے دہائی قبل چھوڑنے کی غلطی کی تھی ہمیں بھی غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کا موقع مل گیا۔ ”یاد رکھو ارسلان۔۔۔“ ماں نے اسباب باندھتے ہوئے کہا۔ ”.. تم اپنا وطن واپس لوٹ رہے ہو۔ ایک مہاجر پرندے کی طرح جس کا وقت یہاں پر ختم ہو چکا ہے۔ کوئی کچھ بھی کہہ لے، تم کوئی جرم نہیں کر رہے ہو۔ اس بات کو دھیان میں رکھنا بہت ضروری ہے“ بہت بعد میں مجھے اس کا خیال آیا تھا کہ ماں نے شاید ٹھیک نہیں کہا تھا۔ مہاجر پرندے تو بار بار ایک ہی جگہ لوٹ آتے ہیں جب کہ ہمارا سفر یک طرفہ اور آخری تھا جہاں سے اب ہم کبھی واپس آنے والے نہیں تھے۔ میں محلے میں جن لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا انھیں جب ہمارے بارے میں پتہ چلا تو انھیں کوئی حیرت نہ ہوئی۔ ہندوستان تم لوگوں کے لئے صحیح جگہ ہے، میرے ایک دوست نے کہا جو ہمارے پڑوس میں رہتا تھا، مجھ سے دگنی عمر کا تھا، اور کسی پنسل کی طرح دبلا پتلا اور لمبا تھا۔ وہ طرح طرح کی کتابیں پڑھا کرتا اور اپنی ایک خاص سوچ رکھتا تھا۔ یہاں ہمیشہ تمہارے باپ کے سلسلے میں سوالات پوچھے جاتے رہینگے۔ یاد رکھو، اگر ہوا تمہارے خلاف بہنے لگی یا کسی نے تمہاری مخبری کر دی تو انھیں اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی کہ تمہارے باپ کے ساتھ تم لوگوں کے تعلقات ہمیشہ ہمشیہ کے لئے ختم ہو چکے ہیں اور تم اور تمہاری ماں اس ملک کی زبان بالکل مقامی لوگوں کی طرح بول سکتے ہو۔

میں وہ سفر کبھی بھول نہیں سکتا۔ مگر میرے لئے بہتر ہے کہ اسے بھلا دوں۔ میں آج بھی اس کے لئے خود کو گناہ گار تصور کرتا ہوں۔ اس دن مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ایک ہی آسمان کے نیچے زندگی گذارنے کے باوجود لوگ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ سچ کہا جائے تو یہ سفر ایسا تھا کہ اس کے بعد میرے لئے دنیا میں حیران ہونے کے لئے بہت کم چیزیں رہ گئی تھیں۔ شاید یہ اس کا نتیجہ ہے کہ اب میں بہت کم باتیں بول پاتا ہوں۔ دوسری طرف نہ میں بہت دیر تک بولتے رہنے والوں کو ٹھیک سے سمجھ پاتا ہوں نہ ان لوگوں کو جو پورے وقت خاموش رہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے پہلے والے کے پاس کوئی کہانی سرے سے نہیں ہوتی شاید اسی لئے وہ اتنے سارے لفظوں کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں جب کہ دوسرے کے پاس ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جسے اس کے لئے الفاظ کی شکل دینا نا ممکن ہوتا ہے۔

ہم جب اپنے پیدائشی وطن کے اسٹیشن میں اترے تو ماں کے چہرے پر ناخن کے کھرونچ کے دو گہرے نشان تھے جو پوری طرح سوکھے تو نہ تھے مگر اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ ماں کے ساتھ زندگی بھر رہ جانے والے تھے۔ سارا راستہ ماں کی دونوں آنکھوں میں ایک رقیق مادہ لرزتا رہا تھا لیکن آخر تک اس نے پانی بننے سے انکار کر دیا۔ ماں کو اپنے لوگوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ شاید وہ ہر پل اس جگہ کو اپنے خواب میں دیکھتی آئی تھی۔ یہ شہر کا بہت ہی گنجان علاقہ تھا جہاں ہر نکڑ پر لوہے کے ہائڈرنٹ کھڑے تھے جو گدلا پانی اگلا کرتے اور ٹرام ڈپو کے اندر سے ٹرام گاڑیاں بجلی کے تاروں میں نیلی چنگاریاں جگاتی ہوئی نکلا کرتیں۔ یہاں پر اب بھی پرانے زمانے کی بہت ساری عمارتیں کھڑی تھیں جن کے گنبدوں کے روشندانوں میں مختلف رنگ و نسل کی بلیاں کبوتروں کی تاک میں بیٹھی رہتیں اور اینٹ کی دیواروں پر لیمپ کے آہنی ڈھانچے لگے ہوئے تھے جن کا زمانہ گذر چکا تھا اور اب ان میں روشنیوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ وہاں ہمارے بچے کھچے رشتے داروں کو ہماری کہانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک طرح سے یہ ٹھیک بھی تھا۔ میں دو سال کا تھا جب میرے نانا اپنے قریبی رشتے داروں کو کسی طرح کی بھنک دئے بغیر اپنے نقدی اور زیورات کے ساتھ راتوں رات میری نانی، اماں اور ابا کو لے کر مشرقی پاکستان کوچ کر گئے تھے۔ میری ماں ان کی اکلوتی اولاد تھی جس نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ اب ہمیں لٹے لٹائے واپس آتے دیکھ کر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ کس طرح سے ہمارا استقبال کریں۔ انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ ہم کہیں نانا کی طرف سے اجمالی جائداد پر دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ جہاں تک ماں کا تعلق تھا، یہ شہر ان کا اپنا تھا۔ اس کے آنگن اور دالانوں میں ان کا بچپن گذرا تھا، اس کے گلی کوچے ان کے جانے پہچانے تھے، اور ان کے ذہن پر اس کے بازاروں اور پاٹھ شالاؤں کی یاد اب بھی تازہ تھی۔ لیکن میرے پاس تو سارا تجربہ ایک اور ہی ملک کا تھا جسکی پیدائش کو میں نے اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھا تھا، مگر جس کی شکل پوری طرح طئے ہونے سے پہلے ہی ہم اسے خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس نئے ملک کے لئے جس وفاداری کی ضرورت تھی کیا وہ میرے بس کی بات تھی؟ مگر اس سے زیادہ فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ میں وہ تھا جس نے تاریخی واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے پیش آتے دیکھا تھا اور ایسے انسان کے لئے اپنی وفاداری کو کوئی بھی شکل دینا آسان ہوتا ہے۔ آج بھی پُل پر بیٹھ کر جوتے چمکاتے وقت میں سوچا کرتا ہوں، میں تا عمر یہ کام نہیں کرنے والا، کہ میرے پاس دوسروں کے

سلسلے میں تجربات زیادہ ہیں اور ایک دن میرے پاس کہنے کے لائق اتنی ساری باتیں ہوں گی کہ انھیں سن کر یہ دنیا اپنی نگلی دانتوں کے درمیان دبانے پر مجبور ہو جائے گی۔

اپنے قریبی رشتے داروں کے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر آخر کار ماں نے ہمارے ایک دور کے رشتے دار کے گھر ایک کمرا کرایہ پر لے لیا تھا جو ہماری زبان ہی بولتے تھے۔ یہ جگہ ہمارے پشتینی مکان سے کافی دور دریا کے کنارے واقع تھی۔ ماں کو یہ جگہ پسند نہیں تھی۔ وہ ہر ہفتے بس میں بیٹھ کر اپنے حق کی لڑائی لڑنے پرانی جگہ جایا کرتی جہاں ہمارے پشتینی مکان کے سارے دروازے ہمارے لئے بند کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے ایک وکیل سے بھی رجوع کیا تھا جس نے یقین دلایا تھا کہ وہ ان کی ایک ایک پائی وصول کر دیں گے۔ ماں نے ایک بار مجھے باہر سے وہ کمرا دکھایا تھا جس کے اندر میں پیدا ہوا تھا۔ یہ کمرا کافی بڑا تھا جس میں کئی روشندان تھے اور اس کی دونوں کھڑکیاں دروازوں کی جسامت کی تھیں جن کی جھلملیاں برامدے کی طرف کھلی ہوئی تھیں۔ اس وقت اس کمرے میں میری عمر کا ایک لڑکا چھپر کھٹ پر بیٹھا اس کی دقیانوسی پوششوں کے نیچے سے میری طرف تاک رہا تھا۔ اس کی دونوں سوکھی ٹانگیں پلنگ سے اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے وہ لکڑیوں کی بنی ہوں جن کے خاتمے پر چڑیوں کے پنجے لگے ہوئے ہوں۔ میں نے محسوس کیا وہ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر اسے اس کا موقع نہیں ملا۔ اس کی ماں نے ہمیں دیکھ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اب میں کبھی ماں کے ساتھ اس جگہ نہیں جاتا۔ ہمارے پرانے علاقے کے برعکس اس نئے علاقے کی گلیوں بازاروں میں ان لوگوں کی اکثریت تھی جو میرے باپ کی زبان بولتے تھے۔ یہ بڑے ہی اکھڑ قسم کے لوگ تھے، مگر بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ یہ ایک محنت کش قوم تھی۔ شاید ان پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ لیکن ہمارے دور کے رشتے دار انھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کے سلسلے میں ان کی رائے بالکل الگ تھی۔ ان کے خیال میں ہم ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ شاید میرے باپ کے عمل نے اس بات کو تقویت پہنچائی تھی۔ خود میں نے بازار میں ان چرب زبان پھل والوں کو دیکھا تھا جو کم تر درجہ کے پھل اچھے پھلوں کے ساتھ ملا کر چالاکی سے بیچ دیا کرتے۔ ان کے برعکس آلو پیاز بیچنے والے ملائم چہروں کے مالک تھے جو مجھے پسند آتے۔ وہ سامان والے پلڑے کو بٹکھرے والے پلڑے کے مقابلے کافی حد تک نیچے جھکا دیتے۔ مگر ہمارے رشتے داروں کا خیال تھا ان کے اس عمل سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں جب بھی اکیلا ہوتا وہ میری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے۔

"تم نے کبھی غور نہیں کیا، ان ہندوستانیوں* کے چہروں کا رنگ کبھی نہیں بدلتا اور یہ اچھی بات نہیں۔ تم ایسے چہروں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا ایک اور طرح کا فریب ہے۔ انگریزوں کے وقت سے وہ یہ کرتے آ رہے ہیں اور اب انھیں پکڑ پانا ممکن نہیں۔ کوئی نقصان کر کے سامان نہیں بیچتا۔" اس دن میں نے ایک اور بھی چیز جانی جب ایک پولس والے نے ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھ سے میری ماں کے بارے میں دریافت کیا۔ اسے شاید میرے بارے میں بھی علم تھا۔ "بچے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ یقیناً تمہاری پیدائش اس ملک کی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ میرے باپ کی زبان بول رہا تھا۔ ماں نے اشارا کیا اور میں آنگن چھوڑ کر گلی میں آ گیا جہاں ایک بندر والا تماشہ شروع کرنے سے پہلے اپنی ڈگدگی بجا رہا تھا اور اکے دکے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ دس منٹ بعد وہ پولس والا گلی میں دکھائی دیا۔ میں نے تماشہ چھوڑ کر دور تک اس کا پیچھا بھی کیا۔ وہ بس چلتا گیا اور چلتے چلتے ایک جیپ کے پاس پہنچ گیا جو ایک ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی۔ جیپ کے اندر اور بھی کئی پولس والے بیٹھے تھے۔ جیپ دھول اڑاتی ہوئی سڑک کی بھیڑ میں غائب ہو گئی۔ میں واپس آ رہا تھا جب ماں کو میں نے گلی کے نکڑ پر دیکھا۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ انھوں نے اپنا سر اوڑھنی سے ڈھک رکھا تھا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں وہی رقیق مادہ لرز رہا تھا جو ہمیشہ پانی بننے سے انکار کر دیتا۔ 'میرے ساتھ آؤ ار سلان، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" انھوں نے سختی سے میرا ہات تھام لیا۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے ایک سنار کی دکان پر پہنچے جہاں ایک آدمی، جس کے چہرے پر برص نے ملک کا نقشہ بنا رکھا تھا، سلاخوں کے پیچھے بیٹھا تھا۔ وہ فوراً ماں کو پہچان گیا۔ شاید اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ اسی درمیان ہم نے دوبار اپنا وطن بدلا تھا۔ بعد میں ماں نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارا خاندانی سنار تھا اور جب ان کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ میری نانی کے ساتھ ہمیشہ اس دکان میں آیا کرتی۔

ان دنوں اس دکان میں یہ سلاخیں نہیں ہوا کرتی تھیں نہ ہی اس کے چہرے پر برص کا یہ سفید نشان تھا۔ ماں نے اپنے دامن سے ایک کاغذ کی پوٹلی نکالی جسے انھوں نے اوڑھنی کے پلو سے باندھ رکھا تھا۔ اس میں سونے کی ایک ہار پڑی ہوئی تھی۔ اس شخص نے ہار لیتے ہوئے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ "بچے جلد بڑے ہو جاتے ہیں۔ تم نے کس اسکول میں اسے ڈالا ہے؟"

"وہ دس برس کا ہو چکا ہے۔ اب اس کی اسکول کی عمر نہیں رہی۔" ماں نے جواب دیا۔

"کم از کم انسان کو زندہ رہنے کے لئے ایک کاغذ تو چاہئے۔" وہ احتیاط کے ساتھ ہار کا جائزہ لے رہا تھا جب ماں نے اسے یقین دلایا کہ یہ اسی کا ڈھالا ہوا ہے۔ وہ مسکرایا اور اس نے ہار کو پیتل کے ایک بالکل چھوٹے سے میزان کے پلڑے پر ڈال دیا۔ اتنا چھوٹا میزان میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیتل کے منحنی بٹکھرے اور لعل کے سرخ دانے مجھے کسی عجوبے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دونوں پیسے کے بارے میں گفتگو کرنے لگے جس سے مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ میں توشیشوں کے پیچھے کی چمکتی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس آدمی نے حساب کرنے کے بعد ایک لال پوتھی ماں کی طرف بڑھا دیا جس پر ماں نے فوراً دستخط کر دیا۔ ہم واپس لوٹ رہے تھے

جب ماں نے مجھ سے کہا کہ میں کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ نہ کروں۔ ”یہ ہمارے رشتے داروں کا کمینہ پن ہے۔ انھوں نے پولس کو ہمارے پیچھے لگایا ہے۔ جانے وہ کیا چاہتے ہیں؟ مجھے ان سے یہ امید نہ تھی۔“

شام کو وہ پولس والا دوبارا دکھائی دیا۔ اس بار وہ موٹر سائکل پر تھا جسے اس نے ہمارے گھر کے ٹھیک باہر روکا تھا۔ ماں نے اس کے لئے چائے بنائی۔ پولس والے نے چائے پیتے ہوئے میری طرف دلچسپی سے دیکھا۔ ”کیا تم بیوقوف ہو؟“ اس نے مجھ سے کہا۔

”وہ بس کم بولتا ہے۔“ ماں بولی اور جب وہ چلا گیا تو میں نے دیکھا ماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ اپنی مٹھی میں دبی ہوئی باقی رقم کو گھور رہی تھی۔ ”وہ میرا آخری گہنا تھا جسے مجھے گروی رکھنی پڑی۔ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ مجھے شروع میں ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔ ہم لوگ ناگ کے گھونسلے میں لوٹ آئے ہیں۔“

ایک ماہ کے اندر اندر ہم لوگوں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ ایک لوکل ٹرین میں بیٹھ کر ہم کئی گھنٹے سفر کرتے رہے جو مجھے ٹرین پر اپنے پچھلے سفر کی یاد دلا رہا تھا جب ہم سرحد سے گذر کر ایک اجاڑ سے اسٹیشن میں ایک ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ یہ ٹرین جن پٹریوں پر دوڑ رہی تھی ان کے دونوں طرف لہلہاتے کھیتوں کی منڈیروں پر ناریل اور کیلے کے درخت کھڑے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ آخر کار ہم ایک صاف ستھرے قصبے میں چلے آئے جہاں کھیتوں کے لامتناہی سلسلوں کے اس پار ایک بڑے شہر کی عمارتیں اور عبادت گاہیں نظر آرہی تھیں۔ وہاں ماں نے مانگ میں سیندور سجایا اور ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ ماں نے مجھ سے کہا۔ ”ارسلان، میں آخری بار تمہیں اس نام سے پکار رہی ہوں۔ تمہیں اپنا نام بھولنا ہوگا۔ میں نے تمہارے لئے ایک نیا نام اور ایک نیا اسکول چنا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں کلاس میں تم سب سے بڑے لڑکے ہوگے مگر نئے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنا تمہیں اچھا لگے گا۔“ دوسرے دن وہ مجھے ایک پاٹھ شالہ لے گئی جہاں مجھے پتہ چلا کہ مجھے ایک نیا نام دے دیا گیا ہے۔ مجھے اس سے فرق نہیں پڑا تھا کہ میری ماں نے اپنا نام بدلا تھا یا نہیں۔ دراصل میں اسے جانتا ہی نہ تھا کہ ماں کا ایک نام بھی ہے۔ کلاس میں ایک دن کسی نے مجھ سے میرے باپ کے بارے میں پوچھا۔ جب میں نے اپنی عادت کے مطابق بتایا کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں تو کسی کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ بات کلاس ٹیچر کے کان تک گئی تو اس نے مجھے الگ بلا کر میری سرزنش کی۔ انھوں نے کہا مجھے اپنے باپ کے سلسلے میں ایسی بات نہیں کرنی چاہئے، وہ کیسے بھی انسان ہوں ایک بچے کو اپنے بزرگوں کے سلسلے میں احترام کا رویہ رکھنا چاہئے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی تھی کیونکہ میں نے وہی کہا تھا جو سرحد پار کرتے وقت ماں نے مجھے سکھایا تھا۔ ماں سے جب میں نے اس واقعے کا ذکر کیا تو انھوں نے مسکرا کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور مجھے اپنے باپ کا نیا نام بتایا جسے داخلے کے وقت انھوں نے فارم پر بھرا تھا۔ وہ کافی تھکی ہوئی تھی اور ابھی ابھی میرے نانا کے شہر سے وکیل کے ساتھ مل کر لوٹی تھی جو ہر ماہ ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ہڑپ جایا کرتا۔ ماں کے چہرے کی طرف تاکتے ہوئے مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مجھے اپنے باپ کے اصلی نام کا تو پتہ ہی نہ تھا۔ ظاہر تھا اگر مجھ سے ان کا نام پوچھا جاتا تو بھی میرے پاس جھوٹ کہنے کے لئے کیا تھا؟

گودی کے اس علاقے میں شام ہمیشہ ایسے اترتی ہے جیسے کسی نے کچے اپلوں کو آگ لگا دی ہو۔ ان اداس اور دھندلی شاموں سے گذرتے ہوئے مجھے وہ برے دن یاد آجاتے جب ہم ساری امیدیں ہار چکے تھے اور ڈھاکہ سے سینکڑوں میل دور ہم نے دریا کے کنارے ایک کچے گھر میں پناہ لے رکھی تھی جسے غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں کے ٹھہرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ دریا کافی کشادہ تھا اور اس کا سبز گھاس سے ڈھکا ہوا کنارا دریا پر بہت نیچے تک جھکا ہوا تھا جس میں جگہ جگہ ایسی بھیانک دراڑیں تھیں کہ انسان ان کے اندر گر کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے۔ ان کناروں پر ایسے اور بھی سینکڑوں کچے گھر بنے ہوئے تھے جن میں دوسرے لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ کچھ گھر ایسے بھی تھے جن کا آدھا یا ایک چوتھائی حصہ ٹوٹ کر دریا کے اندر چلا گیا تھا اور باقی حصہ رہ رہ کر ڈھ رہا تھا۔ یہ کنارے بالکل غیر محفوظ تھے، مگر ان میں ہر روز لوگوں کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس دن کہاسے نے شام غائب کر رکھی تھی۔ ہمارے پاس کوئی گھر تھا نہ کوئی وطن مگر ہمیں اس بات کا علم تھا کہ کسی بھی پل یا تو ایک نئے ملک کے دروازے ہمارے لئے کھل جائیں گے یا ایک نئی مصیبت ہمارے سر پر ٹوٹ پڑے گی۔ ہم نے ایک خاص جگہ جہاں پانی کم تھا، دریا کو چل کر پار کیا تھا۔ وہاں ماں کو اپنے نقدی کے ایک بڑے حصے سے محروم ہونا پڑا تھا۔ دریا پار کیے یہ ہمیں تیسرا دن ہو رہا تھا۔ ماں کو جس آدمی کا انتظار تھا دو دن سے اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ہمارے پاس چینی کا ایک ڈبہ اور پاؤروٹی کے تھوڑے سے ٹکڑے بچے تھے جو اب اتنے باسی ہو چکے تھے کہ چھوتے ہی چور ہو جاتے۔ ہمارے پاس ایک تھیلی چاول کی بھی تھی مگر اسے ابالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور پھر ہمیں سختی سے منع کیا گیا تھا کہ کسی جھونپڑی سے دھواں نہ نکل پائے۔ پانی کے لئے ماں مجھے کچی سڑک پر بھیجا کرتی جہاں ایک ہینڈ پمپ کے پیچھے بیرک کی چھت پر جو کبھی کسی زمیندار کی حویلی رہی ہوگی مگر اب فوج کی تحویل میں تھی، فوجی سگریٹ پیتے ہوئے، کندھوں سے رائفل لٹکائے پہرا دیا کرتے اور اور اپنی گردن سے لٹکتی دوچشمی دوربین سے دریا پار دیکھا کرتے جب کہ وہ جگہ ننگی آنکھوں سے بھی صاف نظر آتی تھی۔ کبھی کبھار جب میں ان کی نظروں میں آجاتا تو وہ ہاتھ ہلا کر اشارا کرتے اور مسکراتے ہوئے کوئی ٹافی یا کاغذ میں لپٹا ہوا کیک کا ٹکڑا پھینک دیتے۔ ہمارا آدمی واپس لوٹا تو اس نے ایک سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی جس پر ایک سفید ستارا ٹنکا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ماں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”اسے واپس رکھ لو۔ یہ پیسہ کافی نہیں ہے۔“ اس نے ماں کو پیسے لوٹاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس کوئی گہنا وہنا نہیں ہے کیا؟“

"سارے لٹ لٹا گئے۔" ماں اس سے آنکھیں چرا رہی تھیں۔ پھر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ مجھے لگا وہ شاید اس آدمی کو دکھانا چاہتی تھیں کہ ان کے پاس اب بھی تھوڑے سے آنسو بچے ہیں۔ اس آدمی نے ٹوپی اتار کر اپنا سر کھجاتے ہوئے ماں کے سراپے کا جائزہ لیا۔ اس کے ننگے سر کو دیکھ کر مجھے بڑی کراہیت کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ نہ صرف اس کے سر پر بال برائے نام تھے بلکہ اس کی کھوپڑی کھجلیوں سے بھری ہوئی تھی جس سے مجھے اس کے ٹوپی پہننے کا راز سمجھ میں آ گیا۔ "تم مجھے ایسا کیوں دیکھ رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟" ماں نے اپنی پیشانی پر گر آئی لٹ کو انگلی سے واپس بالوں کے درمیان لوٹاتے ہوئے کہا۔ "تم کیوں نہ چل کر بیرک کے افسر سے خود بات کر لو۔" اس آدمی نے ٹوپی واپس سر پر رکھ کر اپنی جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ "تم اسے اپنی بات کہہ سکتی ہو۔ اگر کام بن گیا تو مجھے بھی پیسے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں یقین ہے اس سے کام بن جائگا؟"

"یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ مگر ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ اور آخر میں کچھ لوگوں کے کام بنے تو ہیں۔"

میں آدھی رات تک اکیلا اپنی جگہ گٹھری اور سوٹ کیس کو تھامے بیٹھا رہا۔ کوٹھری کے باہر جھاڑیوں میں ہوا چپ تھی۔ کسی وجہ سے اس دن دریا میں پانی بہت کم تھا اور جگہ جگہ پانی سے ریت کے تودے اس طرح ابھرے ہوئے تھے جیسے دریا میں سینکڑوں گھڑیال آرام کر رہے ہوں۔ کبھی کبھار سفید بادلوں کو چیر کر چاند نکل آتا تو ریت کے گھڑیالوں کی آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ کہیں ماں کے آنے سے قبل ہی یہ کچا گھر اپنی کمزور زمین کے ساتھ ٹوٹ کر دریا برد نہ ہو جائے۔ مگر میں یہ جگہ چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ماں نے سخت تاکید کی تھی کہ جب تک وہ لوٹ کر نہ آئے میں اس جگہ سے نہ ہلوں۔ میں تقریباً غنودگی کی حالت میں تھا اور اپنی آنکھوں کو کھلی رکھنے کی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا جب ماں کی واپسی ہوئی۔ ان کے بال الجھے ہوئے تھے، قدم ٹھیک سے نہیں گر رہے تھے اور ان کے چہرے پر ناخن کے کھرونچ کے دو گہرے نشان تھے۔ یہ نشان مجھے روشنی میں اور بھی بڑے نظر آئے۔

"تم ایسا میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ اپنی آنکھیں واپس لو۔" ماں دھم سے میرے پہلو میں مٹی کے فرش پر بیٹھ گئی۔ انھوں نے جھک کر پانی کی بوتل اٹھائی، کئی لمبے گھونٹ لئے اور لالٹین کی مدھم روشنی میں اپنا چہرا دھویا۔ پانی میں دھل کر اس کے چہرے کا گھاؤ جل اٹھا تھا۔ ان کی آنکھیں تلملا رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی سانسیں لیتی رہیں، پھر خاموش ہو گئیں۔ باہر چاند ایک بار پھر بادلوں کے پیچھے چھپ چکا تھا جس کے سبب بادل بھی دکھنا بند ہو گئے تھے۔ ایک بار مجھے ایسا لگا جیسے نیچے دریا میں ریت کے گھڑیالوں میں سے کسی نے حرکت کی ہو۔ ماں بالکل بھی سانس نہیں لے رہی تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گذر چکا تھا جب ماں نے گٹھری کھول کر اس کے اندر سے ایک کھرپی برامد کی، لالٹین کی لو دھیمی کی اور لالٹین اور کھرپی اٹھائے ایک سائے کی طرح برامدے سے اتر کر جھاڑی کے پاس گئی۔ میں نے برامدے پر کھڑے ہو کر دیکھا، وہ جھاڑی کے نیچے کی زمین کھود رہی تھی۔ گڈھا جب تھوڑا گہرا ہو گیا تو انھوں نے اس کے اندر سے کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی برامد کی جسے جانے کب میری لاعلمی میں انھوں نے مٹی کے اندر چھپا دیا تھا۔ لرزتی انگلیوں سے تھیلی کو واپس گٹھری کے اندر رکھ کر جسے سفر کے دوران ماں ہمیشہ اپنی گود میں رکھا کرتی، انھوں نے اسے گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ "کبھی اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔" انھوں نے پینچ گھما کر لالٹین بجا دی۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے وہ سرخ ٹوپی والا آدمی نمودار ہوا۔ ہم نے اپنے سامان سمیٹے اور دریا کے کنارے کنارے اس کے ساتھ چلنے لگے۔ جلد دریا پیچھے چھوٹ گیا۔ ہم تقریباً آدھا دن تک کھیتوں اور میدانوں میں چلتے رہے اور آخر کار ایک کچے راستے پر نکل آئے جس پر ہر سو دو سو گز کی دوری پر تارکول کے بچے کھچے ٹکڑے بتا رہے تھے کہ کبھی یہ ایک پکی سڑک رہی ہو گی۔ سرخ ٹوپی والے نے بتایا کہ کبھی یہ راستہ دونوں ملکوں کے بیچ آمد و رفت کا واحد ذریعہ تھا، مگر اب اس کی جگہ ایک اور بڑا راستہ نکال لیا گیا ہے جن پر اب سامان بردار ٹرک اور ملیٹری گاڑیاں دوڑا کرتی ہیں۔ اس متروک راستے پر چلتے ہوئے میں نے جو آسمان دیکھا اس جیسا روشن آسمان مجھے پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ ہم نے عجیب و غریب چڑیاں دیکھیں جو جھنڈ بنا کر ہمارا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ رہ رہ کر جیسے ہوا سے نمودار ہوتیں اور پھر ہوا میں غائب ہو جاتیں۔ راستے میں ایک جگہ ماں کے ساتھ اس آدمی کی تکرار ہو گئی۔ اپنے چہرے کے دونوں زخموں سے رستے ہوئے رقیق مادے سے لاپرواہ ماں رندھے ہوئے گلے سے اس آدمی کا ہات تھام کر اسے زبردستی کچھ رقم تھمانا چاہ رہی تھی جسے وہ لینے سے بار بار انکار کر رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اتنے تھوڑے پیسے سے مطمئن نہ تھا۔ آخر کار دونوں کے درمیان کسی طرح کا فیصلہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ تھوڑی دور تک ہمارے ساتھ چلا پھر ہمیں بتائے بغیر جانے کہاں غائب ہو گیا۔ ہم اکیلے ہی ویران راستے پر کئی کوس چلتے رہے۔ ہمیں جگہ جگہ آم کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے جن کے پیچھے ہر آدھے گھنٹے کے بعد کسی نہ کسی چھوٹے موٹے قلعے یا محل کی بوسیدہ فصیل نظر آ جاتی یا تاریخی مسجدوں کے کھنڈر دکھائی دینے لگتے۔ سناٹے میں ٹیلیگراف کے تار بج رہے تھے۔ سورج ڈوب رہا تھا جب ہمیں ایک اجاڑ سا ریلوے اسٹیشن نظر آیا جس کے درختوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور پاس ہی کسی مندر میں گھنٹی بج رہی تھی۔ ہم لوگ اس کے پلیٹ فارم پر اپنی چرمی سوٹ کیس اور گٹھری کے ساتھ کھڑے ٹرین کا انتظار کر رہے

تھے جب صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک جوڑے نے ہماری طرف دیکھا۔ وہ لوگ میرے باپ کی طرح اپنے ہولڈ آل اور سوٹ کیس کے ساتھ کھڑے تھے جیسے وہ بھی ایک ایسے سفر پر جانے والے ہوں جہاں سے کوئی نہیں لوٹتا۔

''تم لوگ اس ملک کے نہیں لگتے۔'' مرد نے کہا اور انگلی سے ہماری طرف اشارا کیا۔ مگر عورت نے اسے آگے کہنے کا موقع نہیں دیا۔ ''چپ بھی کرو۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں کیا لینا۔ یہ ملک سب کا ہے۔ کسی کے ماتھے پر یہ لکھا نہیں ہوتا۔''

ٹرین کے اندر بہت دیر تک چپ بیٹھے رہنے کے بعد میں نے ماں سے پوچھا کہ رات وہ اتنی دیر تک کہاں رہ گئی تھی اور اس نے اس جگہ کیا دیکھا، تو ماں نے مسکرا کر میرے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور کہاں جا سکتی تھی۔ سرحد کے داروغہ کے پاس ہی تو گئی تھی۔ کچھ کاغذات کی خانہ پری کرنے۔''

اس دن مجھے اس بات کا علم نہ تھا۔ مگر آج مجھے پتہ ہے وہ ناخن کے کھرونچ کے نشانات ان کے چہرے پر دائمی طور پر کیوں بن گئے تھے۔ ایک نئے ملک نے اپنے انداز سے ہمارا استقبال کیا تھا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟'' ماں نے ٹرین کی کھڑکی سے چہرا موڑتے ہوئے کہا۔ انھوں نے اپنے حواس پر پوری طرح قابو پا لیا تھا۔

''تم نے اس آدمی سے گہنا کے بارے میں جھوٹ کیوں کہا تھا؟''

''یوں سمجھ لو میرا تمہیں جواب دینے کو جی نہیں چاہتا۔'' اور ماں نے چہرا کھڑکی کی طرف موڑ لیا

جس کے باہر دھان کے لہلہاتے کھیت پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے اور ان کی منڈیروں پر کھڑے ناریل اور کیلے کے درخت ہوا میں جھوم رہے تھے۔

مجھے ایک بار پھر ماں کی موت کی طرف لوٹ جانا چاہئے۔ ایک عورت جس کے دماغ پر ملیریا کا حملہ ہو چکا ہو کیسے اتنی یادداشت کے لائق ہو سکتی ہے۔ وہ شاید روشنی کے ہوتے ہوئے اندھیرے میں جینے لگی تھی اور پرچھائیوں کو دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔ تمہیں یہ سن کر دکھ ہو گا ارسلان، ماں نے بند آنکھوں کے ساتھ کہا تھا جیسے وہ اپنے اندر مجھے دیکھ رہی ہو۔ اب جو میں سوچتی ہوں تو مجھے لگتا ہے یہ تم تھے جس کے سبب تمہارے باپ نے پھر واپس لوٹنے کا نام نہیں لیا۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی ماں نے اور بھی بہت سارے جملے کہے ہوں مگر اس جملے کو ہی میں بار بار کیوں یاد کر رہا تھا؟ اس لئے نہیں کہ اس سے میرے دل کو چوٹ پہنچی تھی۔ میں جانتا تھا ماں کا یہ ارادہ ہرگز نہ تھا۔ شاید ان کا کوئی ارادہ نہ تھا یا شاید ان کا ارادہ تھا کہ میرے دل میں اپنے باپ کے لئے کوئی گوشہ باقی نہ رہے۔ مگر یہ بیکار تھا۔ میں نے کبھی اپنے باپ کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ میری ماں میرے لئے اتنی زیادہ تھی، اتنی وافر تھی، انھوں نے چاروں طرف سے اس طرح مجھے گھیر رکھا تھا کہ میرے باپ کو اندر آنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ میرے باپ کو شاید میری کم گوئی اور دھیمی حرکتوں سے مایوسی ہوئی تھی اور لڑائی نے انھیں ایک دوسری دنیا میں فرار ہونے کی سہولت عطا کی تھی۔ ماں اگر یہ بات مجھے نہ بھی بتاتی تو بھی میں اسے سمجھ سکتا تھا۔ مگر مجھے اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہ تھا۔ میں ہر حال میں اس حقیقت کے ساتھ سمجھوتہ کر چکا تھا۔ خدا انھیں ایک نئے ملک میں خوش رکھے! اس دنیا میں ہر کوئی اپنی اپنی قسمت کے ساتھ جیتا ہے۔ مگر ماں نے اپنے دل کی آخری پھانس ابھی شاید نکالی نہ تھی۔ ''مجھے افسوس ہے ارسلان۔۔۔'' انھوں نے اپنی بڑی بڑی زرد آنکھوں کو پوری طرح کھول کر میری طرف آخری بار دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں ایک اچھی دنیا میں چھوڑ کر نہیں جا رہی ہوں۔''

میرے دل نے کہا، شاید وہ یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ اچھی یا بری، مجھے اس دنیا کو اپنے طریقے سے جاننے کا حق ہے۔ ماں صرف یہ کہہ سکتی تھی کہ یہ دنیا اس کے لئے بری ثابت ہوئی، یا پھر یہ کہ اسے اس سے مایوسی ہوئی تھی یا اور کوئی جملہ جس سے انھیں تشفی ہوتی۔ مگر ان کی یہ کوشش کہ میری آخری روشنی بھی بجھ جائے میری سمجھ سے باہر تھی۔ ان کی موت کے بعد میں ان کے ٹھنڈے جسم کے سامنے جانے کب تک بیٹھا رہا۔ آس پاس کے بستروں میں اس بات کے سبب بڑی بے چینی تھی کہ مردہ کو ہٹانے میں اسپتال کے عملے کافی سستی سے کام لے رہے تھے۔ اسٹریچر پر منتقل کرنے سے پہلے نرس جب چادر سے میری ماں کے چہرے کو ڈھک رہی تھی تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا ''تمہارے لوگ ڈاکٹر سے سرٹیفکٹ لینے گئے ہیں۔''۔ وہ ایک پل کے لئے چپ ہو گئی۔ پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''سرٹیفکیٹ لینا نہ بھولنا۔ کیا تم ان کی اکیلی اولاد ہو۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے سمجھ لینا چاہئے تھا۔'' نرس نے مجھے اسٹریچر کے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ محلے کے لوگ ماں کو کریہ کرم کے لئے جس دریا کے کنارے لے گئے وہ کوئی دریا نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دبیز گھاس سے ڈھکی ہوئی زمین اچانک پھٹ گئی ہو اور اس میں پانی بھر گیا ہو۔ دریا کے کنارے ایک پتھر پر بٹھا کر جو شاید اسی مقصد سے اس جگہ لا کر رکھا گیا تھا کیونکہ اس کے نیچے کی زمین بالوں سے سیاہ ہو رہی تھی حجام نے میرا سر گھوٹا اور جب لوگوں نے میرے ہات سے ماں کے منہ میں آگ ڈلوائی تو میں رو پڑا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں دنیا میں اکیلا ہو گیا ہوں۔ ماں، میں نے کہا، تم نے کیا کبھی سوچا ہو گا کہ مرنے کے بعد لوگ تمہارے ساتھ یہ حرکت بھی کریں گے؟ اس واقعے نے ایک طرح سے مجھے بدل دیا۔ میں نے ان کی چتا پر قسم کھائی کہ ایک دن میں اپنے باپ کو ڈھونڈ نکالونگا اور انھیں بتاؤنگا کہ کیسے ہم نے ایک فرضی نام کے اندر انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا ہے۔ ماں کی موت کے بعد میرے لئے اب اس شہر کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے جب گھر چھوڑا تو میرے ساتھ وہی چرمی سوٹ کیس تھا جو اب بری طرح گھس چکا تھا۔ اس میں اور دوسرے سامان کے ساتھ کاغذ کا وہ

ٹکڑا بھی تھا جس کی پیشانی پر اسکول کا نام درج تھا اور نیچے ہیڈ ماسٹر کے دستخط کے اوپر میرا اور میرے باپ کا فرضی نام، اس شہر کا ٹھکانہ اور پیدائشی تاریخ لکھی تھی۔ اس کاغذ پر مجھے اپنی ماں کا اصلی یا نقلی نام نہ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ میں نے اپنی پہلی فرصت میں اسے جلا ڈالا۔ یوں بھی یہ ہر لحاظ سے ایک بیکار کاغذ تھا جس میں دو فرضی نام لکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک لوکل ٹرین پکڑی جو دھندلے تاروں کے نیچے ٹھنڈی ہوا کو چیرتی ہوئی واپس میرے نانا کے شہر کی طرف جا رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ کے اندر بیٹھا میں دیکھ رہا تھا لوگوں کے چہرے کس قدر ستے ہوئے تھے، جیسے ہر کوئی اپنی کہانی دونوں جبڑوں کے درمیان دبائے بیٹھا ہو۔ اس دن میں نے فیصلہ کیا اس دنیا میں جہاں ہر کسی کی اپنی کہانی ہے، میں اپنی کہانی کسی کو نہیں بتاؤں گا۔

اس پرانے گھر کی سیڑھیاں کافی اونچی اور گھماؤ والی تھیں جن پر فرنیچر کو چڑھاتے وقت بار بار زاویہ بدلنا پڑ رہا تھا۔ چوتھی منزل تک پہنچتے پہنچتے ہم کتے کی طرح ہانپنے لگے۔ صوفہ کو اس کی مخصوص جگہ موزیک کے فرش پر رکھنے کے بعد میرے ساتھی نے انگوچھے سے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا: ”تو تم کہہ رہے تھے کہ تم مسلمان ہو اور تمہاری ماں ہندو تھی؟“

”نہیں، کیا میں نے ایسا کہا؟“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ بھی مسلمان تھی۔ مگر مرنے کے بعد ان کی چتا کو آگ دی گئی۔ اور جن لوگوں نے یہ کیا وہ برے لوگ نہ تھے۔ ہم میں سے ہر کوئی وہی کام کرتا ہے جسے وہ اپنے طور پر اچھا سمجھتا ہے۔“ مجھے اپنی بات پر حیرت ہوئی۔ میں کیسے اتنی لمبی بات کر پایا۔ کیا ماں کی موت کے ساتھ میری گویائی مجھے واپس مل گئی تھیں؟

”تم بیوقوف تو نہیں ہو۔“ میرے ساتھی نے کہا۔ ”یا شاید مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔“

ہم دونوں ہر صبح سڑک پر ایک خاص جگہ بیٹھ کر کام کا انتظار کرتے۔ ہماری کوشش ہوتی کہ ہم ایک ساتھ رہیں۔ ایسا کیوں تھا ہمیں اس کا علم نہ تھا۔ ایک بار ہم دونوں الگ الگ جگہ کام کرنے گئے تو سارا دن مجھے بڑی ویرانی کا احساس ہوا۔ دوسرے دن اس نے بھی کچھ ایسی ہی بات بتائی۔ ایسا نہیں تھا کہ ہم دونوں کے درمیان باتیں کرنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ ہمارے درمیان زیادہ تر خاموشی کی حکمرانی ہوتی۔ مگر دھیرے دھیرے مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہو رہا ہے، کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں کھلتا جا رہا ہوں اور اب ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنی جگہ بدل لوں۔ مگر وہاں پر جگہ بدلنے کے لئے نہیں تھی۔ دہائیوں سے یہ مزدوروں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اور پھر جس چینی دندان ساز کے مطب کے سامنے ہم بیٹھا کرتے وہ ہمارے لئے کافی ساز گار بھی ثابت ہوئی تھی۔ تو کیا یہ میری اس سوچ کا نتیجہ تھا کہ ایک دن وہ اور پھر نظر نہ آیا؟ اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہمشہ کے لئے غائب ہو گیا ہے تو مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ میرے اندر کبھی اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے کی خواہش کیوں نہ پیدا ہوئی؟ مگر خود میں نے اسے اپنی ماں کی موت کے علاوہ اپنے بارے میں اور کچھ بتایا کیوں نہیں تھا؟ خود اس موت کے بارے میں میں نے بات ہی کیوں کی جب کہ اس میں بتانے کے لائق کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ یہ لوگوں کو اور بھی حیران کر سکتی تھی؟ آج مجھے یاد نہیں آتا کہ وہ کیا وجہ تھی کہ ہمارے بیچ ماں کی موت کا تذکرہ آنکلا تھا۔

جیسا کہ میں نے اپنی ماں کی چتا پر قسم کھائی تھی، مجھے اپنی زبان کو قابو میں رکھنا چاہئے۔ مگر شاید میں اپنی آزادی کا غلط استعمال کرنے لگا ہوں۔ ٹرین سے اترنے سے پہلے میں نے اپنا اصلی نام واپس حاصل کر لیا تھا۔ میں نے ایک اور بھی نام رکھ لیا تھا جس کا کوئی بھی مطلب نہیں نکلتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ایسے ایک نام سے کافی سہولت ہوتی ہے۔ سچ پوچھیں تو اس نام سے اگر لوگ مجھے ایک ماہ نہ پکاریں تو میں خود اسے بھول سکتا ہوں۔ مگر میری گلی میں ایک عورت ہے جو مجھ سے دس سال بڑی ہے۔ وہ نہ صرف میرے اصلی نام سے واقف ہے بلکہ اس نے میرے دونوں ناموں کو اچھی طرح سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ یہ گلی جس میں میں کرایے پر رہتا ہوں دو کشادہ سڑکوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ اس گلی کے ایک سرے پر جو سڑک ہے وہاں پولس کی چوکی سے بالکل قریب ہر رنگ و روغن کی طوائفیں کھڑی رہتی ہیں جن کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں دو منزلہ سہ منزلہ گھروں کے اندر بنی ہیں۔ یہ طوائفیں اپنے گاہکوں کے ساتھ ان گھروں میں لوٹتی ہیں جب کہ گلی کے دوسرے سرے پر کھپریل کے ایسے ہی گھروں کے بیچ ایک دو منزلہ مسجد واقع ہے جس کا پھاٹک ایک دوسری کشادہ سڑک پر کھلتا ہے جہاں گوشت کی دکانوں اور بیف ہوٹلوں کی بھرمار ہے اور لنگی کرتا پہنے، سر پر ٹوپی چپکائے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد آدھی رات تک کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اس جگہ وہ نوجوان لڑکے بھی بھیڑ لگاتے ہیں جو کانوں میں بالیاں لٹکائے، کھینی گھستے ہوئے طرح طرح کی گالیاں ایجاد کیا کرتے ہیں اور دکان کے سامنے بینچوں پر بیٹھ کر یا فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر گذرتی عورتوں اور لڑکیوں پر اپنی عقابی نظریں ڈالتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس دنیا میں ان کے آنے کا بس یہی مقصد رہ گیا ہو۔ گرچہ اس عورت کا رنگ میری ماں کی طرح ساونلا ہے مگر اس کا ناک نقشہ میری ماں کے مقابلے زیادہ پرکشش ہے۔ وہ طوائف والے سرے سے آئی ہے جہاں کچھ سال پہلے تک اس کی اپنی ایک کوٹھری تھی اور وہ سڑک پر کھڑی گاہکوں کا انتظار کیا کرتی تھی۔ مگر اب اس نے اس مسجد کے قریب اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہے جہاں وہ اپنے طوطوں کی دیکھ بھال کیا کرتی ہے یا جائے نماز پر بیٹھی تسبیح گنتی رہتی ہے یا پھر پیر فقیر کے مزاروں کی زیارت کرتی پھرتی ہے۔ اس نے اپنے دروازے پر ایک سبز جھنڈا لٹکا رکھا ہے جس پر صندل سے ہاتھ کا نشان بنا ہوا ہے۔ وہ ہر جمعہ اور ہر تہوار پر کسی نہ کسی مولوی کو بلا کر

کسی پیر یا فقیر کے نام پر نیاز یا فاتحہ خوانی کرواتی ہے اور اپنے گھر سے لے کر نکڑ تک لوگوں میں شیرنی تقسیم کرتی ہے جو زیادہ تر چینی یا بتاسے پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسی بہانے اس نے مجھ سے بھی پہچان بنالی ہے۔ ''تمہیں ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو عمر میں تم سے کافی بڑی ہو۔'' اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ''کیا تم نے شادی کے بارے میں سوچا ہے؟ دن گذر جاتے ہیں۔ کیلے کے درخت میں دوبار پھول نہیں آتے۔''

مجھے اس کی بات سن کر کوئی حیرانی نہ ہوئی تھی۔ سچ کہا جائے تو ان دنوں میں ہر وقت شادی کے بارے میں سوچنے لگا ہوں۔ دراصل لاشعوری طور پر میں یہ سوچنے لگا ہوں کیا اپنے باپ کی طرح میں اپنے ہونے والے بچے سے پیچھا چھڑا سکتا ہوں؟ میں نے اس عورت کو ایک مرد کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اس کا ناک نقشہ کافی پرکشش ہے۔ صرف اس کا پیٹ کافی بڑا ہے جیسے اس کے اندر کوئی ٹیومر پل رہا ہو۔ اس جیسی بڑے پیٹ والی عورتوں کے لئے ایک خاص طرح کے مردوں کے اندر کافی کشش ہوتی ہوگی، مگر میں وہ مرد نہیں تھا۔ اور فالحال میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں رہا ہوں۔ میں تو صرف شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ نہیں میں شادی کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں بلکہ اس شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ لیکن شاید میں اپنے ہونے والے بچے سے زیادہ یہ سوچ رہا ہوں کہ اس سے پیچھا چھڑانا کیسا رہے گا۔ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ میں جو اتنا کچھ سوچتا ہوں اور اتنا کم بول پاتا ہوں کیا میں اس کا اہل بھی ہوں کہ مجھ سے کسی عورت کا حمل ٹھہر جائے، خاص طور پر ایک ایسی عورت کا جس کے پیٹ میں ٹیومر پل رہا ہو۔ کچھ دنوں سے وہ میرے لئے اچھی اچھی چیزیں پکا کر لانے لگی ہے کیونکہ میرے کمرے تک پہنچنے کے لئے اسے صرف گلی پار کرنی پڑتی ہے۔ اس کے گھر میں ایک چھوٹا سا آنگن ہے اور ایک برامدہ جہاں کئی لوہے کے پنجڑے جھپر کے کنڈوں سے لٹکتے رہتے ہیں۔ ان پنجڑوں کے اندر سبز رنگ کے طوطے بند ہیں جو رہ رہ کر کرخت آوازیں نکالنے کے عادی ہیں۔ باقی وقتوں میں یا تو وہ چپ کھڑے رہتے ہیں

یا پانی اور چنے کے پیالوں میں چونچ ڈالتے نظر آتے ہیں۔ ان طوطوں کے سبب نیچے کا فرش ہمیشہ گیلا رہتا ہے جسے صاف رکھنے کے لئے اسے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ ان طوطوں کو کبھی کوئی زبان نہیں سکھاتی۔ ''میں نے ان کے کاروبار میں اچھا پیسہ بنایا ہے۔ یہ طوطے کرشمے دکھاتے ہیں۔'' ایک دن اسنے مجھے بتایا۔ ''میں نے بہت گناہوں بھری زندگی گذاری ہے۔ کیا سمجھتے ہو خدا مجھے معاف کرے گا؟ لیکن میں نے کافی دکھ بھی اٹھائے ہیں۔ کیا میرے ساتھ انصاف ہوگا؟''

''مجھے نہیں معلوم خدا کیا سوچتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اس حقیقت سے میں انکار نہیں کرتا کہ خدا کو سمجھنے کے لئے میرے پاس کبھی مناسب وقت نہیں رہا۔ بس واقعات یکے بعد دیگے پیش آتے گئے۔ جنگیں چھڑیں، لوگوں کا قتل عام ہوا، سرحدیں پھر سے بنیں۔ جیل خانے بھرے گئے۔ لوگ سلاخوں کے آر پار ایک دوسرے کو دیکھنے کے عادی ہوتے گئے۔ آزادی کی تقریبات شروع ہوئیں، لیکن کسی کو پتہ نہ تھا وہ کس بات کی خوشی منا رہے تھے۔ لوگوں نے فینسی ڈریس کی رسم اپنائی۔ عجیب و غریب نقابوں کی روایت پڑی۔ کچھ لوگوں نے کہا، یہ دنیا ایک عارضی جگہ ہے۔ تمہیں اصلی دنیا کے لئے کچھ کرنا چاہئے، وہاں جہاں زمین کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جہاں کے پھل دائمی ہیں اور سایہ لازوال ہے۔ وہاں تمہاری ہر طرح کی خواہشات کی تکمیل ہوگی جن پر دنیا میں روک لگادی گئی ہے مگر اس سے پہلے تمہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ کچھ لوگوں نے کہا، تمہیں بائیں سمت چلنی چاہئے۔ سچائی صرف بائیں طرف ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے؟ میں نے کچھ عرصہ تک ان کا ساتھ بھی دیا یہ جانے بغیر کہ اس سے آسمان کے نیچے کیا تبدیلی آنے والی تھی۔ شروع کی طرف میں نے کام کی تلاش میں لوکل ٹرین میں دور دور تک سفر کیا مگر ہر بار یہ سفر کسی نہ کسی دریا کے کنارے ختم ہو جاتا، وہاں جہاں کشتیاں ندی پر اینٹ، ریت اور جانور ڈھویا کرتیں یا پھر دور آسمان کے نیچے فیکٹری کی چمنیاں آگ اور دھواں اگلا کرتیں یا پھر ایک آدھ بازار ایسا نکل آتا جس کے آس پاس کوئی نہ کوئی ریلوے پل ضرور ہوتا جس پر زیادہ تر مال بردار ٹرینیں دوڑا کرتیں اور پل کے نیچے طوائفیں کھڑی گاہکوں کا انتظار کرتیں۔ ایسے ہی کسی سفر کے دوران میں نے اپنے ساتھی مسافروں سے کہا، کیا برا ہے اگر میں نے اپنے سارے دروازے کھول رکھے ہیں۔ مگر سب کی یہی رائے تھی کہ تم بیک وقت ہر کسی کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ تمہیں چننا پڑتا ہے، تمہیں فیصلہ کرنا پڑتا ہے، کہیں نہ کہیں اپنا لنگر ڈالنا پڑتا ہے۔ دوسرے وقتوں میں کسی نے مجھے رائے دی، تمہیں نئے شناختی کاغذات کی ضرورت ہے، ایسے کاغذات جن کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر نہ ہونے سے کافی فرق پڑ جاتا ہے۔ لیکن میری کشتی کو رکنے کے لئے کوئی جگہ میسر نہ تھی۔ میرے سارے کنارے کٹ چکے تھے۔ اور اپنے باپ کی طرح میں کسی فرضی نام کے ساتھ مرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیا آپ نے یہ کہانی بار بار نہیں سنی ہے؟

اس عورت نے دھیرے دھیرے میری ساری کمزوریاں پڑھ لی ہیں۔ اس نے اپنی دانشمند آنکھوں کا بھرپور استعمال کیا تھا جس کے بدولت وہ طوطوں کے کاروبار میں کافی کامیاب رہی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں جانے کیوں ہمیشہ ایک سرنار تھیوں سے بھرے جہاز کو دیکھا کرتا جس کے عرشے پر میرا باپ ہمیشہ اپنے سوٹ کیس اور کوٹ کے ساتھ کھڑے دکھائی دیتے اور مجھے اس پر حیرت ہوتی کہ کتنا عرصہ گذر گیا ہے مگر آج بھی وہ اسی جگہ اسی حالت میں کھڑے ہیں۔ شاید نئے ملک میں انھوں نے اپنے

لئے ایک نیا نام تجویز کر لیا ہو۔ کاش ایسے کسی جہاز سے اترے ہوئے کسی مسافر کا مجھے علم ہوتا۔ میں اس سے اس جہاز کے اندر پیش آنے والے واقعات کی جانکاری حاصل کرتا۔ مگر میرے لئے شاید کہیں پر کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

اس رات سب کچھ کسی طئے شدہ پروگرام کے تحت نہیں ہوا تھا۔ میں آئس کریم کی ٹرالی جمع کر کے واپس لوٹا تھا۔ واپسی پر ہر رات میں جس ہوٹل میں کھانا کھایا کرتا تا اس کے باہر راکھ پر لوٹتے کتے ہمیشہ خود کو پرچھائیوں کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کیا کرتے۔ اس رات میں ہوٹل سے کھانا کھا کر باہر نکلا تو میں نے دیکھا کتے کسی وجہ سے بالکل چپ تھے بلکہ جو جہاں پر تھے اپنی جگہ بے حرکت کھڑے تھے۔ ان کتوں کی طرف تاکتے ہوئے جانے کیوں مجھے شدید اکیلے پن کا احساس ہوا اور واپسی پر میں نے اپنے گھر کی بجائے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہت دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بھی جب اس نے دروازہ نہیں کھولا تو میں مایوس ہو کر واپس لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا جب اس کی کھڑکی کھل گئی۔ وہ سلاخوں کو تھامے کھڑی تھی، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ متوحش آنکھوں سے میری طرف تاک رہی تھی۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی اس نے پھر سے کھڑکی بند کر لی۔ دوسری صبح اس نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں کافی گہری نیند سے جاگا تھا۔ آج اس نے کافی صاف ستھرے لباس پہن رکھے تھے اور چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی چڑھا رکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کسی مرد کا سامنا کئے ہوئے اسے ایک لمبا عرصہ بیت گیا ہے۔ دراصل میں اتنا اچانک وارد ہو گیا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ تم جہنم جا سکتی ہو، میں نے کہا۔ میں یہ جملہ کئی بار سن چکی ہوں، وہ ہنسی، مگر پہلی بار مجھے لگ رہا ہے کہ اس کا ایک مطلب بھی ہے۔ وہ چارپائی پر میرے پہلو میں بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر میرے ننگے سینے پر رکھ دیا۔ آج اس نے سرمہ لگا رکھا تھا جس کے سبب اس کی آنکھیں کافی بڑی نظر آ رہی تھیں اور اس کے بالوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی جس نے میرے اندر نفسانی خواہش کو جاگنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس کی ننگی گردن کو چوم رہا تھا، اس کی پشت کو سہلا رہا تھا جب۔۔۔ تمہیں یہ خوشبو پسند ہے؟ اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ”یہ تیل میں نے کیوڑے کے پھولوں سے خود بنایا ہے۔“ اور اس نے خود کو مجھ سے الگ کر لیا۔ میں دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آج رات ہم سارے معاملات سلجھا لیں گے، اس نے کہا اور چلی گئی۔ اس رات اس نے پوری تیاری کر لی تھی۔ ہم دیر تک اس کے اندرونی برامدے میں کھڑے طوطوں سے باتیں کرتے رہے۔ رات گہری ہو چکی تھی اور چھپروں کے اوپر گرم ہوا چل رہی تھی جب وہ میرے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ آج اس کا کمرا کافی سجا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکیوں پر نئے پردے ٹانگ رکھے تھے۔ ہم نے بستر پر بیٹھ کر دیر تک گفتگو کی جس کا کوئی سر پیر نہ تھا جیسے ہمارا مقصد صرف وقت کو پیچھے کی طرف ڈھکیلنا ہو۔ مگر پھر ہماری گفتگو کے اندر کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ اس دن میں نے کسی عورت کو پہلی بار اس کے اصلی روپ میں دیکھا۔ وہ ننگی ہوئی تو اس کا پیٹ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس کا پیٹ تو اتنا بڑا نہیں تھا جتنا کپڑا پہننے پر دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ایک نئی عورت کی طرح میرا سامنا کیا۔ اسے کراہنے کا فن معلوم تھا۔ مگر میری طرف سے سب کچھ اتنی جلد ہو گیا کہ اسے تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی۔ اس نے کہا، تم نے میری نئی چادر خراب کر دی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس معاملے میں تم بالکل اناڑی ہو۔ تمہیں پتہ ہے تم نے اپنی زندگی کے کتنے قیمتی سال کھو دیے ہیں؟ میں تمہیں ایسے لڑکوں کے بارے میں بتا سکتی ہوں جو تم سے آدھی عمر کے تھے، جن کی مسیں ابھی بھیگی بھی نہ تھیں، جو میرے پاس آیا کرتے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، عورت، ہم اسے بستر پر جانے بغیر اس دنیا یا آخرت کے بارے میں کچھ بھی تو یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ بعد میں جب ہم ننگے لیٹے ہوئے چھپر کی طرف تاک رہے تھے تو اس نے مجھے بتایا، جس طرح تجربہ کے بغیر آدمی اناڑی ثابت ہوتا ہے، اسی طرح حد سے زیادہ تجربہ انسان کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔ ہم اپنی سوچ کے غلام بن جاتے ہیں۔ شاید ہم نے جلد بازی کی تھی۔ اتنے سالوں تک ایک فرضی نام کے ساتھ (اس نے اپنی بدنامی کے دنوں میں کئی بار نام بدلے تھے) بھانت بھانت کے مردوں کا سامنا کرنے کے بعد اسے کچھ اور وقت چاہئے تھا۔ میں خوفزدہ تھی، پہلے کی طرح تمہارے لئے صرف ایک گوشت پوست کا لوتھڑا نہ بن کر رہ جاؤں۔ اس لئے میں اب تمہیں اپنا اصلی نام بتانا چاہتی ہوں۔ کیا تم اسے جاننا چاہو گے؟ اور تم میرے کراہنے پر نہ جاؤ۔ یہ میری پرانی عادت ہے جس سے میں گاہکوں کو فریب دیا کرتی تھی۔ اس سے وہ جلد بازی سے کام لینے پر مجبور ہو جاتے۔ میں ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ مجھے کمرے کا کرایہ دینا پڑتا، دوسرے اور بھی اخراجات تھے، اور پھر میری طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ مجھے اس پر قابو پانا ہو گا۔ میں چاہتی ہوں، جب بھی میں تمہارے پاس آؤں میں وہ بن جاؤں جو اس بدنامی کی زندگی سے پہلے تھی۔ اور اس نے مجھے اپنا اصلی نام بتایا۔ مگر اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے کہا، تم کہنا کیا چاہتی ہو، ہمارے تجربات دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں جو آپس میں الجھ جاتے ہیں؟ ایسا صرف اس لئے ہوتا ہے کیونکہ ہم جیسوں کے پاس کبھی کوئی منصوبہ نہیں ہوتا۔ ہم بس جیتے ہوئے مر جاتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے، ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے ساری زندگی انسانیت کی خدمت کی۔ انھوں نے بھوکوں کے لئے کھانے کا انتظام کیا، اپاہجوں کو بیساکھیاں بانٹیں، خدا کی طرف سے پیغامات نشر کئے جنھیں قبول نہ کرنے والوں کے لئے کوڑے مخصوص تھے، مگر آخر میں انھیں بھی اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ انھوں نے ایسے جہاز بنائے تھے جو بے وطنوں کو ان کے وطن پہنچانے والے تھے مگر یہ جہاز کبھی کنارے پہنچنے والے نہ تھے۔ اس نے حامی بھرتے ہوئے کہا، میں جانتی ہوں، میں نے ایسے لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل سے ثواب کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک بار ایک سینی ٹوریم میں داخلہ لیا تھا۔ میرے پھیپھڑوں پر داغ آ گئے تھے۔ میں مرتے مرتے بچی۔ مگر وہاں مجھے اپنے پھیپھڑوں کے بارے میں اتنا کچھ بتایا گیا کہ ان

پر عمل کرنا مشکل تھا۔ وہاں میرا بہت سارا پیسہ برباد ہو گیا۔ تو میں نے صرف یہ کیا کہ پرانا دھندا چھوڑ دیا۔ اب پاک پنجتن کی عنایت سے میں روز نہیں مرتی۔ یہ تو اچھی بات ہے، میں نے کہا۔ اس سے سب کچھ وہی رہتے ہوئے بھی تمہاری دنیا آسان ہو گئی ہو گی۔ مگر تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟ مسعودہ، یہی نام بتایا ہے نا تم نے اپنا؟ میں نہیں جانتا، میں تمہارے اس نام کا کیا کرونگا؟ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم میری اصلیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں طاقتیں ہیں، جنھیں تم جانتے بھی نہیں، جو تمہارے خلاف کام کرتی رہتی ہیں اور تمہارے پاس اپنی شکست تسلیم کرنے کے علاوہ انھیں روکنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی شکست تسلیم کر لو، کسی جگہ ٹھہر جاؤ۔ کسی کے ساتھ ٹھہر جاؤ۔ تم میرے ساتھ ٹھہر جاؤ۔ ہم دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے نکاح کر لیں گے۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ میں نے کہا۔ کیا تم مجھے کسی خطرے سے بچانا چاہتی ہو؟ کیا تم نے ہمیشہ اس طرح کا کام کیا ہے؟ کیا تمہارے پاس بھی کوئی جہاز ہے؟ اس نے جواب دیا، اسے شک ہے وہ ایسے کسی کام کی اہل بھی ہے۔ کیا ایک ایسی دنیا میں جہاں ایک چھدام کے لئے لوگ شور مچاتے ہوں، یہ ممکن ہے کہ آدمی اتنی آسانی سے کسی کی دنیا بدل دے، یا اپنے ماحول سے الگ ہو کر اپنے لئے ایک نئی دنیا بنالے۔ ہمیں بس ڈھنگ سے کچھ سال جی لینے چاہئیں۔ اور تم جس جہاز کی بات کر رہے ہو، وہ کبھی واپس نہیں لوٹتا۔ یہ دنیا بس اسی طرح ہے۔ تمہیں پانی پر بس ایک کوڑے کے ڈھیر کی طرح تیرتے رہنا ہے۔ ہو سکتا ہے اس پر مٹی جمتے جمتے کوئی پودا نکل آئے اور ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لے جیسا کہ میں نے اپنے گاؤں میں دیکھا ہے۔

اس گلی میں ناریل کے کئی پیڑ تھے جو دھول سے اٹے ہوئے تھے اور چھپروں کے بیچ سے اس طرح نکلے ہوئے تھے جیسے خبیث اپنے بال بکھرائے کھڑے ہوں۔ ان کے پتوں میں پرندے کبھی کبھار رات کے وقت بلاوجہ واویلا مچایا کرتے جیسے ان کا کوئی خاندانی تنازع سامنے آگیا ہو۔ مسجد کی طرف برگد کا ایک لحیم شحیم پیڑ تھا جس میں گرمی کے آتے ہی کوئلیں کوکنے لگتیں۔ وہ دن بھر بلا تکان کوکتیں۔ انھیں بس مسجد کے میناروں سے بندھے ہوئے لاؤڈ اسپیکروں سے آتی اذان کی کرخت آواز ہی چپ کرا پاتی۔ مگر یہ دیرپا ثابت نہ ہوتا۔ کچھ ہی دیر کے بعد کوئلیں شدہ مد کے ساتھ کوکنا شروع کر دیتیں۔ ہر رات مجھ سے لپٹ کر وہ چین کی نیند سو جاتی اور میں اس کے پھیپھڑوں کی آواز سنتا رہتا جیسے کوئی اس کے اندر کاغذ مروڑ رہا ہو۔ کبھی کبھار وہ اچانک غیر متوقع طور پر خراٹے لینا شروع کر دیتی اور میں دیر تک جاگے رہنے پر مجبور ہو جاتا۔ مگر کسی کسی رات وہ چونک کر جاگ اٹھتی۔ اس وقت اسے اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہ رہتا۔ وہ اٹھ کر اندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر ننگی کھڑی ہو جاتی اور آنگن کی آوازوں کو سننے کی کوشش کرتی۔ کمرے کے اندھیرے میں ایسا لگتا جیسے وہ کل ملا کر ایک بڑا سا پیٹ ہو جس میں اس کی دونوں ٹانگیں اور ہات غلط سمت میں گتھے ہوئے ہوں۔ تم سن رہے ہو، وہ سرگوشی کرتی، رات کی اپنی ایک بہت ہی پراسرار دنیا ہوتی ہے۔ میں اس دنیا کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ میں پہاڑوں سے گھرے ہوئے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک جانور بن گیا ہوں جب کہ وہ ابھی بھی ایک عورت ہے اور میں کسی وحشی درندے کی طرح اپنی شہوانی خواہش پوری کر رہا ہوں۔ جانے یہ کتنی دیر تک چلتا ہے جب ہیجانِ شہوت سے میری نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں، وہ مجھ سے لپٹی ہوئی ہے اور خود بھی شہوانیت کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس نے سرگوشی میں کہا، تم ایک حیرت انگیز انسان ہو۔ اگر میں تم سے نہ ملی ہوتی تو کبھی شہوت کے اس ہیجان کو جان نہ پاتی۔ مجھے لگ رہا ہے میں اپنے کنوارے دنوں میں لوٹ رہی ہوں جب میں گاؤں میں بڑی ہو رہی تھی اور ہم سہیلیاں ایک دوسرے کو اپنی ماہواری کے قصے سنایا کرتیں۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک ساتھ اپنا گاؤں لوٹ سکتے ہیں۔ وہاں ہمارا پشتینی مکان ہے جس میں میرا ایک ذاتی کمرا ہے۔ میرے رشتے دار میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ وہ اس کمرے پر قبضہ جما سکیں۔ تمہیں دیکھ کر انھیں مایوسی ہو گی۔

گاؤں! گرم تکیہ کے اندر اپنے دونوں کانوں تک دھنسا ہوا میں روئی کے اندر کے سناٹوں کو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیوں نہیں، اور اس کے لئے ذاتی طور پر میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ اس واقعہ کے دو مہینے بعد اس نے مجھے اپنے گاؤں کے بارے میں مزید جانکاری دی۔ اس نے کہا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، اس کے پاس ایک بہت ہی کمزور پھیپھڑا ہے اور شہر کی آلودگی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے، وہ اگر گاؤں لوٹ جائے تو شاید کچھ اور برس جی لے۔ میں نے کہا، کیا یہ ضرورت سے زیادہ چاہنے کی طرح نہیں ہے؟ نہیں، اس نے کہا، یہ زندہ رہنے کی ایک عام خواہش ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتی ہے۔ میں نے اس گاؤں کو اپنے آخری وقت کے لئے بچا کر رکھا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے، میں نے کہا۔ پھر تو میرے پاس کوئی راستہ نہیں بچتا، مگر شرط یہ ہے کہ جب تم اپنا گاؤں پہنچو تو میں اپنا منہ بند رکھونگا۔ ساری بات تم کرو گی۔ تم اپنے لوگوں کو زیادہ اچھی طرح سے جانتی ہو۔ کیا ان کو تمہارے ماضی کے بارے میں پتہ ہے؟ تمہیں یہ سوچ کر ڈر نہیں لگتا کہ جانے وہ تمہارے ساتھ کس طرح سے پیش آئیں گے۔ تمہیں خوامخواہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، وہ بولی۔ میں وہاں جاتی رہتی ہوں۔ وہاں سارے لوگ میرے بارے میں جانتے ہیں۔ لیکن وہ خود اس کا یقین کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اب دنیا بدل چکی ہے۔ اور پھر تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر وہ اپنی زبان بند کر لیں گے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ ان دنوں میں موت کے فرشتے کو بار بار دیکھنے لگی ہوں۔ اس کے پروں میں تلواروں کی سی دھار ہے جن سے خون ٹپکتے رہتے ہیں۔ میں کبھی کبھار بری طرح نروس ہو جاتی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں نیند کی حالت میں ہی میری موت نہ ہو جائے۔ کیا واقعی تم میرے ساتھ آرہے ہو؟

میں اس دریا کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ کرنا چاہوں گا۔ اس کے دونوں کنارے کئی سنگلاخ پہاڑ ہیں جو بہت زیادہ اونچے نہیں اٹھتے۔ ان پہاڑوں میں ننگی چٹانوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں، ان کے نیچے کے میدانوں میں کافی گہرے ڈھلان ہیں جن پر سال کے پرانے جنگلوں کے شانہ بہ شانہ یوکلپٹس کے پیڑ لہراتے رہتے ہیں جنھیں محکمہ جنگلات نے اگایا ہے۔ ان ڈھلانوں سے گذر کر دریا جیسے جیسے نیچے کی طرف اترتا گیا ہے وہ کشادہ ہوتا گیا ہے، مگر اوپر کی طرف جہاں مسعودہ کا گاؤں واقع ہے اس کے پانی میں بھنور بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ مگر یہ اپنے آپ میں اتنا اہم نہیں جتنی یہ بات کہ اس کے دونوں کنارے کے ڈھلانوں پر سال کے درختوں کے بیچ کچھ پرانے مکانوں کے کھنڈر اب بھی کھڑے ہیں۔ ان گھروں کے یہاں بنانے کی کیا وجہ رہی ہوگی اور وہ کیا مجبوری رہی ہوگی کہ لوگ نقلِ مکانی پر مجبور ہوئے؟ اس دریا کا پانی بہت زیادہ گہرا ہے، مگر کنارے کی طرف اس کا پانی کافی گاڑھا ہو کر کہیں کہیں رک سا گیا ہے جس میں طرح طرح کے رنگ تیرتے رہتے ہیں جنھوں نے پانی سے نکلی ہوئی چٹانوں کے زیریں حصوں میں عجیب طرح کی مصوری کر رکھی ہے۔ یہ رنگ شاید ان کل کارخانوں کی دین ہوں جو پہاڑوں کے سبب نظر نہیں آتے یا شاید کسی تھرمل پاور اسٹیشن کا گندا مواد بہتا ہوا اس کے ساتھ مل گیا ہو۔ ان رنگین کناروں میں ناگ پھنی کے پودے دور تک چلے گئے ہیں۔ جگہ جگہ پانی سے فرن کے رنگین پتے بھی نکلے ہوئے ہیں جو، جیسا کہ مسعودہ نے بتایا، بارش کے دنوں میں پانی کے اندر ڈوب جاتے ہیں۔ آخر ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ اور تم ایک دریا سے کیا امید رکھتی ہو؟ میں نے اس سے پوچھا۔ تم اس کے پانی کو سمجھنے کی کوشش مت کرو، اس نے جواب دیا۔ میں اپنے بچپن سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتی آئی ہوں۔ یہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ اس کا یہ جواب میری تشفی کے لئے کافی نہ تھا۔ اس کے گاؤں نے مجھے بہت زیادہ متاثر بھی نہیں کیا۔ اس میں نہ کوئی پختہ کا راستہ تھا نہ کوئی سرکاری نل۔ ایسا لگتا ہے جیسے سرکار کے تمام ترقیاتی منصوبے یہاں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ زیادہ تر گھروں کی چھتیں ٹن کی تھیں۔ اس میں بجلی بس ایک دو گھنٹے کے لئے آتی جس کے لئے زیادہ تر لوگ ہُک کا استعمال کرتے۔ اس کے اپنے گھر میں کم و بیش وہی حالات تھے جن سے اپنا پیدائشی وطن واپس لوٹنے پر میری ماں کو سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہم نے اوبڑ کھابڑ راستوں پر سرکاری بس کا ایک لمبا سفر طئے کیا تھا اور بہت دیر سے پہنچے تھے جب سورج کا خون ہو چکا تھا اور آسمان کی گہرائیوں سے اندھیرا اتر رہا تھا۔ مسعودہ کے کمرے کو کسی طرح رات گذارنے کے قابل بنا کر ہم نے اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا کھایا۔ دوسری صبح وہ سویرے سویرے جاگ گئی۔ گھر صاف کرنے میں اسے آدھا دن لگ گیا۔ اس کے کمرے میں پرانے دنوں کے کئی بھاری فرنیچر تھے جن کے پایوں اور لٹووں پر کی گئی کاریگری نے مجھے حیران کر دیا۔ کیا ان دنوں لوگوں کے پاس اتنی فرصت تھی؟ گھر کے دوسرے لوگوں نے ہم سے گفتگو کرنے سے احتراز کیا تھا۔ ہم اب بھی شہر سے لایا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔ دن ختم ہو رہا تھا جب ہم کچھ ضروری سامان خریدنے بازار گئے۔ بازار ہمیں پسند آیا۔ وہ ایک کافی پرانی مسجد کے احاطے کے گرد بنا ہوا تھا۔ مسجد کے بیرونی برامدے پر درزی اپنی مشینوں پر بیٹھے کپڑے سی رہے تھے۔ برامدے کی کئی سیڑھیاں تھیں جن میں سے ایک پر ایک نانبائی کی دکان تھی۔ بازار میں ضرورت کے تقریباً سبھی سامان موجود تھے۔ دھیرے دھیرے گھر کے لوگوں کو میں پہچاننے لگا۔ ایک بوڑھی عورت تھی جس کا چہرا چھوارے کی طرح سوکھا ہوا تھا۔ اس کے بال کافی لانبے تھے جنھیں وہ چارپائی کے ادوائن پر بکھیر کر ہمیشہ ان سے جوئیں نکالا کرتی۔ میں نے ایک دن اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو مجھے پتہ چلا وہ نیپٹ بہری تھی۔ میں نے اس کے لئے ایک ساری خریدی۔ میں نے ایک تیرا چودا برس کی لڑکی کو دیکھا جو حمل کے آخری اسٹیج پر تھی اور ہمیشہ رنگین ساری پہنے رہتی۔ مجھے پتہ چلا گاؤں کے پچھلے پیش امام کے ساتھ اس کی شادی کر دی گئی تھی جو اس کے حمل کے ٹھہرنے کے بعد اچانک ایک دن لاپتہ ہو گیا تھا۔ مسعودہ نے بتایا کہ یہ اس پیش امام کا پرانا پیشہ تھا جس کا پتہ گاؤں والوں کو اس کے جانے کے بعد چلا تھا۔ باقی عورتیں مجھے دیکھتے ہی لمبے گھونگٹ نکال لیتیں۔ دھیرے دھیرے بچے میرے قریب آنے لگے۔ میں ان کے لئے پلاسٹک کے سستے کھلونے اور بسکٹ لایا کرتا، اینٹ سجا کر ان کے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتا۔ گھر کے زیادہ تر مرد شہروں میں کام کرتے تھے اور مہینہ میں ایک دو دن کے لئے گھر آتے تو سارا وقت اپنی بیوی کے پاس بیٹھے رہتے بلکہ دن میں بھی کمرے میں ایک آدھ بار بیوی کے ساتھ بند ہونے سے نہیں جھجکتے۔ انھوں نے ہمارے رشتے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا، مگر یہ بات وہیں پر ختم ہو گئی تھی۔ میں نے بھی جان بوجھ کر ان سے دوری قائم رکھی۔ شروع شروع میں مسعودہ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ پھر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے کہا، میں ٹھیک نہیں کر رہا ہوں، مجھے ان بچوں سے دور رہنا چاہئے۔ اس سے پیچیدگیاں بڑھ سکتی ہیں۔ وقت کاٹنے کے لئے میں گاؤں کے اندر اکیلا گھوما کرتا۔ مگر یہ گاؤں اتنا چھوٹا تھا کہ جدھر بھی جاؤ راستہ بہت جلد ختم ہو جاتا اور پھر چھوٹے موٹے تالاب نظر آنے لگتے یا بانس کے جھنڈ جن کے بیچ سبزی کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا جہاں پر دلچسپی کے لائق کچھ بھی نہ تھا سوائے پرانی شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے اُن بھچکاگ کے جو سر کی جگہ ہانڈیاں اٹھائے بانس پر کھڑے تھے مگر پرندے ان سے ڈرنے کی بجائے عین ان کے سروں پر بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھار دریا کے کنارے کنارے چلتا ہوا میں سال کے جنگل میں چلا جاتا اور بوسیدہ گھروں کے کھنڈروں کے درمیان چکر لگایا کرتا۔ ان گھروں کی زیادہ تر دیواریں ڈھ چکی تھیں، چوکھٹ اور روشندان نکال لئے گئے تھے مگر ان کے باغیچوں کے اندر کھڑے پیڑ اب بھی گھنے تھے جن میں ایک پر میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا شہد کا چھتہ لٹکتے دیکھا۔ ان کھنڈروں کے اندر چیونٹیوں نے مٹی کے کافی بڑے بڑے ٹیلے بنا رکھے تھے جن میں سے کسی کسی نے تو کسی پیڑ کے تنے کو نصف حصے تک ڈھک رکھا تھا۔ یہاں بھی ناگ پھنی کے پودے تھے مگر اب انھیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے انھیں کوڑھ کی بیماری ہو گئی ہو جن کے پھوڑوں سے پیپ نکل رہی ہو۔ مجھے یہ سوچ کر

حیرت ہوئی کہ کبھی ان کھنڈروں میں زندگی کی چہکاریں گونجا کرتی ہونگی۔ بلکہ ایک جگہ کھڑے ہو کر مجھے ایسا لگا جیسے میں ان آوازوں کو سن سکتا ہوں۔ مگر بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ یہ شہد مکھی کا ایک چھتہ تھا جہاں سے یہ آواز آرہی تھی۔ یا پھر کون جانے یہ میرا تصور بھی ہو سکتا تھا۔ شاید کوئی ان دیکھا بھنورا آس پاس بھنبھنا رہا ہو۔ ایک دن میں نے مسعودہ سے کہا کہ میں اس دریا کو اور اس کے کنارے کے کھنڈروں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے ایک بار پھر ہوشیار کیا کہ میں اس دریا سے دور رہوں تو بہتر ہے۔ اس میں ہر سال کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے۔ میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ یہ ایک معمولی سا دریا ہی تو تھا، شاید ایک بڑا سا پہاڑی نالا جس میں پانی کا اچھا ذریعہ تھا اور جو کہیں کہیں چٹانوں کے بیچ کسی کنویں کی طرح گہرا ہو گیا تھا۔ مگر مجھے بہت جلد پتہ چل گیا کہ اس کا کہنا صحیح تھا۔ ہمیں وہاں آئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ رہ رہ کر وہ بیمار پڑنے لگی تھی اور گاؤں کے واحد ہومیو پیتھی ڈاکٹر کی دائمی مریض بن چکی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا، اس کا ٹیومر اپنا جلوہ دکھانے لگا ہے، مگر اسے زیادہ خطرہ اس کے پھیپھڑوں سے ہے جو کاغذ کی طرح سوکھ چکے ہیں۔ مگر وہ میری دوا سے ٹھیک ہو جائے گی۔ میں نے اس سے بھی خراب مریضوں کو ٹھیک کیا ہے۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ پہلے وہ سائکل پر چوری کا کوئلہ ڈھویا کرتا تھا، لیکن کوئلے سے زیادہ اسے لوگوں کی بیماریوں سے دلچسپی ہو گئی۔ تو اس نے ہومیو پیتھی کی دوا کے بارے میں جاننا شروع کر دیا۔ اس نے کچھ دنوں تک ایک ہومیو پیتھ کے یہاں پڑیا باندھنے کا کام کیا اور پھر اس دور دراز گاؤں میں یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ میں نے سوچا، اس کام کے لئے اس گاؤں کا انتخاب صحیح تھا۔ یہاں پر کوسوں دور تک کوئی تھانہ تھانہ پولس کی چوکی۔ اور پھر ملک کے ہر گاؤں کی طرح اس گاؤں کو بھی ایک نیم حکیم کی ضرورت تھی۔ یہ اس کا ایک بنیادی حق تھا۔

مسعودہ ایک لمبی بیماری کے بعد کچھ دنوں سے کافی اچھا محسوس کر رہی تھی۔ گرمی کا موسم ختم ہو رہا تھا۔ اس دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم کافی گہری نیند سوئے۔ میں جاگ کر باہری برامدے میں مٹی کے گھڑے کے ٹھنڈے پانی سے منہ دھو رہا تھا جب میں نے دیکھا گھر کے سارے دروازے بند پڑے تھے۔ میں آنگن میں آیا۔ گھر پر کوئی فرد نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف بوڑھی عورت اپنی چارپائی پر بیٹھی اپنے لمبے سن کی طرح سفید بالوں میں تیل لگا رہی تھی۔ یہ اس کی موت سے سات ماہ پہلے کا واقعہ تھا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر اٹھی تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے اپنی ساری دکھائی جسے اس نے غسل کے بعد اپنے جسم پر لپیٹا تھا۔ یہ میری دی ہوئی ساری نہ تھی، مگر وہ شاید ایسا ہی کچھ سمجھ رہی تھی۔ میں باہر آیا تو سامنے کا کچا راستہ اور اس کے کنارے کے اوکھ کے کھیت اور ٹن کے چھپروں والے اکے دکے گھر قبرستان کی طرح خاموش نظر آئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا گاؤں ہمیں اکیلا چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہو۔ میں نے مسعودہ کو نیند سے جگا کر جب اس واقعے کے بارے میں بتایا تو پہلے تو اس کا چہرا فق پڑ گیا، پھر اس نے کہا، ہم اسے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ میری دوا ختم ہو چکی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلوگے؟ اس نے میرے لئے چائے بنائی۔ ہم نے کپڑے بدلے اور بازار کی طرف چل دئے۔ بازار میں زیادہ تر دکانیں بند تھیں۔ جو کھلی تھیں وہ سنسان پڑی تھیں۔ خود وہ ہومیو پیتھی کا جعلی ڈاکٹر بھی غائب تھا جب کہ اس کا مطب کھلا ہوا تھا جو مسجد کے ایک کمرے میں واقع تھا۔ اس کی سائکل باہر اپنی جگہ کھڑی تھی۔ ہم وہاں اس کا انتظار کر رہے تھے جب مسجد کا لکڑی کا پھاٹک کھول کر ایک دبلا پتلا آدمی باہر آیا جس کے سر پر ایک بھی بال نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ تمام لوگ دریا کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ جب ہم نے سبب جاننا چاہا تو اس نے آسمان کی طرف اشارا کیا جس میں چیل اور کوے اڑ رہے تھے۔ ہم نے آسمان سے نظریں ہٹائیں تو دیکھا وہ آدمی جا چکا تھا۔ چونکہ ہم دوا لئے بغیر واپس نہیں لوٹ سکتے تھے ہم بھی دریا کی طرف ہو لئے۔ ہم دریا سے تھوڑے فاصلے پر تھے جب ہم نے محسوس کیا آسمان میں چیل اور کوے اچھی خاصی تعداد میں اڑ رہے تھے جو ان ویرانوں کے لئے حیرت کی بات تھی۔ ہمیں دریا کے دونوں کنارے لوگوں کا بھاری ہجوم نظر آیا جیسے وہاں پر کوئی میلا لگا ہوا ہو۔ لوگ بہتے پانی پر نظریں ٹکائے کھڑے تھے اور وقفے وقفے سے شور مچا رہے تھے۔ وہ رہ رہ کر انگلی سے دریا کی طرف اشارے بھی کرتے جاتے۔ اگلی بار شور اٹھا تو لوگوں کی انگلیوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہم نے دیکھا دریا کے پانی میں کوئی بھاری چیز بہتی ہوئی آرہی تھی۔ یہ ایک جانور کا مردہ تھا۔ وہ عین ہمارے سامنے سے گذرا۔ یہ ایک سور تھا جس کا پیٹ اور ٹانگیں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور ایک کان پتوار کی طرح پانی کو تھپڑے لگاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ لوگوں میں ایک بار پھر شور پیدا ہوا۔ یہ ایک دوسرا سور کا مردہ تھا جو اسکے پیچھے پیچھے بہتا ہوا آرہا تھا۔ اتنی دور سے وہ دریا کے جسم پر کسی پھوڑے کی مانند نظر آرہا تھا۔ ''وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے بہتے آرہے ہیں۔'' کسی نے ہمارے کان میں سرگوشی کی۔ ہم دیر تک اپنی جگہ کھڑے رہے۔ واقعی دریا میں رہ رہ کر سوروں کے مردے بہتے آرہے تھے بلکہ اب تو ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ مردے پانی پی پی کر پھول گئے تھے، ان میں سے زیادہ تر جانوروں کے بدن اس قدر سڑ گل چکے تھے کہ ہوا میں سڑاند پھیلنے لگی تھی۔ دیکھتے دیکھتے مردے تعداد میں اتنا زیادہ ہو گئے کہ لوگوں نے چلانا بند کر دیا اور دریا سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بدبو سے بچنے کے لئے اپنی ناک پر کپڑا یا ہاتھ رکھ لیا تھا اور اپنی جگہ خاموش کھڑے ان کی طرف تاک رہے تھے۔ مردے پانی میں چکر لگا رہے تھے، کناروں سے ٹکرا رہے تھے، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، کبھی کبھار کوئی مردہ کسی چٹان سے ٹکرا کر رک جاتا، مگر پھر پیچھے سے پانی کا ایک زبردست ریلا آتا یا کوئی دوسرا مردہ آکر اسے ٹھوکر لگاتا اور وہ چٹان کے گرد چکر کاٹ کر دوبارا اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر کی طرف بستیوں میں سوروں کے اندر کوئی بھاری وبا پھیل گئی ہو۔

"یہ سچ نہیں ہو سکتا۔" مسعودہ مجھ سے لپٹی ہوئی خوفزدہ نظروں سے سور کے مردوں کی طرف تاک رہی تھی جو کنارے کی کیچڑ یا ناگ پھنی کے پودوں سے اٹک گئے تھے یا فرن کے پتوں کے بیچ رنگین پانی میں ڈول رہے تھے۔ ان میں سے کسی کسی کی ایک یا دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، تھوتھنیوں کا رنگ عجیب گہرا اگلابی ہو گیا تھا جیسے ان کے اندر خون جم گیا ہو، اور پانی سے نکلی ہوئی منحنی دمیں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے جانور اب بھی زندہ ہوں جب کہ یہ اور کچھ نہیں بہتے ہوئے پانی کا کارنامہ تھا۔ "جیسا کہ میں نے کہا تھا، اس دریا میں ہر سال کوئی نہ کوئی حیرت انگیز واقعہ ہو جایا کرتا ہے۔" مسعودہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے ساڑی کے پلو سے اپنی ناک ڈھک رکھی تھی۔ "مگر یہ پہلی بار ہے کہ میں اتنے سارے مردہ سوروں کو اس میں بہتے دیکھ رہی ہوں۔ اور یہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ کہاں سے آ رہے ہیں یہ؟ کہاں جا رہے ہیں؟ تم چپ کیوں ہو؟ کیا میں خواب دیکھ رہوں؟ کیا موت کا فرشتہ میرے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیل رہا ہے؟" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ پہلی بار نہیں تھا کہ میں ایسے کسی دریا کو دیکھ رہا تھا۔ میں ساری زندگی اسی دریا کے کنارے ہی تو چلتا آ رہا ہوں۔

سورج ڈوب چکا ہے۔ مشرق سے اندھیرا آسمان میں قدم بڑھانے لگا ہے۔ زیادہ تر لوگ دریا کے کنارے سے غائب ہو چکے ہیں۔ دریا سور کے مردوں سے اتنا بھر چکا ہے کہ اب وہ ایک دوسرے پر چڑھنے لگے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے مردے خود ہی ایک دوسرے کو ڈھکیلتے ہوئے نیچے کی طرف جا رہے ہوں۔ مغرب کی طرف جہاں آسمان میں اب بھی تھوڑی سی لالی بچی ہے دونوں سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ دریا کے سفید پانی پر سوروں کے مردے اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے وہ زمین کے اندر سے ابل رہے ہوں۔

اس رات جب ہم اپنی کوٹھری میں اکیلے ہوئے تو کھڑکی پر چڑیلیں بیٹھی کھسر پسر کر رہی تھیں۔

مسعودہ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس پر نیند کا شدید غلبہ تھا۔ شاید یہ دوا کا اثر تھا۔ اس کے پھیپھڑوں سے وہی خشک آواز نکل رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے بند پپوٹوں کے نیچے حلقے اور بھی بڑے ہو گئے تھے۔ ان سے ایک عجیب دہشت ٹپک رہی تھی جیسے وہ موت کے فرشتے کو دیکھ رہی ہو۔

"تم چین سے سو جاؤ۔" میں نے اس کے سر کو اپنے سینے سے ڈھکتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس دریا کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے۔ تمہیں پتہ چلنا چاہئے، یہ دنیا تمہارے بغیر بھی ایک بری جگہ ہے۔"

(نوٹ: * مغربی بنگال میں بنگالی آج بھی اتر پردیش کے لوگوں کو ہندوستانی بلایا کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک ہی زبان بولنے کے سبب وہ بہاریوں کو ان کے ساتھ مخلوط کر بیٹھتے ہیں۔)

خدا کا بھیجا ہوا پرندہ

یہ پرانا اسٹیشن جس کی محرابوں سے آج بھی چمگادڑیں لٹکتی ہیں، میں نے ہمیشہ اس کے باہر سن رسیدہ بدھ رام کو اپنا انتظار کرتے پایا ہے۔ مگر اس سے پہلے میں آپ کو اس شہر میں آنے کا مقصد بتادوں۔

پچیس برس پہلے میرے دادا جان اس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر فسادیوں کے ذریعے مار ڈالے گئے۔ یہ میری پیدائش سے قبل کا واقعہ تھا، مگر ہوش سنبھالتے ہی ایک دن میرے ہاتھ میں دادا جان کی جیبی گھڑی آگئی اور ساتھ ہی ان کی ذاتی نوٹ بک بھی جو الماری میں مذہبی کتابوں کی بھیڑ میں دفن تھی۔ یہ نوٹ بک انھیں خاصی عزیز رہی ہوگی کیونکہ انھوں نے گھڑیال کے جس چمڑے سے اس کی جلد کروائی تھی وہ چمڑا اپنے سفر کے دوران انھیں کن حالات میں حاصل ہوا تھا اس کا ذکر اس نوٹ بک میں خاص طور پر درج تھا۔ دوسری طرف یہ گھڑی ان کی جیب سے برآمد ہوئی تھی جب ان کا جلا ہوا جسم پلیٹ فارم سے اٹھایا گیا۔ دراصل ان کے جھلسے ہوئے جسم کے سبب ان کی پہچان ممکن نہ ہوتی اگر ان کی شناخت اسی گھڑی کے ذریعے نہ کی گئی ہوتی جو ان دنوں ٹرین کے کنڈکٹر اپنے بٹن کے سوراخ سے لٹکائے رکھتے، یہ اور بات تھی کہ میرے دادا ٹرین میں ڈرائیور تھے۔ اس جیبی گھڑی کی زنجیر سلامت تھی جس کے ایک سرے سے اس کی پیتل کی منحنی چابی لگی ہوئی تھی۔ اس کا شیشہ پگھل کر ڈائل کے ساتھ چپک گیا تھا جس میں اب رومن کا صرف سات کا ہندسہ بچا تھا جس سے جانے کیوں میں نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ یہ واقعہ دن یا رات کے سات بجے پیش آیا ہوگا، جب کہ یہ صحیح مفروضہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ گھڑی کا ڈھکن کھولنے پر جو اب صرف ایک کیل کے ذریعے گھڑی کے کیس کے ساتھ منسلک تھا مجھے ادھڑے ہوئے ڈائل کے پیچھے پہیوں اور اسپرنگ کی ایک دنیا نظر آئی۔ اندر کی زیادہ تر پلیٹیں سلامت تھیں جن میں سب سے بڑی پلیٹ پر ''سوئزرلینڈ میں بنا'' لکھا ہوا تھا۔ اس وقت جب کہ میں کافی کمسن تھا اور ایک دوسرے شہر میں اپنے والدین کے ساتھ رہ رہا تھا جو میرا پیدائشی شہر بھی تھا، اسے اپنی مٹھی میں دبا کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے یہ اب بھی گرم ہو گرچہ مجھے معلوم تھا یہ احساس سراسر نفسیاتی تھا۔ آج میں آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو میرے دادا جان، جن کی کوئی تصویر ہمارے گھر میں موجود نہیں، ان کے خط و خال میرے سامنے بالکل واضح اور صاف ہوتے جاتے ہیں جیسے یہ حال کا واقعہ ہو اور میں ان کی گود میں بیٹھا ہوا یہ شہر دیکھ رہا ہوں۔

دادا جان جنھیں کتّوں اور کمسن لڑکیوں سے پیار تھا، نماز کے لئے ان کا احترام لوگوں کی سمجھ سے باہر تھا گرچہ یہ انھیں آئے دن شراب نوشی کے اڈے کی طرف جانے سے نہیں روکتی تھی۔ انھوں نے اپنی پہلی شادی میں اس بات کو یقین بنانا چاہا کہ ان کی شریک حیات ان کے لئے کنواری ثابت ہو۔ اس رات انھوں نے اپنی دقیانوسی نوٹ بک میں لکھا، اگر میرے ساتھ دھوکہ نہیں کیا گیا ہے تو میرے ہونے والے بچے کا باپ اس کرۂ ارض پر کہیں بھٹک رہا ہوگا۔

سڑک پر کیروسین لیمپ کے رنگین شیشوں سے چھن چھن کر روشنی آرہی تھی جس میں چلتے ہوئے وہ یہی سوچ رہے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اب رات اور زیادہ گہری ہونے والی نہیں اور آخری دکانیں بس اپنے جھانپے گرانے ہی والی ہیں۔ تو انھوں نے ایک مٹھائی کی دکان کے سامنے رک کر اپنی کمسن بیوی کے لئے پیڑے خریدے، کیونکہ وہ حمل سے تھی اور ہمیشہ بھوکی نظر آتی تھی۔

'اسے دو آدمی کا کھانا چاہئے۔' اس نے بنگالی دکاندار کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ دکاندار ادھیڑ عمر کا تھا اور اپنی کافی بڑی توند پر ایک چرکٹ بنیان چڑھائے مٹھائی کے شوکیس کے پیچھے کھڑا کسی گاہک کی امید میں ایک بوڑھے انسان کے لئے بالکل بھی تیار نہ تھا۔ یوں بھی یہ اس کی رکھیل کا وقت تھا اور ڈھال میں اتر کر اسے کھیت کے کنارے دیسی شراب کے ٹھیکے پر ایک پاؤ لینا لازمی تھا۔

'آپ ان لوگوں کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتے۔' دکاندار ٹینڈر کے کھردرے کاغذ کے ٹھونگے کے اندر پیڑے رکھتے ہوئے دادا کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھپر کے کنڈے سے لٹکتی لالٹین کی مدھم لو میں اس کا سیاہ جسم کافی لحیم شحیم نظر آرہا تھا۔ 'اگر انھیں بچہ دینا ہو تو آپ کبھی روک نہیں پائینگے۔'

'عورتوں کے سلسلے میں تمہارا رویّہ صحتمند نہیں۔' دادا نے شوکیس کے شیشے پر پیسہ گنتے ہوئے کہا۔ شوکیس کے اندر جلتی موم بتی کی حرارت کے سبب سیشہ پر سبز پتنگے پڑے پڑے تپ رہے تھے۔ انھیں حلوائی کی بات سے تکلیف پہنچی تھی۔ 'تم شادی شدہ نہیں ہو سکتے،' وہ بڑبڑائے۔

'جب کہ میرے چھ بچے ہیں۔'

جس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا، دادا ریلوے کی پٹریوں کو احتیاط سے پھلانگتے ہوئے سوچ رہے تھے کیونکہ ٹیوب لائٹس اونچے کھمبوں پر نصب ہونے کے سبب پٹریاں دھندلی لکیروں میں بدل گئی تھیں۔ ریلوے کے گدام کی چہار دیواری کے ساتھ بگلوں کی بیٹ سے سفید فلک بوس درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو چاندنی راتوں میں کافی پراسرار اور آس پاس کی چیزوں کے مقابلے زیادہ تاریک نظر آتے۔ راستے میں کہیں کہیں اینٹ کی کوئی دیوار نمودار ہو جاتی جس کے وہاں ہونے کے جواز کا پتہ لگانا مشکل

تھا سوائے اس کے کہ اس جگہ سے نجاست کی وہ خاص بو آیا کرتی جس کا تعلق صرف ریلوے یارڈ سے ہوا کرتا ہے۔ دادا کو اپنا راستہ بخوبی معلوم تھا۔ بہت جلد وہ ریلوے کے کوارٹروں سے باہر نکل آئے

جہاں کھیتوں کے بیچ رہائشی گھروں کی زیادہ تر روشنیاں بجھ چکی تھیں اور کتے تک خاموش تھے۔ دن کے وقت ایسا لگتا جیسے اس جگہ سے آدھے کوس دور دادا کے گاؤں کی دیواروں تک یہ شہر اپنی غلاظت کے ساتھ کبھی بھی پہنچ نہ پائے گا۔ مگر قریب پہنچنے پر خود ان کا گاؤں بھی غلاظت کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوتا۔ مگر یہ غلاظت کا ڈھیر نہ تھا جب دادا نے اپنا گھر بنوایا تھا۔ دادا اس شہر کے نہیں تھے اور جب ریلوے کی نوکری کے سلسلے میں ان کا تبادلہ اس اسٹیشن پر ہوا تو سستی زمین اور سکون کی تلاش میں وہ اتنی دور آ گئے تھے جہاں کچھ سال پہلے تک گنے کے کھیتوں اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ کے بیچ کنول کے پتوں سے ڈھکے ہوئے کئی تالاب تھے جن کے پانی پر بچھی دبیز کائی پر بطخ کے غول لکیریں کھینچتے نظر آتے اور طرح طرح کی لانبی چونچ والی خاکستری مائل چڑیاں مچھلیوں کی تلاش میں پانی کے اوپر اوپر منڈلایا کرتیں اور جب جوہڑ کے کنارے وہ پانی میں اترتیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ کس طرح اتنی لمبی پتلی ٹانگوں کو جن کا گلابی رنگ حیران کن ہوتا، اور اڑتے وقت جنھیں وہ تیر کی طرح سیدھی رکھتیں، پانی میں اترتے ہی ان میں سے ایک ان کے پروں کے اندر غائب ہو جاتی۔ یہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ ان دنوں انھیں اس بات کی بالکل بھی خبر نہ تھی کہ اپنے شور اور غلاظت کے ساتھ اس جگہ تک پہنچنے کے لئے شہر کو صرف بیس برس لگیں گے اور زیادہ تر تالاب یا تو ڈھک دئے جائینگے یا کوڑے کے ڈھیر میں بدل جائینگے۔

'مجھے اور بھی زمینیں خرید کر رکھنی چاہئے تھیں۔' ایک دن انھوں نے اپنے دوست بدھ رام سے کہا جو سگنل مین کی ڈیوٹی سے ریٹائر تو ہو چکے تھے مگر اب بھی ہرے اور سرخ سگنل کے خواب دیکھنے سے باز نہ آتے۔ 'میں کبھی اچھا بزنس مین نہیں رہا۔ یہ تم نہیں سمجھ سکتے، ایک ایسا آدمی جو سگنل کی روشنیوں سے باہر کچھ سوچنے کی طاقت نہیں رکھتا۔'

شاید وہ ٹھیک کہہ رہے تھے کیونکہ بدھ رام کی ساری زندگی بیکار گئی تھی۔ وہ خاندانی ناتستک تھے جنھوں نے حال ہی میں مسیحیت قبول کی تھی اور بڑے گرجا کے پادری کے حکم سے ان کے نام کے آخر میں ہربرٹ کا لقب چپکا دیا گیا تھا۔ مگر ان کے اس لقب سے کم لوگوں کو واقفیت تھی اور جنھیں واقفیت تھی انھوں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ خود انھیں لوگوں نے کبھی چرچ جاتے نہیں دیکھا تھا۔ آفس کے رجسٹروں میں وہ اب بھی بدھ رام ہی تھے۔ بدھ رام نے زندگی بھر اپنے رشتے داروں سے دور ریلوے کوارٹر میں مجرد کی زندگی گزاری اور ریٹائر ہونے کے بعد اب ایک کرایے کے گھر میں رہتے تھے جو دراصل ایک ریلوے کوارٹر ہی تھا مگر جس کے نام سے وہ الاٹ تھا اس شخص نے اسے کرایے پر دے رکھا تھا۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ اس کے رشتے داروں نے کبھی ان کی کوئی خبر نہیں لی سوائے ان دنوں کے جب انھیں پیسے کی ضرورت ہو۔ شاید اس میں قصور ان ہی کا تھا۔ ان کے پاس ہر ضرورت مند کے لئے کچھ نہ کچھ رقم تیار رہتی تھی۔

'میں زندگی بھر ایک اچھا انسان رہا۔' بدھ رام نے اپنی کھینی کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔ ' اور میں نے دیکھا ہے، اس دنیا میں پانے کے لائق کچھ بھی نہیں ہے۔ اور وہ جنھوں نے بڑی بڑی حویلیاں کھڑی کیں اور کھیت اور باغات کے ڈھیر لگا دیے، مرنے کے بعد انھیں دو گز زمین پر قناعت کرنی پڑی۔ انھیں تین پشت سے زیادہ یاد بھی نہیں رکھا گیا۔'

'یہ ایک ہارے ہوئے انسان کی سوچ ہے۔' دادا سامنے ڈھلان کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں بچے ڈوبتے سورج کے نیچے المونیم کے پہیوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے دس کا ہندسہ بنا رہے تھے۔ ' اگر تمہارے خیال سے میں ایک ایسا گھر چھوڑ کر جاؤنگا جس کی کسی کو ضرورت نہ ہوگی تو یہ تشفی میرے لئے کم نہیں کہ میرے لگائے ہوئے آم اور امرود کے پیڑ برسوں تک پھل دیتے رہینگے۔ اور اگر وہ پھل دینا بند بھی کر دیں تو بھی کٹھ بڑھئی اور گلہریاں اس میں پناہ تو لے ہی سکتی ہیں۔'

شاید دادا کو آنے والے دنوں کی آہٹ مل چکی تھی۔ انگریز ملک چھوڑ کر جا چکے تھے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی مشرقی پاکستان کا رخ کر چکی تھی۔ اب اس بستی میں چند ہی مسلمان رہ گئے تھے جو اب تک ان کی دو منزلہ عمارت سے آس لگائے بیٹھے تھے اور جب بھی شہر کے اندر فساد کا بازار گرم ہوتا پناہ لینے کے لئے اس کے اندر آ جاتے۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ صرف اس وجہ سے ان کے مکان کو پولس والے شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور آئے دن انھیں پاکستانی جاسوس ہونے کے الزام کا سامنا کرنے کے لئے تھانہ جانا پڑتا۔ انھیں پتہ تھا دیر سویر اس گھر کو بک جانا ہے۔ خود ان کے مکان کے چاروں طرف نچلی ذات کے ہندوؤں نے گھر بنا لیا تھا اور ایک ایسا شخص بھی تھا، جو کبھی اس کا نوکر رہ چکا تھا مگر اب سرکاری نوکری میں نچلی ذات والوں کو رزرویشن مل جانے کے سبب اس کے چاروں لڑکوں کو سرکاری نوکریاں مل گئی تھیں اور اب اس کے پاس اتنا پیسہ آ چکا تھا کہ وہ دادا کے گھر کو خریدنے کے بارے میں سوچ سکے۔

'مجھے تمہارا یہ نمک خوار پسند نہیں۔' بدھ رام نے ایک دن اپنی اکتاہٹ کا اظہار کیا۔ 'وہ کیسے کھلے عام تمہارے گھر کے بارے میں بات کر سکتا ہے۔'

'کیونکہ اسے پتہ ہے میرے مر جانے کے بعد یہ گھر اس کا ہونے والا ہے۔ یہ میرے نالائق لڑکے، تم ان سے کیا امید رکھتے ہو۔ انھیں سوائے پہلوانی کے آتا بھی کیا ہے۔ اور اس کے لئے تم ان نچلی ذات کے لوگوں کو ذمہ دار ٹھہرا نہیں سکتے۔ کبھی وہ دوسروں کے ذریعے بے زمین کر دیے گئے تھے۔ آج انھوں نے اپنی زمینیں واپس لینا شروع کر دی ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔'

بدھ رام نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ خوش تھے۔ دادا کو اس کا پتہ تھا کہ ان کے رشتے داروں کی ایک فوج تھی جس نے اس کی زندگی تنگ کر رکھی تھی اور آئے دن اپنی عجیب و غریب مانگوں کے ساتھ نمودار ہوتے رہتے تھے۔ مگر اس کے لئے وہ بدھ رام کو ہی ذمہ وار ٹھہراتے تھے۔ وہ جب بھی شراب کے نشے میں ہوتے ان کا دل بدھ رام کے لئے خیر سگالی کے جذبے سے بھر آتا۔ بدھ رام جو کبھی کسی عورت کے ساتھ ہم بستر نہ ہوا، انھیں ان سے زیادہ قابلِ رحم انسان اور کوئی دکھائی نہ دیتا۔ 'ویشالی میں تمہارا اتنا بڑا کنبہ ہے۔۔۔' وہ اکثر بدھ رام کو تلقین کیا کرتے۔ ' تم اپنے رشتے داروں میں لوٹ کیوں نہیں جاتے۔ بڑھاپے میں ایک انسان کو سب سے زیادہ اپنے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'

'ایک دن تمہیں اپنے لوگوں کا مطلب سمجھ میں آئیگا جب میں تمہیں اپنے لوگوں کے بیچ لے جاؤنگا' بدھ رام نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ' اس دن تم صحیح رائے دینے کے قابل ہو جاؤ گے۔'

بڑھاپے میں ایک اور شادی کرنے کی پاداش میں (اور یہ ان کی تیسری شادی تھی) دادا کو اپنے سفید بال اور داڑھی کو مہندی سے سرخ کرنی پڑی تھی، گرچہ میری کمسن دادی کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ تو ایک بڑا سا پیٹ اٹھائے آج بھی ایک الھڑ لڑکی نظر آتی تھی۔

'وہ کیسے اتنا بڑا پیٹ لے کر دیوار پھاند جایا کرتی ہے؟' بدھ رام نے ایک دن اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ 'مجھے پتہ نہ تھا کہ تم نے ایک گلہری سے شادی کی ہے۔' میرے دادا کو بدھ رام کی بات پسند آگئی۔ 'وہ سچ مچ ایک گلہری ہے۔' انھوں نے بدھ رام کی دی ہوئی کھینی پھانکتے ہوئے آنکھ ماری۔ ' ایک جنگلی گلہری جسے اوّل تو پکڑنا آسان نہیں اور اگر پکڑ میں آجائے تو زیادہ دیر تک تھامے رکھنا مشکل ہے۔'

'بوڑھے آدمی، تمہیں اپنے آس پاس کے نوجوانوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ یہ دنیا ایک بہت ہی بری جگہ ہے۔ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ اس بڑھاپے میں کوئی تم پر ہنسے۔'

'لوگوں کو ہنسنے سے کون روک سکتا ہے۔' میرے دادا جان نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ' ویسے اسے ایک بار ماں بن لینے دو، سب ٹھیک ہو جائیگا۔ اور تم چاروں کھونٹ گھوم آؤ، جہاں تک عورت کا تعلق ہے بستر میں میرے جیسا دوسرا آدمی تمہیں دکھائی نہ دیگا۔''

بدھ رام نے ترحم کے ساتھ میرے دادا کی طرف دیکھا۔ انھیں ایسا لگا جیسے وہ اب زیادہ دنوں تک زندہ رہنے والے نہیں۔ اس دن ایک سرخ سگنل کی طرف تاکتے ہوئے انھوں نے سوچا، ہم کسی چیز کو پانے کی دھن میں اسے اپنے آپ سے کتنی دور کر دیتے ہیں۔

بدھ رام بستر پر لیٹے لیٹے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب روشنی نظر آرہی تھی۔ آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ مجھے ان کی آنکھوں سے بے چینی ہو رہی تھی جیسے وہ مجھے میری جڑوں تک کھنگال لینا چاہتی ہوں۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہے، پھر انھوں نے اپنی خاموشی توڑی۔ کبھی کبھی تمہاری شکل تمہارے دادا سے ملنے لگتی ہے۔ لیکن یہ مشابہت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا، میں نے کہا۔ شاید میرا چہرا ان سے ملتا ہو۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ کوئی بھی چہرا تمہارے دادا کی برابری نہیں کر سکتا۔ وہ مجھ سے عمر میں کچھ برس چھوٹا تھا مگر اس نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ اس کے اندر دو بیل کی طاقت تھی۔ پولس بھی اسے حوالات میں ڈالنے سے ڈرتی تھی۔

بدھ رام اپنی زندگی کے آخری دن گن رہے تھے اور ان دنوں ہمارے دادا کے مکان میں کرایہ داروں کے لئے بنائی گئی کوٹھریوں میں سے ایک میں بغیر کرایہ کے رہ رہے تھے۔ ان کے کمرے کا آدھا حصہ دائمی طور پر اندھیرے میں ڈوبا رہتا جس کی انھیں پرواہ نہ تھی۔ ان کی ساری زندگی کا اثاثہ ایک ٹرنک کے اندر بند تھا جس پر بیٹھے بیٹھے وہ کھڑکی سے باہر آسمان پر نظریں ٹکائے رہنے کے عادی تھے۔ ان وقتوں کے علاوہ جب میں قانونی دستاویزات پر ان کی رائے لینے آتا جن کے سہارے میں اپنے دادا کی جائداد کو ان گنت مقدموں سے بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا، باقی وقت وہ میرے ساتھ اپنی یادداشت کے گلیاروں میں گھومنے کے عادی تھے۔ اور یہ مجھے پسند بھی تھا کیونکہ مجھ سے زیادہ میرے دادا کے واقعات کا علم بدھ رام کو تھا۔ بدھ رام جنھیں کہانی بُننے کا فن بخوبی آتا ہے۔

وہ ایک بڑا ہی خاموش دن تھا، بدھ رام نے کہنا شروع کیا۔ میرے کوارٹر کی کھڑکی کے کواڑ برسات کا پانی پی پی کر پھول گئے تھے اور ٹھیک سے بند نہیں ہو رہے تھے جب اس پر ایک دستک ہوئی۔ یہ دستک میرے لئے حیران کن تھی۔ اب میری ضرورت کسے ہو سکتی ہے؟ میں نے نہ بند ہونے والا پٹ کھولا تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک سبز طوطا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

اس طوطے پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہے، اس نے کہا۔

آہ، میں نے سوچا، اب یہاں برا وقت آنے والا ہے۔

میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اور وہ ایک بہت ہی چرب زبان عورت ثابت ہوئی کیونکہ دس منٹ کے اندر اندر اس نے وہ طوطا اور پنچ گونی تار کا پنجڑا جس کے اندر طوطا بند تھا، مجھے بیچ ڈالا۔

اس کا احترام کرنا، یہ خدا کا بھیجا ہوا خاص پرندا ہے، اس نے روپئے ساڑی کے پلو میں باندھتے ہوئے کہا۔

دراصل اس ادھیڑ عمر کی عورت نے مجھے ایک ہی نظر میں اپنا غلام بنالیا تھا۔ مجھے پہلی بار حیرت ہوئی کہ اتنی لمبی عمر کسی عورت کے بغیر میں نے کیسے گذار دیا تھا۔ تم کس گاؤں کی ہو؟ میں نے اس سے دریافت کیا۔ میں اسی شہر کی ہوں، عورت نے جواب دیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی، عورت کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں بری طرح اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ اس نے اپنے جسم کے بھرپور احساس کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے مزید کہا، اس طوطے کو پانی سے بچا کر رکھنا ورنہ اللہ کا نام غائب ہو جائگا۔

شاید اب اسے میرے ساتھ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس کے گھر کا پتہ کیوں نہ دریافت کیا۔ گرچہ پچھلے بیس برس میں یہ شہر کافی بڑا ہو چکا تھا مگر جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں اس طوطا فروش کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ بعد میں جب میں نے تمہارے دادا سے اس واقعے کا ذکر کیا تو اس نے انتہائی شبہے کے ساتھ اس پورے معاملے کو دیکھا۔ تم نے دیر کر دی، تمہارے دادا نے کہا۔ اب وہ اس لائق نہیں رہ گئی ہے کہ تمہارے لئے بچہ دے سکے۔ کیا وہ کنواری تھی؟ وہ مسلمان تھی، میں نے اس سوال سے بچنے کے لئے یہ بے تکا سا جواب دیا۔ پھر تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے، تمہارے دادا بڑبڑائے۔ اس میں پیچیدہ کیا ہے؟ میں نے ضد کی۔ آخر ہم عیسائی اور مسلمان ایک ہی پیغمبر کے ماننے والے ہیں۔ نہیں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے، اس سے پیچیدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے، اور تمہارے دادا خاموش ہو گئے۔ لیکن مجھے علم تھا، وہ اتنی آسانی سے کسی بھی چیز کو بھولنے والا آدمی نہ تھا۔ دوسری صبح جب وہ اپنا شٹنگ انجن لے کر پٹری سے گذر رہا تھا، اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ مجھے شام خالی رکھنی چاہئے جب ہم سِنڈر پٹی سے گذر کر اسٹیم گیٹ کے پیچھے واقع بڑے کھلیان کی طرف جائیں گے جہاں کی دیسی شراب ہمیں خاص طور پر پسند تھی۔ خالی، میں نے سوچا، اب میرے پاس ایسا ہے ہی کیا کہ اپنے آپ کو مصروف رکھوں! مگر میرا یہ سوچنا غلط تھا۔ قدرت نے کچھ اور ہی چیز میرے لئے تجویز کر رکھی تھی۔ اچانک اس عورت کی مجھے شدید یاد آنے لگی اور دوپہر تک میری حالت اتنی غیر ہو گئی کہ میں تمہارے دادا کو بھول کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

سند کے طور پر میں نے اپنے ساتھ وہ طوطا رکھ لیا تھا جس پر اللہ کا نام لکھا تھا۔ شہر، کیا تم اسے شہر کہو گے، صرف اس لئے کہ اس کی تار کول کی سڑکوں پر بجلی کے کھمبے آ گئے ہیں اور اس کی نئی پرانی عمارتوں میں ہر طرح کے لوگ رہنے لگے ہیں اور تم نے ذرا بھی دیر کی تو وہاں رات اتر جاتی ہے اور عین ممکن ہے کہ تم راستہ بھول جاؤ یا کوئی تمہیں لوٹ لے یا ایک باغی کے نرغے میں آ جاؤ یا کسی فحش فعل میں مصروف جوڑا تمہیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے۔ مگر یہ دن اس طوطے کا تھا۔ وہ پنجڑے کے پنچ گونی خانوں سے پنجوں کے مڑے ہوئے ناخن باہر نکالے خاموش کھڑا تھا اور بار بار سر نیوڑھا کر دھندلے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں اب ہفتے میں دو ایک ٹو سیٹر جہاز نمودار ہونے لگے تھے جو سامانوں کے اشتہار پھینک جایا کرتے۔ یہ کاغذی اشتہار پلندوں کی شکل میں جہاز سے باہر آتے مگر دیکھتے دیکھتے شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتے۔

میں بہت تھک چکا تھا۔ میں پناہ لینے کے لئے ایک عمارت کے اندر داخل ہوا۔ عمارت ویران پڑی تھی پھر بھی میں کسی نیک دل انسان کی تلاش میں اس کی سیڑھیاں طئے کرنے لگا۔ عمارت کے تمام دروازے دریچے بند تھے یا شاید میری دستک اس کے مکینوں تک نہیں پہنچ پا رہی تھی یا شاید انھیں میری نیت کا پتہ چل چکا تھا۔ آخر کار میں اس کی چھت پر پہنچ گیا جس کے اوپر آسمان میں پتنگ اڑ رہے تھے اور سورج دور افق میں غلیظ بادلوں کے اندر بجھ چکا تھا۔ میں نے پانی کے کائی خوردہ ٹینک کے سامنے جس سے پانی رستا ہوا چھت کے کونے میں جم رہا تھا، ایک دیوار کا انتخاب کیا جس کی تعمیر بیچ میں ہی روک دی گئی تھی، اور پنجڑا اس پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا دیوار پر بیٹھے بیٹھے کب میری آنکھ لگ گئی۔

آنکھیں کھلیں تو میں نے اپنے آپ کو ایک عجیب و غریب شہر کے اندر پایا جو میرے لئے اجنبی تھا۔ یہ کون سا شہر ہے؟ میں یہاں کس طرح سے پہنچا؟ دور تک کنکریٹ کی عمارتیں جنھیں ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے جن کے درمیانی راستوں میں بجلی کے اونچے اونچے عمودی کھمبے کھڑے تھے جنھیں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ بہت دیر تک غور سے دیکھتے رہنے کے بعد ایک آدھ پرانی عمارتوں کے مینار اور گنبد ابھرنے لگے جن کے اندر مجھے پرانے شہر کے نشان دکھائی دے رہے تھے مگر کنکریٹ کے ان اونچے ڈبوں کے سامنے وہ ہیچ نظر آ رہے تھے۔ وہ کھلا ہوا شہر جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ہر طرف تنگ راستوں اور گلیوں کا جال بچھ چکا تھا۔ سورج شاید نکل رہا تھا یا ڈوب رہا تھا اور میں اپنی اونچی مگر تنگ چھت کی منڈیر پر بیٹھا اینٹ اور پلستر کے ان ڈھیروں کی طرف تاک رہا تھا جن پر برسات در برسات کائی جم کر کئی بدنما پیڑ اگ آئے تھے۔ چیل کوٹھی کی

چھت پر پانی کا ٹینک اپنی جگہ کھڑا تھا اور آج بھی اس سے پانی رستا ہوا کونے میں جم رہا تھا۔ اس پانی میں ایک کبوتر مرا پڑا تھا۔ چھت کے فرش سے لے کر اس کی نیم تاریک سیڑھیاں اور ان کے بیچ کے چبوترے تک گندے ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اس عمارت کے مکین اپنی تمام گندگیاں ان جگہوں پر ڈالنے کے عادی ہو گئے ہوں۔ لیکن میرے یہاں ہونے کا جواز کیا تھا؟ اور یہ خالی پنجڑا! میں اسے اٹھائے کیوں کھڑا ہوں؟ اور مجھے اس کا افسوس ہونے لگا کہ میں اکیلا اس مہم کے لئے نکل آیا تھا۔ مجھے تمہارے دادا کو ساتھ لینا چاہئے تھا۔ آخر کار عورتوں کے معاملے میں وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھا۔ تو میں نے چھتوں کے ناہموار سلسلے پر دور تک نظر دوڑائی جہاں دلچسپی کے لائق کچھ نہ پا کر میری نظر واپس خالی پنجڑے پر ٹک گئی۔ کیا میری نیند کی حالت میں طوطا اڑ چکا تھا یا کوئی اسے چرا لے گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی جادوی طوطا ہو جو مجھے اس شہر میں لانے کا سبب بنا ہو، اور اپنا کام کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو چکا ہو۔ تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس عورت کا ضرور کوئی نہ کوئی وجود رہا ہو گا جس نے وہ مقدس طوطا چند سکوں کے عوض میرے حوالے کیا تھا۔

میں جب سیڑھیاں اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا، نیچے کی چاروں منزلیں بظاہر ویران پڑی تھیں جن کے اندر گھپ اندھیرا تھا مگر ہر دو سیڑھیوں کے درمیانی چبوترے پر کھڑے ہو کر عجیب و غریب بھنبھناہٹوں اور سرگوشیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا، عمارت آباد تو تھی مگر آج بھی لوگ میرا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔ نیچے کنکریٹ کی سڑک پر میں نے کچھ راہگیر اور فیکٹری سے لوٹتے سائکل سواروں کو دیکھا۔ وہ شاید میرے ہی منتظر تھے اور اپنے آس پاس کی دنیا کو بھول کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

کسی نے میرا طوطا دیکھا ہے؟ میں نے اپنے خالی پنجڑے کو اوپر اٹھا کر دریافت کیا۔ اس پر اللہ کا نام لکھا ہوا تھا۔

انھوں نے جواب دینے کے لئے منہ کھولنے کی کوشش کی۔ میں دیکھ رہا تھا، انھیں اس میں ناکامی ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے ان کے چہروں میں ایسا کچھ نظر آیا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ طوطے کے بارے میں سارے شہر کو واقفیت تھی۔ یہ کون سا شہر ہے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا، یہ میرا شہر تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے دیکھا راہگیر مجھ سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ سائکل سواروں نے اپنی سائکلوں کا رخ موڑ لیا اور تیزی سے پیڈل مارتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے، (گرچہ یہ تعاقب بے معنی تھا) ایک دوسری ویران سڑک پر نکل آیا جو ایک لوہے کے پل سے گذرتی تھی جس کے نیچے کیچڑوں سے ڈھکے ہوئے پانی کا کھال تھا۔ کھال کے اندر لوگ ٹوکریوں سے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ شاید میں کسی گودی کے علاقے میں بھٹک رہا تھا۔ سڑک پر تاحدِ نظر ایک ہی طرح کے آہنی لیمپ پوسٹ کھڑے تھے جن میں سے ایک کے نیچے ایک بھکاری اپنی گدڑیوں کے بیچ افسردہ سا بیٹھا تھا۔ اس کا کتا اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک چھوٹی دیوار پر جو شاید کبھی سنگ میل رہی ہو گی، اپنے سامنے کے پنجے جمائے کھڑا نیچے کھال کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کی بھینگی آنکھوں میں سارے شہر کی دہشت لکھی ہوئی تھی۔ خود بھکاری کے وجود سے ایک عجیب طرح کی بساند آ رہی تھی جیسے اس کا جسم سڑ چکا ہو۔

آپ اس شہر کے لئے نئے نہیں ہو، بھکاری نے کہا۔ اور میں آپ سے بھیک قبول نہیں کر سکتا، کہیں مجھے آپ کے کسی سوال کا جواب نہ دینا پڑے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف تم پڑھے لکھے ہو بلکہ تمہیں میرے طوطے کا بھی علم ہے، میں نے کہا۔ ہاں، بھکاری نے جواب دیا، وہ اسی طرح کے ہتھکنڈے لوگوں پر آزمایا کرتی تھی، مگر ایک ہی شہر میں آپ برسوں تک لوگوں کو ایک ہی طرح کے فریب نہیں دے سکتے، ایک نہ ایک دن آپ کا پول کھل جاتا ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ کسی دوسرے شہر میں قسمت آزمائے۔ مگر کوئی خاص وجہ اسے اس شہر کو چھوڑنے سے روکے ہوئے تھی۔ تو اس نے اپنا پیشہ بدل لیا۔ اس نے کھال کے کنارے اپنے جسم کا دھندا کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہر شام اسی لوہے کے پل پر ملاحوں کی امید میں آتی مگر اسے زیادہ تر خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا کیونکہ اس کی عمر کے سبب کسی گاہک کو اس کے اندر کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ خاص طور پر جب کمسن لڑکیوں کی کھیپ کی کھیپ چکلوں کے اندر بھر چکی ہو۔ رہا آپ کا طوطا، تو وہ کب کا مر چکا ہے۔ تمہیں علم نہیں تم جس طوطے کی بات کر رہے ہو وہ کوئی ایسا ویسا طوطا نہیں تھا، میں نے کہا۔ تم اتنے سرسرے انداز میں اس کی موت کا ذکر نہیں کر سکتے۔ وہ خدا کا بھیجا ہوا خاص پرندا تھا۔ ممکن ہے وہ ویسا ہی رہا ہو، بھکاری نے تائید میں سر ہلایا، مگر آپ واپس کیوں نہیں لوٹ جاتے؟ شاید آپ کو علم نہیں، آپ اپنے وقت سے باہر نکل آئے ہیں۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تمہیں اتنا سب کچھ کیسے معلوم؟

بھکاری اپنے عجیب و غریب دانتوں سے مسکرایا۔

میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ پھر بھی ایک بات تو بتا ہی سکتا ہوں۔ بیس برس قبل ایک بوڑھا آپ کی تلاش میں یہاں آ نکلا۔ ہوا کی ایک ٹھنڈی لہر سے بچنے کے لئے بھکاری نے چیتھڑوں کو اپنے گرد لپیٹنا شروع کر دیا جس سے بساند اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ آپ کو تقریباً تلاش کر چکا تھا کہ شہر میں فساد پھیل گیا اور لوگوں نے اسے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر زندہ جلا ڈالا۔ اس کے بعد بھی وہ سرکاری اسپتال میں کئی دنوں تک زندہ رہا۔ پھر اس پر دل کا دورا پڑا اور اس کے لوگ اسے واپس اٹھا کر لے گئے۔ اور آپ کا طوطا بیس سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے ضرور پنجڑے کے اندر جان دے دی ہو گی اور وہ دھیرے دھیرے مٹی میں

بدل گیا ہو گا۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں پنجڑے کے اندر دیکھ رہا تھا، کچھ ایسا ہی ہوا ہو گا اور اس کی مٹی کو برسات کا پانی بہا کر یا ہوا اڑا کر لے گئی ہو گی۔ مگر تمہیں اس عورت کا پتہ تو معلوم ہو گا؟ میں نے پوچھا۔ ایسی عورتوں کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں ہوتا، بھکاری نے جواب دیا۔ میں نے اسے عرصے سے دیکھا بھی نہیں ہے۔ یوں بھی، وہ اب آپ کے کسی کام کی نہیں، وہ ہر طرح کے ٹیومر سے گھر چکی ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو کسی ہسپتال کے احاطے میں اپنی موت کو انتظار کر رہی ہو گی۔ یہ اس کے ان گنت گناہوں کا نتیجہ ہے۔

تمہارے دادا کی موت کی اطلاع مجھ پر بجلی بن کر گری تھی مگر اس کے جھٹکے کو سمجھنے کے لئے مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ اور جب مجھے اس کا احساس ہوا تو میں پاگل کی طرح سڑکوں پر دوڑتا پھرا۔ کچھ راستے اور گلیاں میری پہچان میں بھی آ گئیں اور پھر دھیرے دھیرے میں ان کی پہچان بن گیا۔ میں نے وہ پنج گونی تاروں والا پنجڑا کب کھو دیا، مجھے اس کا احساس نہ تھا۔ خود میں اچھا خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ میں نے ایک لمبے عرصے تک شہر میں آوارہ گردی کی۔ اپنی آوارہ گردی کے دنوں میں بھوک مٹانے کے لئے مجھے کئی معصوم چوریاں بھی کرنی پڑیں۔ ایک بار پکڑا بھی گیا مگر میری عمر کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو مجھ پر ترس آ گیا اور انھوں نے مجھے عیسائیوں کے ذریعہ بنائے گئے بوڑھوں کے ایک آشرم میں ڈال دیا جہاں سے بھاگنا آسان نہ تھا کیونکہ اس کا پاگل دربان ایک گھنٹے کے لئے بھی نہیں سوتا تھا۔ مگر میں بھاگ نکلا۔ اور آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب میں نے تمہارے دادا کی قبر دریافت کر لی۔ خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جنھوں نے قبروں پر کتبہ نصب کرنے کی روایت قائم کی۔ شہر میں آج کے برعکس ان دنوں تم مسلمانوں کا ایک ہی قبرستان تھا، مگر تمہارے دادا کو تمہارے لوگوں نے تمہارے خاندانی قبرستان میں دفن کیا تھا جس کے دو ہات کے فاصلے پر اس کا کتا بھی دفن تھا جسے تمہارے دادا نے رمضان میں روزہ رکھنے کی عادت ڈلوائی تھی۔ مگر تمہارے بڑے چچا نے، جس نے گھر کے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس اتنی بڑی عمارت کی چھت سے لگے شہتیروں سے لے کر کھڑکیوں دروازوں کے چوکھٹ تک گروی رکھ دی تھی، مجھے ایک الگ ہی واقعہ سنایا۔ اس کے مطابق وہ ریلوے کے حادثے میں مارا گیا تھا۔ وہ مالگاڑی لے کر کسی سنسان اسٹیشن سے گذر رہا تھا جب اس کا انجن بفر لائن پر غلطی سے جا نکلا جس کے خاتمے پر ٹرین کو روکنے کے لئے بنائے گئے مٹی کے اونچے ڈھیر سے ٹکرا جانے کے سبب اس کا ابلتا ہوا بوئلر پھٹ کر تمہارے دادا پر آ گرا جس سے وہ جھلس کر مارا گیا۔ یہ اسٹیم انجن کا زمانہ تھا جب پٹریاں دستی بیرم کے ذریعے بدلی جاتی تھیں اور کسی نے شرارت سے پٹری کا رخ بفر لائن کی طرف موڑ دیا تھا۔

بدھ رام سے میں نے اس طوطے کے بارے میں دریافت کیا۔ کیا واقعی اس کا کوئی وجود تھا؟ کیا واقعی وہ خدا کا بھیجا ہوا پرندا تھا جس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ وہ گھڑی کے کانٹوں کو طوفانی رفتار سے چلنے مجبور کر دے، اتنی تیزی سے کہ دہائیاں گذر جائیں اور آدمی کو پتہ نہ چلے، اور خود اس کا اپنا شہر اس کے لئے اجنبی بن جائے، جیسا کہ ان کے ساتھ ہوا تھا۔

بالکل، وہ ہنسے۔ اب تک اس بوڑھے کی ہنسی میں اس کا بچپنا جھلکتا تھا۔ اگر تمہارے دادا زندہ ہوتے تو اس بات کی تصدیق کرتے۔

کچھ دنوں کے بعد ہمارے دادا کا مکان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہم لوگ بدھ رام کو اس کے ٹرنک کے ساتھ اسٹیشن چھوڑنے آئے جس کی محرابوں سے ہمیشہ کی طرح چمگادڑیں لٹک رہی تھیں۔ ہمالیہ کی ترائی میں اسے ایک کہرے سے ڈھکے ہوئے شہر کی یاد تھی جہاں اب بھی اس کے کچھ رشتے دار زندہ تھے جو انھیں پہچان سکتے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا میں وہاں کیوں جا رہا ہوں؟ بدھ رام نے کہا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی جس کے سبب پلیٹ فارم پر ایک طرح کی دھند چھا گئی تھی۔ ہم لوگ لوہے کا ٹرنک ان کی سیٹ کے نیچے رکھ کر ابھی ابھی باہر آئے تھے اور ان کی کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے۔ تیز ہوا بارش کی پھوار کو شیڈ سے نیچے کی طرف لا رہی تھی۔ بدھ رام کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ اب زندگی میں بالکل اکیلے ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے سر اٹھا کر کہا، اگر تم لوگ کچھ اور دن انتظار کرتے تو اپنے دادا کی زمین میں عیسائی رسم و رواج کے مطابق مجھے دفن کر سکتے تھے۔ آخر کار اس میں ایک کتا بھی دفن ہے۔ میں تو خیر ایک عیسائی ہوں۔

ہم عدالت کے حکم کے سامنے مجبور ہیں، میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ وہ مکان اب ہمارا نہیں رہا۔

ٹرین چل چکی تھی جب بدھ رام نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر چلاتے ہوئے کہا، ایک دن میں واپس آؤں گا اس عورت اور اس طوطے کی تلاش میں۔ اس دن تمہارے دادا کے بارے میں میں اور بھی بہت ساری جانکاری دوں گا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں نے پوری طرح ان کی بات کا بھروسہ کیا ہو، مگر وہ دن اور آج کا دن، مجھے اب بھی اس ٹرین کا انتظار ہے۔ آج جب چند ناگزیر حالات کے سبب میں اس شہر کا باشندہ بن چکا ہوں جہاں ایک عورت اور اس کے طوطے کی نامکمل کہانی کے ساتھ ساتھ میرے دادا کی زندگی کے ان گنت واقعات دفن ہیں جن کا علم صرف بدھ رام کو ہے۔

بدھ رام، میں دادا کی جیبی گھڑی کو جس میں وقت دائمی طور پر رک چکا تھا، اس کی زنجیر سے اپنے سامنے لٹکا کر اس کے سات کے ہندسے کو دیکھ رہا تھا، جب تک تم لوٹ کر نہیں آتے نہ وہ طوطا مر سکتا ہے، نہ وہ عورت اور نہ ہی تم مر سکتے ہو۔ وقت کا یہی فیصلہ ہے!

جانور

میرا بچہ صرف دو برس کا تھا جب میں اس کے لئے مرغی کے دو چوزے خرید کر لائی۔ مشین کے یہ دونوں بچے بہت بدنصیب ثابت ہوئے۔ پہلا تو اسی دن مر گیا۔ دوسرا اس واقعے کے سات دن بعد بالکنی کے جنگلے سے باہر نکل کر دیوار کے کارنس پر ٹہل رہا تھا جب ایک چیل اسے پنجے میں دبا کر لے گئی۔

وہ تین برس کا تھا جب ایک دن اسے اسکول چھوڑ کر واپس لوٹتے وقت فٹ پاتھ کے ایک سوراخ کے اندر جو ایک پرانا لیمپ پوسٹ نکال دئے جانے کے سبب بن گیا تھا میں نے بلّی کے بچوں کی آواز سنی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ اس کے اندر دو بلّی کے نوزائدہ بچے پڑے تھے اور اپنے منحنی سر اٹھائے ہوئے اپنی معصوم آنکھوں سے میری طرف تاک رہے تھے۔ ایک کو تو میں نے فٹ پاتھ پر اس کی ماں کی تلاش میں چھوڑ دیا، دوسرے کو گھر لے آئی۔ ایک ماہ کے اندر اندر وہ ٹھنڈ سے مر گئی۔

میرا بچہ چار برس کا تھا جب میں نے اس کی سالگرہ کے دن تحفے میں اسے ایک خرگوش لا کر دیا جسے اس نے اپنے سینے سے لگا کر پیار سے دباتے دباتے بالکل چھوٹا کر ڈالا۔ ہم نے اسے الگ کرنے کی کوشش کی تو اس نے غصّے میں اسے فرش پر پٹک دیا اور وہ ایک بے جان لوتھڑے میں بدل گیا۔

میرا بچہ آٹھ برس کا تھا جب اس کی ضد پوری کرنے کے لئے میں گیلف اسٹریٹ سے ایک افغان ہاؤنڈ خرید کر لائی۔ مجھے علم نہ تھا کہ میں ٹھگ لی گئی تھی۔ کتّا پہلے سے بیمار تھا اور اس کی موت یقینی تھی۔ اسے کھانا کھلانے کی ہمارے تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور ایک دن وہ پلنگ کے نیچے ٹھنڈا پایا گیا۔

وہ چودہ برس کا تھا جب میں اس کے لئے ایک طوطا خرید کر لائی۔ وہ ایک خاموش فطرت کا طوطا تھا جو صرف پنجڑے میں الٹا لٹکتا رہتا۔ ایک دن نوکرانی اس کی پیالیوں میں چنا اور پانی ڈالنے کے بعد پنجڑے کا دروازہ ٹھیک سے بند کرنا بھول گئی اور وہ باہر نکل کر سیڑھی گھر کی مصنوعی سلنگ میں جا گھسا جہاں دو بڑے بھیانک چوہوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ انھوں نے فوراً اس کا شکار کر لیا۔ بعد میں مصنوعی سلِنگ کٹوانے پر دونوں چوہے بھاگ نکلے اور ہڈیوں کے ڈھیر کے بیچ جنھیں چوہے مہنیوں سے وہاں جمع کر رہے تھے ہمیں طوطے کے سبز پر، اس کی سالم سرخ چونچ اور پالش کی ہوئی تازہ سفید ہڈیاں ملیں۔

میں نے سوچا اٹھارا سال ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ میرا بیٹا جو جانوروں کا اتنا شیدائی ہے اور گوشت مچھلی سے جسے کراہیت ہے، شاید جانوروں کے معاملے میں وہ بدنصیب ہے۔

شہر کے قدیم علاقے میں ہم ایک پرانی عمارت کی برساتی میں رہتے ہیں۔ برساتی ان تین کمروں پر مشتمل ہے جس نے چھت کے آدھے حصے کو گھیر رکھا ہے۔ باقی کی چھت خالی پڑی ہے جو ہمارے ہی استعمال میں رہتی ہے۔ میرے بچے کے سر پر بال کم ہیں بلکہ اسے دائمی گنجا کہا جائے تو بہتر ہو گا کیونکہ اب اس کی کھوپڑی پر بال نکلنے والے نہیں۔ وہ پیدائشی لب کٹا ہے اور اس کی ناک ہمیشہ بہتی رہتی ہے۔ ہم اسے پڑھنے کے لئے اسکول نہیں بھیجتے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کی جسمانی عمر بیس برس کی سہی، ذہنی طور پر وہ ابھی صرف دو سال کا بچہ ہے۔ میں رات رات بھر جاگ کر اس کی تیمار داری کیا کرتی ہوں اور وہ اپنی تیز آنکھیں مجھ پر ٹکائے رکھتا ہے۔

"تمہیں کچھ چاہئے اشرف؟" میں اس سے پوچھتی ہوں۔

"ماماپٹ، ماماپٹ۔" (Pet)

"کیسا پٹ؟"

"گھوڑا، ہپّو، ایلی فنٹ۔" پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ کہتا ہے "ڈک!"

"تم جانتے ہو اشرف، تمہارے سارے پٹ مر جاتے ہیں۔"

"ماماپٹ! ماماپٹ!" اس پر جیسے ہسٹریا کا دورا پڑ جاتا ہے۔ "گھوڑا، ہپّو، ایلی فنٹ"

"اور ڈک۔" میں اس کا جملہ مکمّل کرتی۔

میں اسے پبلک پارک لے جاتی جو ہمارے گھر سے تھوڑی دور ایک مصنوعی جھیل کے کنارے واقع تھا۔ وہاں وہ اپنی ہی عمر کے بچّوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ میرا مطلب دو ڈھائی سال کے بچّوں سے ہے۔ بچے اس سے بہت جلد مانوس ہو جاتے کیونکہ وہ خود بھی ایک اچھا کھلونا تھا۔ وہ سر کے بل قلابازیاں کھانے میں ماہر تھا، دونوں ٹانگوں کو اوپر اٹھا کر اپنی ہتھیلیوں پر الٹا چلنے لگتا، قمیض اور بنیان اتار کر اپنا پیٹ غبارے کی طرح پھلا لیتا اور اپنی مٹھیوں سے ڈھول کی طرح بجاتا۔ وہ اپنے کٹے ہوئے ہونٹوں کے بیچ سے چوہوں جیسی آوازیں نکالتا جن سے چھوٹے چھوٹے بچے مسحور ہو کر اس کی طرف تاکتے رہتے۔ مگر مجھے بہت ہوشیار رہنا پڑتا کیونکہ ایک بار وہ ایک بچے کا گال چبا چکا تھا۔

میں جب اس سے بہت خوش ہوتی تو اسے سینے سے لپٹا کر اس کے کٹے ہوئے ہونٹوں کے بیچ بوسہ دیا کرتی۔ دوسرے وقتوں میں میں اس سے لاپرواہ پارک کے بینچ پر بیٹھی پتّوں کو ہوا کی زد پر لرزتے دیکھتی رہتی۔ میری جوانی کا ایک بڑا حصّہ اشرف پر صرف ہو چکا ہے۔ میں پھر بھی خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ مجھے کسی بات کا دکھ نہیں، کہ میں خوش ہوں۔

نفیس ہر ماہ ایک نئے ڈاکٹر کی خبر لے کر آتا ہے۔ اتنے برسوں بعد بھی اس نے امید نہیں ہاری ہے۔ اسے میں نے کبھی روتے نہیں دیکھا جیسے ذرا سی کمزوری اور وہ یہ جنگ ہار جائگا۔ میرے لئے سب سے زیادہ صبر آزما وہ لمحات ہوتے جب اشرف بستر گیلا کر دیتا یا جب اتنا بڑا ہوتے ہوئے بھی وہ پلاسٹک کے کموڈ پر بیٹھنے پر اصرار کرتا اور بعد میں مجھے اس کی صفائی کرنی پڑتی۔ اس کے لئے میں کسی کو الزام نہیں دیتی۔ ہر نوکر نوکرانی کے کام کی ایک حد ہوتی ہے اور ایک جوان لڑکے کی پوٹی سے کسے کراہیت نہیں ہوتی۔ اشرف جسمانی طور پر بالغ ہو چکا ہے، اس کی داڑھی مونچھیں نکل چکی ہیں پھر بھی یہ سب کام مجھے کرنے پڑتے ہیں۔ اکثر میں آئینہ کے سامنے کھڑی کھڑی ٹوٹ جاتی ہوں۔ مگر نفیس ہار نہیں مانتا۔ پردوں کا یہ تاجر اشرف پر اپنے لاکھوں روپئے خرچ کر چکا ہے مگر اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑتا۔ وہ اشرف کو اپنی گود میں بٹھا کر (جب کہ دونوں ایک ہی قد اور کاٹھی کے ہو چکے ہیں) اس کے گنجے سر پر کپڑے کی کیپ رکھ کر کہتا:

"وہ ہم لوگوں کے لئے ایک نیک فال بن کر آیا ہے۔ جان، تمہیں نہیں پتہ، ہم نے جتنا اسے دیا ہے اشرف نے اس کے مقابلے کتنا گنا زیادہ لوٹایا ہے، اس نے ہمیں بڑے بڑے ہوٹلوں سے آرڈر دلوائے ہیں، وینیشین بلائنڈ (Venetian Blind) کی ایجنسی دلوائی ہے۔"

اس دن اشرف کو گھر پر نوکر کے ساتھ چھوڑ کر میں بازار آئی تھی۔ کل اشرف کی سالگرہ ہے۔ مجھے اس کے لئے کچھ پھول خریدنے ہیں۔ اشرف خزاں کی پیداوار ہے۔ خزاں کے موسم میں پھولوں کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگتی ہیں۔ مجھے کچھ خاص پھول چاہئیں جو خاص بھی ہوں اور ہماری آمدنی کے مطابق بھی۔ وہ پھول مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ آخر کار مجھے دوسری طرح کے پھولوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جن سے مجھے اطمینان نہیں ہوتا مگر میرے پاس کوئی چارہ بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں اشرف کے ساتھ بے ایمانی کر رہی ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ میرے پرس میں پیسہ نہیں ہے۔ مگر ہر چیز کی اپنی قیمت ہوتی ہے۔ آپ پیڑ کی قیمت پر پھل نہیں خرید سکتے۔

میں پھولوں کو تھامے ہوئے نیو مارکیٹ کے فلاور رینج سے نکل کر چورنگی کے فٹ پاتھ پر ٹیکسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ سامنے سڑک پر گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ گاہے گاہے کوئی کار یا مسافر بردار ٹیکسی سگنل کی روشنی پر رکتی ہے تو بچے بوڑھے پھول اسٹر ابیری اور پلاسٹک کے کھلونے اٹھائے ان کی کھڑکیوں کی طرف لپکتے ہیں مگر ان سے بچنے کے لئے ان گاڑیوں کے زیادہ تر شیشے چڑھے رہتے ہیں یا فوری طور پر چڑھا دئے جاتے ہیں۔ میرے سامنے سے ان گنت خالی ٹیکسیاں گذر جاتی ہیں مگر میرے ہاتھ دینے پر کوئی نہیں رکتی۔ اس شہر میں ایسا کبھی کبھار ہو جایا کرتا ہے جس کا کوئی جواز آپ کو دکھائی نہیں دیتا۔ میں بس کی سواری کے بارے میں سوچتی ہوں۔ مگر یہ پھول غیر منظم مسافروں کی بھیڑ میں کچل جائینگے اور پھر بس سے اتر کر مجھے اچھا خاصا سفر رکشا پر بھی طئے کرنا پڑے گا جو لوگوں کو مصیبت میں دیکھ کر کرایہ آسمان تک اونچا اٹھا دیتے ہیں۔ میں تھک کر ایک کھمبے سے ٹیک لگائے اس ٹیکسی کا انتظار کرتی ہوں جو میری قسمت میں لکھی ہو جب کوڑھ کا مارا ایک بھکاری میرے سامنے اپنی سڑی گلی انگلیاں پھیلا دیتا ہے۔ یہ زائل شدہ انگلیاں اس کی آمدنی کا خاص ذریعہ ہیں۔ یہ وہ ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ سفید فام غیر ملکیوں میں دہشت پھیلا کر ان سے بھیک وصولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ انگلیوں کے زخم مصنوعی ہیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح مجھے ان انگلیوں سے کوئی کراہیت نہیں ہوتی۔ کیا یہ اشرف کے سبب ہے؟ میں کھمبے سے الگ ہو کر چلنے لگتی ہوں اور تھوڑی دور جا کر ایک جگہ پھر سے فٹ پاتھ پر ٹھہر کر آسمان کی طرف تاکتی ہوں جس میں ایک نارنگی کے رنگ کا اشتہاری بیلون ڈول رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے سڑک بالکل سنسان ہو گئی ہے، اس پر کسی بھی رخ سے کوئی گاڑی نہیں آتی۔ اور جب کہ مجھے اپنی تنہائی کا ایک عجیب احساس کھا رہا ہے جیسے یہ کائنات انسانوں سے خالی ہو گئی ہو، جانوروں سے بھری ایک دقیانوسی وین میرے سامنے آکر رک جاتی ہے۔ وین کے سامنے کا دروازہ کھلتا ہے اور اس سے ایک شخص ایک جانور کی زنجیر تھامے برامد ہوتا ہے۔ یہ عجیب و غریب جانور فوراً میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس کا جسم بھیڑ کی طرح بالوں سے ڈھکا ہوا ہے، اس کی چونچ بطخ کی چونچ کی طرح کشادہ، دبیز اور کافی مضبوط ہے، پیر اور پنجوں کے ناخن کسی بھالو سے مشابہ ہیں، دم کتے کی طرح درانتی کی شکل میں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی ہے، اور اس کی آنکھیں چوزوں کی آنکھوں کی مانند بیضوی، بے جان اور زرد ہیں جیسے وہ کسی بھی چیز کو نہ تاک رہی ہوں۔

"عجیب جانور ہے یہ۔ لگتا ہے بہت سارے جانوروں کا مرکب ہے۔" میں حیرت سے اس کی طرف تاکتے ہوئے کہتی ہوں۔ "میں نے ایسا جانور آج تک نہیں دیکھا۔"

"اسے خریدنا چاہو گی بی بی؟" جانور کے مالک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لانبے قد کا دبلا پتلا انسان ہے جس نے سفید سوٹ، سفید ہیٹ اور سفید رنگ کے نوکیلے جوتے پہن رکھے ہیں اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ چڑھا رکھا ہے۔ اس کے ہونٹ گہرے شیڈ کی لپ اسٹک سے چمک رہے ہیں اور اس کے رخساروں پر زنانی میک اپ کا استعمال کیا گیا ہے۔ "وہ ایک خاص جانور ہے۔ ہم نے اسے انسانوں کے جنگل میں پکڑا ہے اور یقین کیجئے یہ آسان کام نہ تھا۔"

"ہمارے گھر میں پٹ نہیں رہتے۔ وہ مر جاتے ہیں۔"

"یہ پٹ نہیں، یہ ایک خالص جانور ہے، بہت ہی سخت جان۔" وہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ "یہ ہر طرح کے مصائب جھیل سکتا ہے، ہفتوں بھوکا رہ سکتا ہے۔ یہ اپنے پہلے مالک کے لئے جلتے ٹائر کے اندر سے کودنے کا کرتب کیا کرتا تھا گرچہ اس کرتب کو بار بار دکھانے کے چکر میں ایک بار اس کے بال بری طرح جھلس چکے ہیں اور اس واقعے کا اثر اس کے مزاج پر بھی پڑا ہے۔"

"نہیں نہیں، میں اس جانور کا کیا کرونگی۔" میں کہتی ہوں۔ "یہ عجیب جانور میرے بچے کو اور بھی کنفیوز کر ڈالے گا۔ وہ تو ابھی صرف تین برس کا ہے۔"

مجھے نہیں معلوم میں نے اس کی ذہنی عمر کیوں بتائی تھی!

"مجھے افسوس ہے محترمہ۔" وہ تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہے۔ "میں خود اسے بیچنا نہیں چاہتا مگر آپ کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے لگا اس پر مجھ سے زیادہ آپ کا حق ہے۔"

"اس کی کیا قیمت رکھی ہے تم نے؟" میں بادل ناخواستہ پوچھ بیٹھتی ہوں۔ شاید اشرف کے لئے یہ عجیب جانور ایک نیک فال ثابت ہو۔

"قیمت کی بات کس کافر نے کی ہے بی بی؟" وہ کہتا ہے۔ "اور اگر قیمت پسند نہ آئے تو کچھ دنوں کے بعد آپ اسے لوٹا بھی سکتی ہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ جانور کی زنجیر میرے ہاتھ میں تھما دیتا ہے جس کے ساتھ ہی سارے واقعات بالکل ہی ترتیب سے پیش آتے ہیں۔ اس کی انگلی اٹھتی ہے، اور سنسان سڑک پر جیسے عالم غیب سے ایک خالی ٹیکسی نمودار ہوتی ہے۔

ٹیکسی میرے سامنے آکر رک گئی ہے۔ اس کا پچھلا دروازہ کھلتے ہی جانور کود کر اندر بیٹھ جاتا ہے جیسے اسے اس کے لئے خاص ٹریننگ دی گئی ہو، اور میں اس کی زنجیر سے کھنچ کر جانور کے بغل میں بیٹھنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ ابھی میں نے اپنے حواس پر قابو بھی نہیں پایا ہے کہ میں دیکھتی ہوں جانور کا مالک کار کی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے جھکا ہوا اس کے شیشے کو جو تھوڑا سا نکلا ہوا ہے اپنی مٹھیوں سے تھامے میری آنکھوں میں تاک رہا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے اور میں ایک کاغذ پر گھر کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیتی ہوں جسے وہ جھجکتے ہوئے، جیسے اندر سے شرمسار ہو، اپنی لانبی پتلی انگلیوں کے بیچ تھام لیتا ہے۔

"اس جانور سے بہت جلد آپ کا بچہ مانوس ہو جائگا۔" کھڑکی سے ہٹ کر وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ "اور مجھے یقین ہے ایک ہفتے کے بعد جب میں آپ کے دولت خانے پر حاضر ہونگا تو تب تک آپ لوگ اس کے اتنے عادی ہو چکے ہوں گے کہ واپس لوٹانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیں گے۔"

ہماری عمارت کے دروازے پر متجسس تماشائیوں کی بھیڑ لگ چکی ہے۔ آس پاس کی عمارتوں کے دریچوں سے عورتیں اور بچے جھانک رہے ہیں۔ ان کے اندر کتے بھونک رہے ہیں۔

"عجیب جانور ہے یہ۔" کوئی بھیڑ میں کہتا ہے۔ "کون سا جانور ہے؟"

"یہ سب جانوروں کا مرکب ہے۔" میں کہتی ہوں۔ "انسان کی طرح۔"

دقیانوسی لفٹ کے اندر وہ فرمانبرداری کے ساتھ کھڑا ہے، یہاں تک کہ اپنی دم تک نہیں ہلاتا۔ لفٹ مین اپنے اسٹول پر بیٹھا ہوا خوف کے عالم میں لفٹ کی دیوار سے بالکل چپک گیا ہے۔ لفٹ سے نکل کر ہمیں چھت پر جانے کے لئے آخری کچھ سیڑھیاں جو لکڑی کی بنی ہیں پیدل طئے کرنی پڑتی ہیں۔ مگر جب میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوتی ہوں تو اشرف اسے دیکھ کر اپنے کمرے میں چھپ جاتا ہے۔ میں اس کی زنجیر بالکنی کے جنگلے سے باندھ دیتی ہوں اور تب مجھے یاد آتا ہے میں نے تو جانور کے مالک سے پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ کھاتا کیا ہے؟ میں ایک کٹورے میں پانی بھر کر اس کے سامنے رکھ دیتی ہوں اور نوکر کو چنا بھگونے کے لئے کہہ کر کچھ بسکٹ طشتری پر سجا کر اسے پیش کرتی ہوں۔ کچھ دیر بعد آکر میں دیکھتی ہوں جانور نے اسی دوران پانی کے کٹورے کو ٹھوکر مار کر الٹ دیا ہے اور اپنے دونوں بھاری بھرکم پیر سامنے کی طرف پھیلائے ہوئے اپنی دم پر بیٹھا ہے۔ تب پہلی بار مجھے پر کھلتا ہے کہ وہ ایک گندا جانور ہے اور اس کی جلد پر عجیب طرح کے بغیر آنکھوں والے سفید سفید کیڑے رینگ رہے ہیں جنھیں تنکے سے ہٹانے پر وہ بالوں کے اندر اس کی جلد سے اس طرح چپک جاتے ہیں جیسے اسی کا حصہ ہوں۔ وہ بسکٹ پر ایک لایعنی نظر ڈالتا ہے اور اپنی چونچ آسمان کی طرف اٹھا کر عجیب کرکش آواز نکالنے لگتا ہے، پھر سامنے کے پنجوں سے پچی کاری کے فرش کو کھرچنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا تیزابی پیشاب فرش کو گیلا کر رہا ہے۔

"بی بی مجھے تو اس سے ڈر لگتا ہے۔ یہ آپ نے کیا اٹھالایا؟" مجھے اپنے پیچھے سے نوکرانی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کی آنکھیں خوف سے امنڈی پڑ رہی ہیں۔

"چپ رہو، اور دیکھو اشرف کیا کر رہا ہے؟"

"وہ منہ تکیہ میں چھپا کر بری طرح رو رہا ہے۔"

"تو اسے چپ کراؤ۔" میں بالکنی کی دیوار سے لگے اس عجیب الخلقت جانور کی طرف تاکتی رہتی ہوں جو دس منٹ پہلے کتنی خاموشی اور فرمانبرداری کے ساتھ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں اس کا کیا کروں۔ میں نے سوچا، میرا شوہر گھر آنے پر اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھے گا۔ مگر اس معاملے میں بھی وہ ایک عجیب آدمی ثابت ہوتا ہے۔ گھر

لوٹنے پر وہ پہلی نظر میں ہی اس پر عاشق ہو جاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس دانشمند انسان سے تھوڑی سی چوک بھی ہو گئی ہے کیونکہ اس کے بالوں سے ڈھکے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہی جانور اپنے نوکیلے ناخنوں سے اس کی ہتھیلی کی پشت کو کھرچ ڈالتا ہے۔ میر اشوہر چیخ کر ہاتھ ہٹالیتا ہے۔ اس کے زخم سے خون رس رہا ہے۔

''وہ ایک خطرناک جانور ہے۔' میں کہتی ہوں۔

''بالکل وحشی۔'' بیسن کے سامنے کھڑا وہ ایک روئی کے گالے پر ڈٹول انڈیل کر اپنا زخم دھو رہا ہے۔ اس کی جلد پر جانور کے کھرچنے کے نشان صاف نظر آرہے ہیں۔ وہ انھیں بینڈ ایڈ سے ڈھک دیتا ہے اور واپس بالکنی پر آکر جانور کی پیٹھ کو اسی ہتھیلی سے سہلانے لگتا ہے۔

''تمہیں ثابت کرنا ہے کہ تم ایک بہتر جانور ہو۔'' وہ جانور سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

''یہی تو وہ ثابت کرنا چاہ رہا تھا۔'' میں مسکرا کر کہتی ہوں۔

دوپہر تک میرے شوہر کو بخار آجاتا ہے، وہ سردی سے کانپنے لگتا ہے۔ میں ایک ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ وہ جانور کے بارے میں سنتا ہے اور اسے انسانی حیرت اور ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

''ان کے خون کی جانچ ضروری ہے۔'' وہ کہتا ہے۔ ''فالحال بخار میں کمی آگئی ہے۔ بہت بڑھ جائے تو SOS کے طور پر یہ گولی منگوا کر رکھ لیجئے گا۔''

مگر وہ ایمرجنسی کی دوا ہمیں استعمال نہیں کرنی پڑتی کیونکہ نفیس کی طبیعت اچانک سنبھل جاتی ہے۔

''میں اسے گھر سے باہر بھگا دیتی ہوں۔'' شام کے وقت میں کہتی ہوں۔

''نہیں۔ تھوڑا سا وہ ڈر گیا ہے، مگر میرا خیال ہے اشرف کو یہ جانور پسند آئیگا۔ دونوں کی فطرت بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ شاید اشرف کے لئے ایسے ہی ایک پٹ کی ضرورت تھی۔ یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

گرچہ مجھے پتہ تھا نفیس نے شعوری طور پر یہ بات نہیں کہی تھی مگر جانے کیوں مجھے اس کی بات پسند نہیں آئی۔

''وہ پٹ نہیں، ایک خالص جانور ہے۔ اسے میں نے ایک جانوروں کے ٹرینر سے خریدا ہے۔'' میں کہتی ہوں۔ ''اور اگر ہم اسے لوٹانا چاہیں تو اس نے ہمیں کچھ دنوں کا وقت دیا ہے۔''

''مجھے اس سے مل کر خوشی ہوگی۔ شاید اس جانور کے سلسلے میں ہم اس سے مزید جانکاری حاصل کر سکیں۔''

میں اشرف کے کمرے میں جا کر دیکھتی ہوں وہ تکیہ کے نیچے سر رکھ کر گہری نیند سو رہا ہے۔ تکیہ اس کے سر سے ہٹا کر میں اس کے پسینہ میں ڈوبے ہوئے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک لوری گاتی ہوں جسے برسوں پہلے میں بھول چکی تھی، اور لوری ختم ہو جانے کے بعد دوبارا بھول جاتی ہوں۔

اس رات گھر کا سکون زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ سونے سے قبل گھر کی روشنیاں بجھتے ہی وہ جانور چیخنے لگتا ہے اور اپنی طوطے کی طرح کرکش آواز سے گھر سر پر اٹھالیتا ہے۔

''اسے تیرگی نہیں بھاتی۔'' میر اشوہر بالکنی کا بلب جلا دیتا ہے جس کے ساتھ ہی جانور چپ ہو جاتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں بالکنی سے ایک عجیب بدبو آرہی ہے۔ چونکہ نوکرانی اس کے قریب جانے سے ڈرتی ہے مجھے ہی بالکنی کو صاف کرنی پڑتی ہے۔ اس کا پیشاب اور اس کی نجاست کسی انسان سے ملتی جلتی ہے جس کی مجھے عادت ہے۔ میں جب اپنے مخصوص برش اور گیلے کپڑے سے ہمیشہ کی طرح ناک پر کپڑا لپیٹ کر پیشہ ورانہ مہارت سے بالکنی صاف کرتی ہوں تو اس کا چہرا عجیب ڈھنگ سے میری طرف اٹھا ہوا ہے جیسے اس کی آنکھوں کے اندر سے میرا بچہ جھانک رہا ہو۔ اس کی چونچ کھلی ہوئی ہے جس کے کونے سے رطوبت فرش پر ٹپک رہی ہے۔ میں اس سے فاصلہ رکھتے ہوئے اپنا کام کرتی رہتی ہوں۔ بعد میں ہم اسے چھت میں ایک کھلی جگہ پر باندھ دیتے ہیں۔

میں اس دن سے شدت کے ساتھ جانور کے مالک کا انتظار کرنے لگتی ہوں، مگر ایک ہفتہ گذر جانے کے بعد بھی وہ نمودار نہیں ہوتا اور اس کے بعد کئی ہفتے گذر جاتے ہیں اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اب ہم اس جانور کے ساتھ زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ اسی درمیان نفیس کے ہات کا زخم ٹھیک ہو گیا ہے گرچہ کھرچنے کے نشان دائمی طور پر اس کی جلد پر رہ گئے ہیں۔

''ہمیں اس کے لئے ایک پنجڑا بنانا چاہئے۔'' ایک دن میر اشوہر کہتا ہے اور میں چونک پڑتی ہوں۔ پنجڑا؟ یہ بات اس کی فطرت سے مطابقت تو نہیں رکھتی۔ ''کون جانے اگر زنجیر اس کی گردن سے چھوٹ گئی تو وہ کسی کو بھی زخمی کر سکتا ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا جواز پیش کیا۔

"ہم اس طرح کے معاملات سے پہلے بھی گذر چکے ہیں نا؟" میں اس کا ڈھارس بندھانے کے لئے اشرف کا حوالہ دیتی ہوں جو اس جانور ہی کی طرح کبھی کبھار انتہا پسندی پر اتر آتا ہے۔ مگر مجھے اندر ہی اندر میرے شوہر کا مشورہ برا نہیں لگتا اور ہم ایک لوہار کے ذریعے چھت پر اس کے لئے ایک پنجڑا بنواتے ہیں۔ اب وہ پنجڑے کے اندر بیٹھا ہماری طرف تاکتا رہتا ہے۔ اس کے پنجڑے کو نجاست سے صاف رکھنے کے لئے ہر روز اسے پنجڑے سے باہر لانا پڑتا ہے اور یہ بہت ہی خطرناک لمحہ ہوتا ہے۔

"جانور کی فطرت!" میرا شوہر کہتا ہے اور میں دیکھتی ہوں اس نے چمڑے کا ایک چابک خرید لایا ہے۔ پہلا چابک پیٹھ پر پڑتے ہی جانور حیرت سے ہماری طرف تاکتا ہے جیسے اس کی اسے امید نہ تھی۔ وہ اپنی زنجیر توڑ کر نکلنا چاہتا ہے مگر پے در پے چابک پڑتے رہنے پر وہ بلبلا کر سپر ڈال دیتا ہے۔ بہت جلد میرا شوہر اس پر چابک مارنے میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لیتا ہے جیسے وہ اسی چابک کے ساتھ پیدا ہوا ہو۔ بلکہ اب تو اس نے اسے چابک مار مار کر پچھلے دونوں پیروں پر کھڑے ہو کر چلنا بھی سکھا دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اسے اب اپنے اس کام میں لطف آنے لگا ہے کیونکہ اب بلاوجہ بھی اس نے اس پر چابک کا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ شاید اس چابک کے سبب ہے کہ جانور اب ٹھیک سے کھانے پینے لگا ہے بلکہ اب کھانے پینے کی چیزوں میں وہ کوئی بھی تفریق نہیں کرتا۔ اس کے بالوں کے بیچ چابک کے نشانات صاف نظر آنے لگے ہیں۔ گاہے گاہے ہمیں اس کی مرہم پٹی بھی کرنی پڑتی ہے۔ مگر یہ عجیب واقعہ ہے کہ اس کے اندر جتنی وحشت کم ہوتی جا رہی ہے ہمارے بچے کے اندر اسی تناسب سے وہ بڑھنے لگی ہے۔ اسی دوران اس نے ٹی وی کو ڈھکیل کر نیچے گرا دیا ہے، بہت ساری کتابیں پھاڑ دی ہیں (گرچہ انھیں کھولے ہمیں عرصہ گذر چکا ہے)، تپائی کو سامانوں سمیت الٹ دیا ہے، اور اوون میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر اسے جلانے کی کوشش بھی کی ہے۔ میں اسے روکنے کے لئے اپنی انگلی پر اس کے دانتوں کے زخم کھا چکی ہوں۔ اس نے بستر کو پیشاب اور نجاست سے کچھ زیادہ ہی گندا کرنا شروع کر دیا ہے جیسے اس کے لاشعور میں اذیت کوشی کا کوئی جذبہ پل رہا ہو۔ مگر ہمیشہ کی طرح میں اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اسے سنبھال لیتی ہوں۔

"ماما پٹ، ماما پٹ۔" وہ چلّاتا رہتا ہے۔ آخر کار تھک کر ہم اسے اس عجیب الخلقت جانور کے پاس لے جاتے ہیں جس کی داہنی آنکھ چابک کی مار کھا کھا کر ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ اس کا دل بہلانے کے لئے نفیس جانور کو پنجڑے سے نکال کر اس پر چابک برسانے لگتا ہے۔ ہمارا بچہ اسے چابک کھاتے دیکھ کر تالیاں بجانا شروع کر دیتا ہے اور ہم حیرانی سے دیکھتے ہیں کہ ان لمحوں میں وہ ایک بالکل نارمل انسان نظر آ رہا ہے۔

"پٹ ماما، پٹ، گھوڑا، ہپو، الیفنٹ۔۔۔" اشرف تالیاں بجاتے ہوئے چیخ رہا ہے۔

"اور ڈک" میرا شوہر چابک سے جانور کی مقعد پر وار کرتا ہے۔ جانور کے بدن میں کپکپی دوڑ جاتی ہے۔ وہ پنجڑے کی تیلیوں کو پنجوں سے تھام کر پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہے اور سماج کا ایک بہت ہی مظلوم انسان نظر آ رہا ہے۔

"منہ کھولو۔" میرا شوہر چابک اٹھاتا ہے۔ وہ اپنی چونچ کھول دیتا ہے جس کے اندر ہم گوشت کا ایک ٹکڑا ڈال دیتے ہیں۔ اسے وہ فوراً نگل جاتا ہے۔ ان دنوں وہ بے چون وہ چرا سب کچھ نگلنے لگا ہے یہاں تک کہ ایک دن اشرف کے ہات سے وہ ایک ٹوتھ برش بھی کھا جاتا ہے۔ اس نے نجاست کے لئے ایک خاص وقت بھی مقرر کر لیا ہے اور رات کی تیرگی میں ہم اس کے منہ پر چمڑے کی ایک تھیلی کس دیتے ہیں جو اسی مقصد سے بنائی گئی ہے۔ اسے پہلے تو اس نے پنجڑے کی تیلیوں سے رگڑ رگڑ کر الگ کرنے کی کوشش کی تھی مگر پھر چابک کی مار کھا کھا کر اسے پہنے رہنا قبول کر لیا تھا۔

"اس رفتار سے وہ کچھ دن کے اندر بالکل تہذیب یافتہ ہو جائگا۔"

"ہم انسانوں کی طرح۔" میں مسکرا کر کہتی ہوں۔

"بالکل، بلکہ انسانوں سے بھی زیادہ۔"

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہم نے اس جانور کو سدھا دیا ہے۔ اس جانور کے سبب ہمارا گھر ایک خاص گھر بن گیا ہے۔ پاس پڑوس کے لوگ اس جانور کو دیکھنا چاہتے ہیں، مگر ہم اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم تو اس قابل بھی ہو گئے ہیں کہ اسے ہماری ضرورت کے مطابق آواز نکالنے پر مجبور کریں یا یا کسی پالتو کتے کی طرح "ٹائگر سائلنس" کہہ کر یکلخت خاموش کر دیں۔ کل تک وہ جس کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا آج اسے نفاست سے کھانا سیکھ گیا ہے۔ کاش، ہم سوچتے، اس کی طرح ہم اپنے بچے کو بھی ٹھیک کر پاتے جو پچھلے بیس برس میں ذرا بھی نہیں سدھرا۔ ایک دن ہم دیکھتے ہیں کہ جانور اور ہمارا بچہ ایک جیسی آوازیں نکال رہے ہیں۔

"دونوں ایک دوسرے کو سمجھ پا رہے ہیں۔" میرا شوہر کہتا ہے مگر مجھے پتہ ہے وہ صرف جانور کی نقل کر رہا ہے۔ ایک بار اشرف چابک اپنے باپ کے ہاتھ سے لے کر جانور کو مارنے لگتا ہے۔ زنجیر سے بندھا جانور اشرف کے طاقتور ہاتھوں سے چابک کی مار کھا کھا کر لہولہان ہو جاتا ہے مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے تھک کر ہمارا بچہ اس رات گہری نیند سو جاتا ہے اور یہ ان چند نادر راتوں میں سے ایک ہے جب ہم دونوں بستر پر اپنی شہوانی بھوک بلا روک ٹوک کسی وحشی کی طرح مٹاپاتے ہیں۔

"تم ان پچیس برسوں کے بعد بھی ایک حیرت انگیز عورت ہو۔" پسینے میں شرابور میرا شوہر میری گردن کو چومتے ہوئے کہتا ہے جہاں انزال کے وقت اس کے دانتوں کے کاٹنے کا نشان رہ گیا ہے۔ اپنی ٹانگوں کے بیچ کے گیلے پن کو محسوس کرتے ہوئے مجھے یاد آتا ہے کہ میں تو یہ بھول ہی چکی تھی کہ میں ایک عورت ہوں۔

وہ خوبصورت رات گذر جاتی ہے مگر بہت ہی عجیب طور پر ہمارے اندر دبی ہوئی نفرت اور غصے کے سیفٹی والوو* کو بھی کھول دیتی ہے۔

"اچھا ہوا کہ جانور کا مالک نہیں آیا۔" صبح ٹوتھ برش کرتے ہوئے میں نفیس سے کہتی ہوں۔ وہ گہری نیند سو کر اٹھا ہے اور دوسرے دنوں کے مقابلے بہت پر سکون نظر آ رہا ہے۔ "ہمیں شاید اسی جانور کی ضرورت تھی۔"

کیا یہ ہماری گفتگو کا نتیجہ تھا کہ دوسرے ہی دن جانور کا مالک آ دھمکتا ہے؟ وہ کافی خوش دکھائی دے رہا ہے۔ اس نے ایک نئی عینک لگا رکھی ہے جس کے کالے شیشوں پر بادل بنے ہوئے ہیں۔ ان بادلوں کے پیچھے اس کی آنکھیں کافی بڑی نظر آ رہی ہیں۔

"ہم اس جانور کی قیمت دینے کے لئے تیار ہیں۔" میں ناخوشگواری سے کہتی ہوں۔ ہم اسے چائے کے لئے بھی نہیں پوچھتے۔ مگر وہ بہت ہی پر اسرار ڈھنگ سے مسکرا رہا ہے۔

"قیمت؟" وہ کہتا ہے اور اس کے لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں کے بیچ اس کے سفید دانت اس بری طرح چمک اٹھتے ہیں جیسے وہ نقلی ہوں۔ "قیمت کی بات آپ سے کس نے کی بی بی؟ میں تو اس سے زیادہ بہتر آفر آپ کو دینے والا ہوں۔ وہ جسے Once in a lifetime آفر کہتے ہیں"

اور مجھے خاموش دیکھ کر وہ سامنے کی طرف جھک کر کہتا ہے۔

"آپ کا بچہ!"

"شٹ اپ!" میں چیخ پڑتی ہوں۔ "کیا وہ کوئی جانور ہے جو میں تمہیں دونگی؟"

"یہ ہے ناحیرت انگیز، میں نے کہا صرف 'آپ کا بچہ' اور آپ نے اسے معاضے کے طور پر سوچ لیا کیونکہ یہ آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ ہاں میں یہی آفر دے رہا ہوں جسے آپ ٹھکرا بھی سکتی ہیں۔" اس کی خوش مزاجی میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا تھا بلکہ وہ اپنی دونوں ہتھیلیاں بھی مسل رہا تھا جیسے اندر ہی اندر کسی بات پر نادم ہو۔

"میں جانتا ہوں آپ کا بچہ ایک انسان کا بچہ ہے مگر آپ کو یقیناً اس بات کا پتہ ہو گا کہ وہ اصل میں کیا ہے؟ آپ نے دیکھا ہو گا میرے جانور کو کتنی آسانی سے آپ نے بدل ڈالا ہے۔ مگر کیا اپنے بچے کو پچھلے بیس برس کی کوشش کے بعد بھی آپ بدل پائے؟ کیوں؟ کیونکہ آپ دونوں انسانی جذبات کے ہاتھوں مجبور تھے جو مجبوری میرے جانور کے ساتھ آپ کو کبھی پیش نہیں آئی۔ اسی لئے میں یہ آفر آپ کو دے رہا ہوں۔ میں ایک مہینے کے بعد پھر آؤں گا اپنا جانور لینے، اب یہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ کون سا جانور دینا چاہیں گی۔"

وہ تیزی سے ہمارے ڈرائنگ روم سے نکل جاتا ہے۔ میں چھت کی چہار دیواری سے سر نکال کر دیکھتی ہوں وہ اسی وین میں جا کر بیٹھ رہا ہے جس میں طرح طرح کے جانور نما انسان اور انسان نما جانور بیٹھے ہوئے ہیں۔ وین کے گرد متجسس لوگوں کا ہجوم کھڑا ہے۔ اس دن میرے شوہر کے لوٹنے پر میں اس کے سینے سے لپٹ کر سسک سسک کر رونے لگتی ہوں۔

"ہم اسے اس کا جانور واپس کر دیں گے۔" میرا شوہر میرے سر پر دلاسے کا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے پھر وہ ڈاکٹر لانے چلا جاتا ہے کیونکہ اشرف نے اپنا جلا ہوا ہات پھر سے زخمی کر لیا ہے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ ایک آہ بھر کر اشرف کی طرف تاکتا ہے۔

"بیس سال؟" وہ کہتا ہے۔ ہمیں پتہ ہے ہم دونوں ایک ہی چیز سوچ رہے ہیں، بیس سال، اشرف بیس برس کا ہو چکا تھا اور اتنے برس نہ ہم کہیں گھومنے گئے نہ ہم نے دوستوں رشتہ داروں کی تقریبات میں ٹھیک سے حصہ لیا بلکہ ہم نے تو کبھی کسی کو مدعو کرنے کی جرائت بھی نہیں کی۔ دوسری طرف مجھے اپنی نوکری چھوڑنی پڑی تھی کیونکہ اشرف کے لئے ہر پل گھر میں کسی نہ کسی آدمی کا رہنا ضروری تھا۔ وہ کوئی جانور تو نہ تھا کہ ہم اسے پنجڑے میں ڈالتے، اس پر چابک برساتے، اس کے منہ پر کپڑا باندھتے۔ ایک بار شروع کی طرف ہماری غیر موجودگی میں ایک نوکر (جسے ہم نے اس واقعے کے بعد کام سے نکال دیا تھا) اسے رسی سے باندھ کر سو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی دنوں تک توڑ پھوڑ پر اتر آیا تھا۔ یہی وقت تھا جب ہم اسے Home بھی لے گئے جہاں اس طرح کے مریض رکھے جاتے تھے۔ مگر ایک ہفتے کے بعد جب ہم اس سے ملنے گئے تو اس کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہو چکی تھی۔

"میں نے سنا ہے اس طرح کے بچے زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہتے۔" ایک دن میرے شوہر نے کہا تھا اور اس کے بعد ہم نے اپنی ساری محبت اس پر مرکوز کر دی تھی۔ مگر بیس برس کا ایک لمبا عرصہ گذر گیا تھا اور بیس برس کا عرصہ اور بھی لمبا ہو جاتا ہے خاص طور پر جب جنگ اتنی شدید ہو۔ اور اسی درمیان اشرف دن بدن زیادہ تندرست زیادہ لحیم شحیم ہوتا چلا گیا۔ شاید اس طرح کے بچوں کے ساتھ قدرت دوسری طرح سے ہر کمی پوری کر دیتی ہے۔

"قدرت کے پاس کوئی انصاف نہیں۔" میرے شوہر نے رات کے حصّے میں کہا جب کہ جانور کرکش آواز نکال رہا تھا کیونکہ ہم اس کا منہ باندھنا بھول گئے تھے۔ مگر اس وقت ہمارے اندر اتنی سکت نہ تھی کہ اتنی رات گئے جب کہ چھت کہرے میں ڈوبی ہوئی تھی پنجڑا کھول کر یہ کام انجام دیتے۔ "اتنے برس گذر گئے، ہم نے اشرف کی خاطر دوسرے بچے کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔"

کیا ہم شکایت کر رہے تھے؟ تو کس سے؟

دوسرے دن دھوپ بہت دیر سے نکلی۔ مگر اس کے نکلتے ہی نفیس نے جانور پر رات بھر کے چلانے کا غصّہ اس طرح نکالا کہ وہ پنجڑے کے باہر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ہم نے اسکے منہ پر پانی مار مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اشرف اسے دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہا تھا، اس کی بھاری دم کھینچ رہا تھا۔ اس نے اس کے اوپر بیٹھ کر اس کی طرح کرکش آواز نکالنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن آج ہمیں اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ اور گرچہ جانور دھیرے دھیرے ہوش میں آ گیا اور ہمارے اشارے کا انتظار کئے بغیر چپ چاپ پنجڑے کے اندر چلا گیا بعد میں اس کی مرحم پٹی کرتے وقت ہم اس کی آنکھوں سے گریز کر رہے تھے جیسے وہ کوئی جانور نہیں انسان ہو۔ چھت کے کونے میں اس کی چونچ سے نچی نچائی مرحم پٹیوں کا پہاڑ سا بن گیا تھا جس سے ایک عجیب بدبو آنے لگی تھی۔ ہم نے اس کے لئے کسی ڈاکٹر سے گریز کیا تھا۔ ہمیں لگا تھا اس کا علاج ہم کر سکتے ہیں۔ اس دن کے واقعے کے بعد میں نے محسوس کیا میرے شوہر کا سلوک اس جانور کے ساتھ بدل گیا تھا، وہ نہ صرف اس کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش آنے لگا تھا بلکہ اسی تناسب سے اس نے اب اشرف کی طرف سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا تھا۔

"تم اشرف سے نفرت کرنے لگے ہو۔" ایک دن میں نے اس سے شکایت کی۔

"جھوٹ ہے یہ۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اشرف سے جتنا پیار کرتا ہوں اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتی۔ مگر اس جانور کے اندر کی تبدیلی حیرت انگیز ہے۔ ہے نا؟"

مجھے پتہ تھا وہ جھوٹ کہہ رہا ہے، مگر میرے پاس اشرف کے دفاع کے لئے کوئی اسباب نہ تھے۔ پچھلے بیس برس کی تھکن نے مجھے بھی آ لیا تھا۔ اشرف کی نجاست سے اب مجھے بو آنے لگی تھی۔ اس کے تھوکے ہوئے کھانے میرے بدن میں کپکپاہٹ پیدا کرنے لگے تھے۔ اب نیند کے عالم میں اس کے بال اور ناخن کاٹنا، اس کی شیونگ کرنا مجھے اچھا نہ لگتا تھا، کپڑا پہناتے وقت اس کے ننگے پن سے میں گھبرانے لگی تھی کیونکہ (شاید میرے ہاتھوں کے لمس سے) اب وجہ بے وجہ اسے Erection بھی ہونے لگا تھا۔

"ہم لوگ دنیا کے سب سے دکھی انسان ہیں۔" ایک دن میں نے اپنے شوہر کے سینے پر سر رکھ کر کہا۔ میرے گرم آنسو اس کی پسلیوں پر اگے بالوں کے اندر جذب ہو رہے تھے۔ "کیا ہمیں اور دوسرے لوگوں کی طرح خوش رہنے کا حق نہیں؟"

"بیس سال بعد یقیناً ہم اتنا تو سوچ سکتے ہیں۔" اس نے جملہ ابھی پورا نہیں کیا تھا کہ ہمیں اشرف کی چیخ سنائی دی اور ہم دونوں اس کے کمرے کی طرف بھاگے۔ اندر ہم نے جو منظر دیکھا اس نے ہمیں کراہیت سے بھر دیا۔ اشرف پتلون گھٹنوں کے نیچے سرکائے کھڑا تھا اور مشت زنی میں مصروف تھا۔ تلذذ کی انتہا پر پہنچ کر اس کی آنکھیں جل رہی تھیں، اس کے حلق سے چیخنے اور غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یکایک اس نے ایک زور کی چیخ ماری اور اس کے بدن پتلون اور بستر پر مادہ منویہ کی برسات سی ہو گئی۔

"میں اسے صاف نہیں کر سکتی۔" میں نے چیخ مار کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے باہر بھاگتے ہوئے کہا۔ "آخر میں ایک عورت ہوں۔ میں ایک عورت ہوں۔"

وہ اتوار کے دن نمودار ہوا تھا، تاکہ، جیسا کہ اس نے ہمیں بتایا، ہم دونوں میاں بیوی گھر پر موجود رہیں۔

"کہاں ہے میرا جانور؟" اس نے ایک ہات میں زنجیر اور دوسرے ہات میں چمڑے کا چابک تھام رکھا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو سرے سے نظر انداز کر دیا تھا۔ ہم دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ وہ گھر کے اندر گیا اور ہمیں چابک کی آواز کے ساتھ ساتھ جانور کے چیخنے کی آواز سنائی سنائی دینے لگی۔ پھر وہ شور فرد ہو گیا اور وہ آدمی نمودار ہوا۔ اشرف اس کے پیچھے تھا۔ اس کی کمر سے زنجیر بندھی تھی اور اشرف دھندلی آنکھوں سے اس آدمی کی طرف تاک رہا تھا جیسے اسے ہم لوگوں سے کوئی مطلب نہ ہو۔

"یہ سودا مہنگا نہیں بی بی۔" اس آدمی نے ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ "میں جو جانور لے جا رہا ہوں اس سے ہمارا کوئی جذباتی تعلق نہیں جس طرح جو جانور میں چھوڑے جا رہا ہوں اس سے آپ لوگوں کا کوئی جذباتی رشتہ نہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں سودا واقعی برا نہیں۔ آپ کو اچھی طرح پتہ ہے یہ انتظام سب سے بہتر ہے بلکہ اس انتظام کے تحت زندگی زیادہ بہتر طریقے سے گذاری جا سکتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ کسی بھی دن اگر اس جانور سے جسے میں چھوڑے جا

رہا ہوں اکتا جائیں تو کسی جانور کے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر مہلک انجکشن کے ذریعے اسے ایک ابدی نیند سلا سکتے ہیں جس کی قانون کی طرف سے اجازت ہے، اور وہ اجازت نامہ بہت جلد بذریعہ ڈاک میں آپ کو بھجوا دوں گا یا اگر آپ بہت ہی کمزور ثابت ہوئے تو کسی بھی سڑک پر یا کسی پبلک پارک کے اندر اسے چھوڑ کر پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔ اس طرح کے جانوروں کی ہمارے سماج کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔"

ہم چھت پر کھڑے انھیں نیچے سڑک سے گذرتے دیکھتے رہے۔ اشرف اس کے پیچھے پیچھے اپنی کمر سے بندھی زنجیر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے، سر جھکائے وفاداری سے ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک پل کے لئے وہ رک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا مگر پیٹھ پر چابک کی مار پڑتے ہی دوڑتا ہوا گاڑی تک گیا جس کا پیچھلا دروازہ ایک عجیب و غریب ہاتھ نے نمودار ہو کر کھول دیا۔

اس وین کے اندر ہمیشہ کی طرح بہت سارے انسان نما جانور اور جانور نما انسان بیٹھے ہوئے تھے۔

اچھا خاصا چیروا

'We must take him back now. Before the spirits of the forest start to smell him', she said o Ben okri o The Famished Road

جاڑے کی ایک صبح ایک قبائلی اپنے سور کے ساتھ پہاڑ سے اُترتا دکھائی دیا۔ وہ اسے بیچنے کے لئے جس قصبہ کی طرف جارہا تھا، وہاں عیسائی آباد تھے۔ مشن اسپتال کے باہر جس کی بنیاد پر یہ قصبہ بسا ہوا تھا اس نے سور کی تھوتھنی کو اپنے کرتے کے کونے سے صاف کیا اور کہا:

"رات بھر جانے کتنے لوگوں کا منہ تجھے دیکھ کر پانی سے بھر آیا ہو گا۔"

سور کا رنگ خاکستری تھا۔ اس کے جسم کی ایک ایک پور سے پسینہ چھوٹ رہا تھا اور وہ بڑی بدتمیزی سے ریاح خارج کر رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد مذبح تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس اذیت ناک زندگی سے نجات ملے۔ گرچہ آدمی کا ذہن اس کے اس ارادے کو سمجھنے سے قاصر تھا مگر سور نے اپنا فیصلہ خود کو سنا دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح بے رحمی کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تیز دھار والے آلے سے کٹنا زیادہ پسند تھا۔ گاؤں کی واحد پگیری ایک چھپر کے نیچے واقع تھی جسے الفانسو ہیمبرم چلاتا تھا۔ اس چھپر پر دائمی طور پر ایک دو گدھ یا چیل بیٹھے پہرا دیا کرتے۔ گاؤں کے تمام سوروں کا سفر اسی چھپر کے نیچے ختم ہوتا تھا مگر جنگلیوں کے عام رواج کے مطابق وہ سوروں کو اذیت دے دے کر، ڈھلانوں میں یا چٹانوں کے گرد دوڑاتے ہوئے بھالوں سے بھونک بھونک کر انہیں نڈھال اور نیم جان کر دیتے، پھر الفاظ ہیمبرم کے گدھ پوش چھپر کے نیچے اس سانس لیتی ہوئی لاش پر آخری کام ہوتا۔

سور اپنی تھوتھنی اُٹھا کر مشن اسپتال کے آہنی پھاٹک کے غیر مستعمل سرے پر چڑھی ہوئی بوگنویلیا کی بیل کو سونگھ رہا تھا۔ اندر تاحدِّ نظر پھیلے ہوئے لان میں سربلند پیڑوں، کیکر، شہ توت اور دوسری جنگلی، کٹیلی جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس جنگل میں دوڑتی گلہریوں، پھدکتی چڑیوں اور کیڑے مکوڑوں کو دیکھ رہی تھیں، جنھیں عام انسانی آنکھیں عام طور پر دیکھنے سے معذور ہوتی ہیں۔

"ہر جگہ ایک ہی سی دنیا چل رہی ہے۔" سور نے خود کو دلاسا دیا۔ "قدرت نے ہر چیز کو پیدا کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اس کے زندہ رہنے کے لئے ایک دوسری چیز پیدا کی جائے۔ اس نے انسان کے لئے مجھے پیدا کیا اور میرے لئے کیڑے مکوڑے اور ان حشرات الارض کے لئے انسان۔ گویا چکر جاری ہے۔"

لڈو چیروا، جو دراصل اس پہاڑی کا نام تھا، ان دنوں زیادہ چالاک بننے کی جدوجہد میں مبتلا تھا۔ اسی لئے اس نے الفانسو ہیمبرم کو نظر انداز کر دیا تھا مگر اب اسے پتہ چل رہا تھا کہ سور کو بیچنا، جسے وہ اتنے اوپر سے ڈھو کر لایا تھا اتنا آسان کام نہ تھا۔ اول تو گائے، بیل، بکریوں کی طرح اس کا کوئی ہفتہ وار ہاٹ نہیں لگتا تھا، دوسرے سور کو کسی چوراہے پر کھڑے ہو کر بیچنے کے لئے بولی لگانا کچھ اٹ پٹا سا عمل تھا۔ لڈو چیروا کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور وہ بار بار تھوک کے گھونٹ حلق سے نیچے ڈھکیل رہا تھا۔ فی الحال اسے ("اور مجھے بھی") پیاس بجھانے کے لئے کسی کنویں یا سرکاری نل کی ضرورت تھی مگر وہ واحد کنواں جسے وہ اور خنزیر دیکھ پا رہے تھے وہ اسپتال کے لان میں جھاڑیوں اور قدیم داڑھی دار پودوں کے بیچ نظر آرہا تھا۔ کنویں کی منڈیر پر ایک رنگین گرگٹ چوکنا بیٹھا پہرا دے رہا تھا۔

" یہ کنواں کچھ زیادہ استعمال میں نہیں آتا ہے شاید۔" سور سوچ رہا تھا۔ "شاید اس کے پانی میں سانپ اور دوسرے کیڑے مکوڑے کلبلا رہے ہوں۔"

لڈو چیروا سور کو گھسیٹتے ہوئے اسپتال کے لان میں داخل تو ہوا مگر اس کے دل کے اندر بھی کچھ اس قسم کے وسوسے سر اُٹھا رہے تھے۔ کنویں کا گھیرا کافی بڑا تھا اور اس کی دونوں چرخیاں سلامت تھیں ۔ ایک پر انا زنگ کھایا ہوا ڈول نائلن کی بے رونق رسی کے ساتھ کنواں کے صحن پر دھرا تھا۔ لڈو چیروا نے ڈول اُٹھا کر چرخی کے اوپر سے گزارتے گزارتے ایک نظر کنویں کے اندر ڈالی۔ کنویں کی اندرونی دیوار جھاڑیوں اور پودوں سے تڑخ رہی تھی۔ پیندے کا پانی ہلال کی شکل میں چمک رہا تھا۔

"کم از کم ڈول سے اس بات کا پتہ تو چلتا ہے کہ اس کا پانی استعمال میں آتا ہے۔" لڈو چیروا نے ڈول کو چرخی پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ چرخی کے بولنے کی آواز سے سور چونک پڑا۔ اس نے کنوئیں کی منڈیر پر رسی اور ڈول کے دباؤ سے جھکے ہوئے لڈو چیروا کے جسم کو دیکھا۔ "کاش" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ کوئی غیبی طاقت اسے اندر کھینچ لے مگر اس سے نقصان تو میرا ہی ہے۔ میں اپنی پیاس کیسے بجھاؤں گا۔"

پانی ٹھنڈا اور نمکین تھا جیسے کسی نے اس کا سارا مزا نکال لیا ہو۔ دونوں کے پیٹ جتنا سہار سکتے تھے وہ اس سے زیادہ ڈکار گئے۔ سور اپنی تھوتھنی اسی دوران کنوئیں کے صحن کے کنارے کی ہری گیلی گھاس کے اندر ڈال چکا تھا اور زمین کو کوڑنے لگا تھا۔ لڈو چیروا نے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ کاش میں بھی سور ہوتا اور مجھے اپنی بھوک مٹانے کے لئے اتنی احتیاط سے کام لینا نہ پڑتا۔ اگر سور بک گیا ہوتا تو وہ پیٹ بھر ہنڑیا کھا کر اور تھوڑی دیسی شراب اوپر سے انڈیل کر کب کا پہاڑ کی طرف روانہ ہو چکا ہوتا۔ آہ،

پہاڑ کے نیچے کی دنیا کتنی خوفناک، کتنی وشال ہے۔ کتنا عجیب ہے سب کچھ اس میدان میں۔ اس سپاٹ دھرتی پر آسمان سے اتنی دور رہ کر کیسے لوگ زندہ رہ پاتے ہوں گے؟ اسے تو ابھی سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا بدن آدھا زمین کے اندر دھنس گیا ہو۔ سب کچھ اس کے اوپر ہو اور وہ سب کے پیروں کے نیچے۔

"پہاڑ کی ڈھلانوں میں کتنی بلندی پر ہوا کرتے تھے ہم لوگ۔" سور سوچ رہا تھا۔ "کتنی پستی ہے یہاں۔ اب بہتر یہی ہے کہ جلد سے جلد میرا قصہ پاک ہو جائے۔ ایک بات تو طے ہے۔ میں ان میدان والوں کے ہاضمے کے لئے ایک کڑا امتحان ضرور ثابت ہوں گا۔ میں ایک پہاڑی سور ہوں۔ خالص ہوا میں سانس لی ہے اور پتھر کو چیر کر نکالا ہوا پانی پیا ہے میں نے۔ کسی کمزور آنت کے بس کی بات نہیں ہوں میں۔"

لڈو چیرواہا تھ منھ دھو کر کدم کے ایک پیڑ کے نیچے کھڑا اس کے مدور ریشے دار پھولوں کو تاکتے ہوئے انگوچھے سے نتھنے پونچھ رہا تھا جب اس نے ان تینوں کو دھیرے دھیرے چل کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ لوگ عجیب ڈھنگ سے چل رہے تھے جیسے زمین ان کے موافق بنائی نہ گئی ہو۔ وہ ذرا قریب آئے تو بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ تینوں کوڑھ کے مریض تھے۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں میں انگلیاں برائے نام رہ گئی تھیں۔ تینوں دلچسپی سے لڈو چیرواکی طرف تاک رہے تھے، ان کی دھنسی ہوئی ناکوں کو دیکھ کر لڈو چیرواپریشان ہو گیا۔

"یہ کوڑھیوں کا اسپتال تو نہیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بالکل!" ایک کوڑھی نے جواب دیا۔ "اور اگر فادر سیڈرک کو پتہ چلے کہ تم نے ہمارے کنوئیں کا پانی پیا ہے تو ہماری خیر نہیں۔ یہ سور تمہارا ہے؟ اسے کہو زمین کو اس طرح کوڑ کر برباد نہ کرے۔ بیچنے کا ارادہ ہے؟"

"اور کیا!" لڈو چیروانے کہا۔ "مگر میرے پانی پینے سے تمہارے لئے مصیبت کیوں کھڑی ہو گئی۔"

"خیر جانے دو۔" دوسرے مریض نے کہا۔ "اسے فادر سیڈرک کے پاس لئے چلتے ہوں۔ سور صحتمند دکھائی دے رہا ہے۔ ممکن ہے فادر سیڈرک اسے اسپتال کے کچن کے لئے خرید لیں۔ تم اپنے جانور کو لے کر ہمارے پیچھے آسکتے ہو۔ کچھ نام وام دیا ہے اسے جسے سن کر یہ اشارہ قبول کرے۔"

"جیسے پہاڑی اتنے تہذیب یافتہ ہوتے ہیں!" سور نے چاروں کے پیچھے چلتے چلتے سوچا۔ "یوں بھی ہم سوروں کی الگ پہچان کہاں ہوتی ہے۔ ان جنگلیوں کو اپنے برچھے ہماری مقعد میں ڈالنے سے فرصت ہی کہاں کہ ہمیں کوئی نام دیں۔ ہمیں تو بغیر نام کے ہی مرنا پڑتا ہے۔"

کھچڑی داڑھی کے اوپر فادر سیڈرک کے ہونٹ گلاب کی طرح سرخ تھے۔ وہ اپنے کھپریل نما چھپر والی بنگلیا کے اونچے برآمدے پر بیت کی کرسی پر بیٹھے پائپ پی رہے تھے اور اپنی ناک کے بال توڑ رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت لوہے کی تپائی پر اس کے لئے چائے رکھ رہی تھی۔

"تو یہ سور تمہارا اپنا ہے! کہیں سے چرایا تو نہیں ہے تم نے اسے؟ اور میں بھی عجیب بیوقوف ہوں۔ بھلائی کوئی چور یہ قبول کرے گا؟" فادر سیڈرک نے اپنی ناک کے ٹوٹے ہوئے بال کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا جس کے منحنی سرے پر رطوبت کا گلوبچہ چمک رہا تھا۔ "اس اسپتال کا پتہ تمہیں کس نے دیا؟"

"ہمارے پہاڑ کے اس طرف اُتر کر مجھے معلوم تھا مائی باپ آپ کا اسپتال ہے۔"

"ارے مجھے مائی باپ نہ کہو۔ میں تو بس ایک ڈاکٹر ہوں یہاں۔" فادر سیڈرک ہنسے۔ "صرف اپنے گورے چمڑے کے لئے مشہور ہوں۔ اپنے ملک میں تو میرے لئے سوائے مردے پھاڑنے کے دوسرا کوئی کام میسر نہ ہوتا مگر میں یہ تجھ جنگلی سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ اس سے بہتر ہے کہ تیرے سور سے بات کی جائے۔"

"بالکل!" سور نے تھوتھنی اوپر کر کے کہا۔ "ہم سور ضرور ہیں مگر ہماری آنکھیں دوربین ہیں اور فادر سیڈرک، ہمارا پیٹ چیر کر آپ دنیا جہان کا علم برآمد کر سکتے ہیں مگر اتنی دور اندیشی کس کے پاس ہے بھلا۔ شاید یہی میرے سور پن کی دلیل ہے کہ میں بہت جلد اُمیدیں لگا بیٹھتا ہوں اس سے قطع نظر کہ ایک سور کے لئے انسان کا ردعمل یکساں طور پر تحقر سے بھرا ہوتا ہے چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو۔"

"فادر سیڈرک رحم!" لڈو چیرواابر آمدے پر اتنا جھک گیا تھا کہ اس کی ناک لال پکے کو چھو رہی تھی۔ "میں نے اسپتال کے کنویں کا پانی پیا ہے۔ کیا میری بھی ناک بیٹھ جائے گی؟"

"ہاں بالکل، میری طرح، دیکھ ادھر کیونکہ میں تو اسی اسپتال کے اندر رہتا ہوں۔ اس کا پانی پیتا ہوں۔ اس میں نہاتا ہوں۔" بوڑھے سیڈرک نے اپنی ناک انگلی سے دبا کر پچکاتے ہوئے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

"رحم مائی باپ!" لڈو چیروارو رہا تھا۔ "آپ یہ سور بلا قیمت رکھ لیں مگر مجھے اس مرض سے بچالیں۔ میں اب باقی زندگی کبھی پہاڑ سے نیچے نہیں آؤں گا۔" لڈو چیروانے مڑ کر سور کی پسلیوں میں اپنی کہنی سے ٹھوکر لگائی۔ "سب کچھ اس حرامی کے چکر میں ہو گیا سرکار۔ الفانسو ہیمبرم اپنے غلیظ دانت نکال کر مجھ پر ہنسے گا۔"

”حرامی تو۔ میں تو بس چند ہی دنوں کا مہمان ہوں۔“ سور نے کہا اور رسی کی رگڑ کو اپنے بدن پر محسوس کیا۔” اور الفانسو ہیمبرم مرنے کے بعد یقیناً سور بن کر پیدا ہو گا اور یہ لکھ لینا کسی فادر سیڈرک کے اسپتال میں اس پر چھرے چلیں گے۔“

”رحم فادر، رحم!“ لڈو چیرو اکے سفید آنسو لال فرش پر موم کے قطروں کی طرح جم رہے تھے۔ مجھ پر بپتسمہ کرالیں۔ میرے گلے میں کتے کا پٹّا ڈال دیں۔ مجھے سور کی انتڑیوں میں ڈال کر گھسیٹیں مگر اس کوڑھ کے مرض سے نجات دلائیں۔ میں نے اسپتال کے کنویں کا پانی پیا ہے۔

اور میں نے بھی۔ سور نے کہا۔ مگر میں تو تھوڑے ہی عرصے کا مہمان ہوں۔ وہ سوچیں جن کے پیٹ میں میں بسنے والا ہوں۔

فی الحال تو تم زمین سے کوڑھ کے جراثیم اپنی ناک پر بٹور رہے ہو۔ فادر سیڈرک کو اپنے مذاق پر اتنا لطف آیا کہ وہ اپنی کرسی پر گھوم سے گئے۔ جنگلی گدھے۔ کوڑھ تمہارے مغز میں ہے، پہلے اسے باہر نکالو۔ اور اس جانور کو کسی دوسری جگہ بیچو۔ ہمارے اسپتال میں اتنا بڑا دیگچا کہاں ہو گا بھلا۔“

رحم فادر! لڈو چیرو اکے الفاظ گلے میں اٹک رہے تھے مگر فادر سیڈرک اُٹھ کر بنگلیا کے اندر جا چکے تھے۔ تینوں مریض اپنے اپنے وارڈ کی طرف چلے گئے جو ان کی اپنی ہی بنائی ہوئی کھپریل کی جھونپڑیوں پر مشتمل تھے جن کی مٹی اور گارے کی دیواروں پر کھریا اور رنگین مٹیوں سے پھول اور پتے بنے ہوئے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ یہاں آنے والے اکثر مریض دائمی طور پر اس اسپتال کا حصہ بن جاتے ہیں۔

اب چلو بھی۔ سور نے کہا۔ بہتر ہو گا کہ ہم پہاڑ لوٹ چلیں اور الفانسو ہیمبرم کا تلوا چاٹیں۔

اسپتال کے باہر نصف فرلانگ کی دوری پر اسپتال سے چھٹکارا پانے والے مریضوں کا ایک گاؤں آباد تھا، کیونکہ وہ اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ گھروں کو لوٹ سکیں۔ اس کے چوراہے پر سورج ایک بڑے سے رنگین گولے کی شکل میں کرنج کے ایک پیڑ پر رکھا ہوا تھا۔ چوراہے پر گاؤں والوں کی بھیڑ تھی۔ ابھی ابھی وہاں مینڈھیں لڑائے گئے تھے۔ لوگ اس واقعہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ ہارا ہوا بکرا اپنے ٹوٹے ہوئے سینگ کی بے حرمتی اُٹھائے ہوئے کھڑا تھا۔ لڈو چیرو اکے سور کو دیکھ کر لوگ اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

کتنے میں خریدا؟

ضرورت سے زیادہ صحت مند ہے۔ بیمار تو نہیں۔ اب سمجھا، یہ تو پہاڑی سور ہے۔

اسے اسپتال میں جا کر بیچو۔ ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں! ہم تو شہروں میں جا کر بھیک مانگتے ہیں یا بڑے پادری کے گرجے کے باہر لائن لگاتے ہیں۔

ایک بوڑھا اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور اس نے لاٹھی کی نوک لڈو چیرو اکی قمیض سے لگائی۔ موٹی موٹی عینکوں کے باوجود اس کی آنکھیں بالکل ہی معذور تھیں۔

”تم نے سور کو کپڑے کیوں پہنا رکھے ہیں؟“

سارے لوگ ہنس پڑے۔ سور بھی مسکرا دیا۔

کسے خبر تھی، ایک بوڑھے کی آنکھیں اتنی صاف دیکھ سکتی تھیں۔ مبارک ہو بوڑھے گنہگار۔ میرے جسم کا سب سے اچھا پارچہ تمہارے نصیب میں ہو گا۔

گاؤں کے دو شرابی کہیں سے ایک خارش زدہ کتا اُٹھا لائے اور اسے لڈو چیرو اور اس کے سور پر چھوڑ دیا۔ کتا جو خود بھی ڈرا ہوا تھا، اتنے سارے لوگوں کی شہ پا کر دور سے بھونکتا رہا مگر دونوں خوفزدہ ہو کر گاؤں سے بگٹٹ بھاگ نکلے۔ سور آگے آگے تھا اور اس کی رسی تھامے، اس کے ساتھ خود کو کھنچاتے ہوئے لڈو چیرو اپیچھے پیچھے یہاں تک کہ بھاگتے بھاگتے زمین ختم ہو گئی اور وہ پہاڑ کے نیچے پہنچ گئے۔

الفانسو ہیمبرم اپنی جھونپڑی کے باہر کھڑا تھا جب اس نے ڈھلان میں، جہاں چٹانیں مینڈکوں کی طرح اُبھری ہوئی تھیں اور ضدی پیڑ اپنی مرئی جڑوں کے ساتھ کھڑے تھے لڈو چیرو اکو دیکھا۔ وہ اکیلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پی رکھی تھی۔ اس نے رات کہاں گزاری تھی اس کا نشان اس کے بدن پر موجود نہ تھا۔ لڈو چیرو االفانسو ہیمبرم کے مذبح کے سامنے ایک مینڈک نما چٹان پر بیٹھ گیا اور اس نے سور بیچنے کا واقعہ یوں بیان کیا۔

الفانسو، میرا سور بیمار تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے گاؤں والے اس کا گوشت ڈکاریں۔ میں نے جو کچھ کیا، گاؤں والوں کے لئے کیا مگر بدلے میں کوئی میرا احسان مند کب ہو گا۔ خیر مجھے اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں اس کے بغیر بھی انتہائی بدنصیب ہوں۔ میں نے گاؤں کی رسم توڑی ہے اور اس کی سزا کے طور پر تم دیکھ سکتے ہو میری ناک پچکنے والی ہے کیونکہ میں نے ایسے کنویں سے پیاس بجھائی ہے جس کے پانی سے کوڑھ کے مریض نہاتے ہیں۔ تو میں سور کو بیچنے میں ناکام واپس آ رہا تھا کہ پہاڑی ڈھلان پر ایک تین جھونپڑوں والے گاؤں پر رات ہو گئی اور میرے سور نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آہ، مجھے کیا پتہ تھا، یہ تینوں جھونپڑیاں تین چڑیلوں کی تھیں جو سورج ڈوبتے ہی پیڑوں میں جا بستی ہیں۔ ہم نے انہیں ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہروں پر جھریاں تھیں اور آنکھیں چربیوں کی تہ میں غرق۔ ہمیں دیکھ کر وہ

کھسیار ہی تھیں۔ انہوں نے قریب کے تین پیڑ چنے اور ان پر بیٹھے بیٹھے ہمیں بد تمیزی سے تنبیہ کرنے لگیں۔ ان کی آوازیں اس طرح آرہی تھیں جیسے برسات کی طوفانی ہوا بانس کے جھنڈے کے اندر سے سنسناتی آرہی ہو۔

اچھاخاصا چیروا۔ تیری کھوپڑی گل جائے! سور دے دے۔

بوڑھا بھینسا چیروا۔ تیرا فوطہ گل جائے! سور دے۔

ناٹا بھتیا چیروا۔ تیرا آدھا گل جائے! سور دے دے۔

الفانسو، قسم لے لو جو میری زبان سے پہلے پہل ایک بھی لفظ نکلا ہو مگر میں کب تک برداشت کرتا۔ میں بھی انسان تھا، مجھے بھی غصہ آگیا اور میں پتھر اُٹھا اُٹھا کر ان چڑیلوں پر پھینکنے لگا۔ وہ ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر کود رہی تھیں، کھکھلا کر ہنس رہی تھیں، پادرہی تھیں۔ اچھاخاصہ چیروا گارہی تھیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میرا سور بھاگ نکلا اور مجھے اس کی تلاش میں پہاڑ سے واپس میدان میں اُترنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے باہر سرسوں کے کھیتوں کے بیچ سور بھاگا جارہا تھا اور جب میں نے اس کی رسی تھامی تو وہ ایک مکان کے لکڑی کے دروازے پر تھوتھنی رگڑ رہا تھا جو گاؤں سے الگ تھلگ ایک سنسان جگہ پر کھڑا تھا۔ دروازہ ایک خوبصورت سی بچی نے کھولا تھا۔ رات ہم دونوں نے اس مکان میں گزاری۔ اس کے مالک کا نام رس راج ٹوڈو تھا۔ وہ سرسوں اور گنے کی کاشت کرتا تھا اور گنے کے موسم میں جب بدمست ہاتھیوں کے غول پہاڑ سے اُترتے ان سے نبٹنے کے لئے اسے سرکار نے بندوق دے رکھی تھی۔ میں نے جب اپنا پورا واقعہ سنایا تو اس نے تشویش کا اظہار کیا اور ازراہِ ہمدردی مجھے شراب پلائی۔ اس کی بیٹی میرے سور سے کھیل رہی تھی، اسے کھانا کھلا رہی تھی، اسے نام دے رہی تھی۔ اس رات میں نے ٹوڈو کے کمبل میں بڑی بے چین نیند گزاری۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ اول تو وہ کمبل ضرورت سے زیادہ آرام دہ تھا۔ دوسرے رات بھر وہ چڑیلیں مکان کے باہر چکر لگاتی رہیں۔ اچھاخاصا چیروا گاتی رہیں۔

بڑی بدروحوں والی رات ہے! رس راج ٹوڈو بھوت پریت کے معاملات میں ایک ڈرپوک عیسائی تھا۔ وہ بار بار اُٹھ کر عیسیٰ مسیح کی مورتی کے سامنے موم بتی جلا رہا تھا۔ باہر بڑی ٹھنڈ تھی۔ میرے خیال سے پہاڑ کے اوپر کی طرف ہی کہیں پالا گرا ہو گا۔ پیڑ پودے سبھی اس دھوپ کے باوجود گیلے دکھائی دے رہے ہیں۔ تو رات بھر تیز ہوا چلتی رہی اور تینوں چڑیلیں گاتی رہیں۔

اچھاخاصا چیروا۔ تیرے بال میں لٹکے بچھو! سور دے دے۔

اچھاخاصا چیروا۔ تیرے کان میں گھسے کان پھیڑو! سور دے دے۔

اچھاخاصا چیروا۔ تیرے بدن سے چپکے چلھڑ! سور دے دے۔

صبح نیند سے اُٹھ کر میں نے فیصلہ کیا میں اپنے سور کے ساتھ کبھی ان چڑیلوں کے جنگل سے گزر کر گھر واپس نہیں آسکتا اور میں نے اپنے دوست رس راج ٹوڈو کو سور تحفے میں دے دیا، جسے اس کی بڑی بیٹی نے فوراً ایک نام دے ڈالا اور سرسوں کے کھیت میں سیر کرانے چل دی۔

الفانسو ہیمبرم، کیا میں نے غلط کام کیا۔

الفانسو ہیمبرم نے کھانس کر گلا صاف کیا، اپنی بھینگی دانش مند آنکھوں سے آسمان کو ناپا، احترام کے ساتھ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور کہا۔

روحیں ہمارے پہاڑوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ کوئی ان کا قانون نہ توڑے ورنہ اس کا حشر بھی لڈو چیروا کی طرح ہو گا۔

نادر سکّوں کا بکس

میں ایک لمبے عرصے سے اس کی تلاش میں تھا۔ میں اپنا زیادہ وقت ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ تک پیدل طئے کرنے میں بتاتا۔ میرے کچھ دوست لانچ پر سوار جس کی چمنی سے دھواں نکل نکل کر ہوا میں منتشر ہوتا رہتا ہمیشہ دوسرے کنارے کی طرف جارہے ہوتے۔ میں انھیں دور سے ہاتھ ہلا کر الوداع کہتا اور وہ بینچ پر بیٹھے یا لوہے کے ریلنگ کے سامنے کھڑے میری طرف مایوسی سے تاکتے رہتے۔ انھیں اس بات کی فکر تھی کہ میں کبھی دوسرے کنارے پہنچ نہ پاؤنگا۔ ان کی سوچ کچھ غلط بھی نہ تھی۔

ابھی حال میں ہی میں نے ایک بے تکا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں نے ایک مرتے ہوئے بوڑھے کو، جس کا اس سیارے پر کہیں ٹھکانہ نہ تھا، اسپتال پہنچا کر اس کے باقی کے دنوں میں چند بیکار اضافے کیے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی، میں خود کو سمجھاتا، کہ بوڑھے نے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میں تھک کر بس اسٹاپ کے سائبان کے نیچے لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کے پائے کنکریٹ کی زمین میں پیوست تھے اور اپنی ناک کی سیدھ پر تاکنے لگا۔ سامنے کی روشن پٹریوں پر جیسے ایک ہی ٹرام بار بار گذر رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس سے دلچسپی بھی ہو جاتی۔ مگر وہ ہر بار گھنٹی بجا کر جا چکی ہوتی اور میں اس کی پشت سے لٹکتی رسّی کے سوا کچھ نہ دیکھ پاتا۔

"اسے جب میں نے سوچا ہے، تو ایک دن اسے میرے روبرو آنا ہی ہے۔ اور جب وہ نمودار ہو گا میں اسے مایوس نہیں کرونگا۔ میں اسے اپنے نادر سکّوں کا بکس تحفے کے طور پر دے دونگا۔"

یہ نادر سکّوں کا بکس، اگر آپ کو اس سے دلچسپی ہو، تو بتادوں اسے میرے چھوٹے چاچا نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کے ہو چکے تھے مگر انھوں نے شادی نہیں کی تھی ۔ ان کا کمرا پرانی کتابوں کا پیوں، بند گھڑیوں، کمپاس، قطب نما، قدیم نقشوں جو اپنی موڑنے والی جگہوں سے ٹوٹنے لگے تھے اور دوسرے الم غلم سامانوں سے اٹا پڑا تھا۔ گھر کے افراد ان کے کمرے میں جانے سے ڈرتے تھے۔ مجھے آج تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ یہ بکس انھوں نے مجھے کیوں دیا؟ وہ میری سالگرہ کا دن تھا نہ کوئی تہوار کا موقع، نہ ہی میں نے اسکول یا کھیل کے میدان میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ صرف کنجی میرے ہاتھ میں تھماتے وقت انھوں نے آنکھ ماری تھی۔

"یاد رکھنا، اس سے زیادہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔"

یہ ان کے پاگل پن کی شروعات تھی۔

اب ان کو پاگل ہوئے دو سال بیت گئے تھے۔ اسی درمیان میں نے وہ بکس کبھی کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ابھرے ہوئے ڈھکن پر لاکھ کا گہرا وارنش چڑھایا گیا تھا جس میں لانبی چونچ والے متنوع پرندوں کی رنگین تصویریں تھیں، بکس کی بیرونی دیواروں پر خوشنما پتّوں والی بیلیں ابھاری گئی تھیں۔ صرف پیندا کسی بھی طرح کے رنگ وروغن سے عاری تھا۔ بکس کو ہلانے پر اندر سے سکّوں کے کھنکنے کی آواز سنائی دیتی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بکس کے رنگ وروغن پر گذرتے وقت کا ذرا سا بھی نشان نہ پڑا ہو۔

اس کے ساتھ یہ بھی شامل کر دوں کہ میں دو سال کے اندر اندر اسے الماری کے اندرونی حصّے میں کپڑوں کی تہہ میں رکھ کر پوری طرح بھول گیا تھا۔ پھر جب ہم لوگ ایک ڈیزل ٹرین میں بیٹھ کر اس پہاڑی شہر کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے پاگل خانے میں وہ رکھے گئے تھے، تو مجھے اس کا خیال آیا اور میں نے نادر سکّوں کا بکس اپنے سوٹ کیس کے اندر ڈال لیا۔

پاگل خانے کے لان میں جہاں ملاقاتیوں کو پاگلوں سے ملنے کی اجازت تھی، ان کی غیر فطری طور پر بڑھی ہوئی شیو اور گندے لباس کے باوجود ان کے لانبے قد اور تیز عقابی آنکھوں کے سبب مجھے چچا کو پہچاننے میں دشواری نہ ہوئی۔ اور جب کہ لوہے کے بند پھاٹک کے پیچھے کھڑے دوسرے پاگل شور مچا رہے تھے یا رو رہے تھے یا ہنس رہے تھے (اگر یہ ان کی اداکاری نہ تھی) وہ ملاقاتیوں کے شیڈ کے اونچے برامدے پر ہمارے برابر بیٹھ گئے اور میرے ابّا سے باتیں کرنے لگے۔ بات کرتے کرتے انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا دی اور دیر تک نادر سکّوں کے بکس کی طرف تاکتے اور مسکراتے رہے۔

ابّا سے بات ختم کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

"اور سب کی طرح تم بھی تو مجھے پاگل نہیں سمجھتے ہو نا؟" انھوں نے میرا داہنا کان اینٹھتے ہوئے کہا جسے ابّا نے سن لیا۔ وہ زیرِ لب مسکرائے مگر خاموش رہے۔

"نہیں" میں نے کہا۔ پاگل خانے کے دو ملازم حفظِ ماتقدم کے طور پر ہمارے سر پر تعینات تھے۔

"لگتا ہے تم بھی پاگل ہو گئے ہو۔" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر میں پاگل نہیں تو کیا میں یہاں بھاڑ جھونکنے کے لئے رکھا گیا ہوں؟ اور یہ بکس، اسے تم نے کبھی کھولنے کی کوشش نہیں کی۔"

''یہ آپ کو کیسے پتہ؟''

''کیونکہ میں نے تمہیں غلط کنجی دی تھی۔ اب بتاؤ میں پاگل ہوں؟''

ابّا نے مجھے اٹھنے کا اشارا کیا، مگر اس سے پہلے ہی چاچا میرا داہنا ہاتھ سختی سے تھام چکے تھے۔

''تم پڑھائی میں دھیان نہیں لگاتے اور غلط سلط چیزیں سوچتے رہتے ہو۔''

''چاچو، میرا ہاتھ دکھ رہا ہے۔''

''تم صرف میرے بارے میں سوچتے رہتے ہو۔''

مجھے لگا میری کلائی کی ہڈی ٹوٹ جائگی اور میں چیخ پڑا۔

انھیں دونوں ملازم نے بہت مشکل سے مجھ سے الگ کیا۔ اس کھینچا تانی میں نادر سکّوں کا بکس زمین پر جا گرا اور اس کی آواز سے اچانک چچا کی آنکھیں جیسے خواب سے جاگ گئیں۔

''تم نے یہ آواز سنی'' دونوں ملازم کے شکنجوں میں پھنسے وہ میری طرف بے بسی سے تاک رہے تھے۔ ''ایک دن تمہیں اس کے لئے افسوس ہو گا۔''

''چلو بھی۔'' ابّا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں میں۔'' چچا نے دونوں ملازموں سے خود کو الگ کیا، اپنی قمیض کا کالر ٹھیک کیا اور میرے پاس آئے۔ انھوں نے میرے دونوں گال چوم کر انھیں تھپتھپایا۔ وہ جب سر جھکائے ہوئے ملازموں کے درمیان چلتے ہوئے لوہے کے پھاٹک کی طرف واپس جا رہے تھے جہاں پاگلوں کا شور اور بھی بڑھ گیا تھا تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

''ان کا پاگل پن کب ٹھیک ہو گا؟'' باہر آکر میں نے ابّا سے سسکتے ہوئے پوچھا۔ نادر سکّوں کے بکس پر اب بھی میری انگلیاں لرز رہی تھیں۔ زمین پر گرنے کے سبب اس کے ایک کونے کا وارنش درک گیا تھا۔

''وہ کبھی پاگل نہیں ہوئے۔''

''پھر آپ لوگوں نے انھیں یہاں کیوں ڈالا؟''

''شاید اس لئے کہ اس پاگل دنیا کے اندر یہ تمہارے چاچا کے لئے سب سے محفوظ جگہ ہے۔''

میں نے ابّا کی طرف دیکھا اور جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے کے چچا کلین شیوڈ ہو کر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس میرے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔

ایک ٹرام میرے سامنے آکر رکی ہے اور میں نے اس سے ایک بھاری بھر کم لڑکی کو ہانپتے کانپتے باہر آتے دیکھا ہے۔ لڑکی کو میری نظریں نہیں بھاتیں۔ میری مسیں بھیگنے لگی ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ میں سر جھکا لیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی دیر تک ٹرام کھڑی رہتی ہے، پھر ایک دھچکے کے ساتھ کنڈکٹر کی گھنٹی کا انتظار کئے بغیر چل پڑتی ہے۔ میں اٹھ کر پٹریاں پار کر کے نیچے اپنے محلے کی طرف چل پڑتا ہوں جس کے مٹیالے آسمان پر اڑتے چیل اور کوّوں کے بیچ ایک دمدار پتنگ اپنا راستہ بھول چکی ہے۔

گذشتہ دس سال کے اندر اندر ہمارا پرانا پشتینی مکان چاروں طرف سے غیر قانونی طور پر تعمیر شدہ عمارتوں سے گھر گیا تھا جن میں عجیب طرح کے ناقابلِ بیان لوگ آگئے تھے۔ ایک چلم بردار فقیر بھی تھا، جس نے ہماری دہلیز پر اپنا دائمی ٹھکانہ بنایا تھا اور جس کے وجود سے ہر وقت بھنگ کی بو آتی رہتی اور جو اب خود کو اس گھر کا ہی ایک فرد متصور کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بیڑی سلگاتے سلگاتے جھائیوں بھرا چہرا میری طرف اٹھایا۔

''بوا کا کالج پھر کھل گوا۔''

میں اس کے جملے پر چونک پڑا۔ کالج! ابھی تو میں نے دسویں کا امتحان ہی پاس کیا ہے۔ شاید میرے قد کے سبب وہ مجھے کالج کا اسٹوڈنٹ سمجھتا ہے۔ گھر کے اندر چھوٹے چاچا کے بند کمرے کے سامنے سے گذرتے گذرتے میں ٹھٹھک گیا۔ آج اس کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے اندر سے کسی آدمی کے ہونے کی آہٹ سنائی دی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''حاتم ہے۔'' ماں نے پان چباتے چباتے کہا۔ ''تمہارے چاچو کے علی گڑھ کے زمانے کا ساتھی۔ اس سے ملنے آیا ہے۔ کالج کے دنوں میں کئی بار آچکا ہے۔ اس وقت تم بہت چھوٹے تھے۔ شاید ہی تمہیں یاد ہو۔''

جانے کیوں مجھے اس کمرے میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ میرا ایک ذاتی کمرا تھا جس کے قد آدم دریچے پر کبوتر اپنی چونچ اور پنجوں سے یلغار کیا کرتے۔ اس کے بند شیشوں پر آپ کسی بھی وقت ان کے پروں کو مچلتے دیکھ سکتے ہیں۔ کتابیں کونے کی میز پر پھینک کر میں بستر پر جوتوں سمیت پیٹھ کے بل لیٹ گیا اور دسوں انگلیاں گردن کے پیچھے الجھا کر چھت کی طرف تاکنے لگا جس کی کڑیوں سے لپٹے جھول اور مکڑی کے جالے برسوں سے صاف نہیں کئے گئے تھے۔ پڑوس کے کسی گھر سے کیل ٹھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میری کھڑکی سے دوہات کے فاصلے پر ایک نئی عمارت کی نچلی منزل کی ایک کھڑکی کھلتی تھی جس سے ہر دوسرے تیسرے دن اور کبھی کبھی تو دن کے وقت بھی، ایک مرد اور عورت کے زور زور سے سانسیں لینے، کراہنے، چوڑیوں کے ٹوٹنے اور آپس میں سرگوشیاں کرنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔

"شٹ اپ!" میں کھڑکی پر بیٹھے کبوتروں کو (کبھی کبھی فرضی کبوتروں کو) اڑاتا۔ ملاعبت کی آواز بند ہو جاتی۔ پھر کم سے کم سرگوشیوں اور آہوں میں یہ کام اپنے انجام تک پہنچتا اور کمرے کے غسل خانے میں پانی کا شور جاگ اٹھتا۔

'ماں۔۔۔' ایک دن میں نے کہا تھا۔ "۔۔۔ مجھے چاچو کا کمرا چاہئے۔ یہ کمرا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"وہ کمرا تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔" ماں کہتی، پھر اپنی بات میں ایک جھوٹ کا اضافہ کرتی۔ "اور پھر تمہارے چاچو کسی بھی دن ٹھیک ہو جائینگے۔ پھر تمہیں یہ کمرا چھوڑنا ہو گا۔"

"چھوڑ دونگا۔" میں کہتا۔ "میں نے کب چاچو کے کمرے میں ساری عمر گذارنی ہے۔"

"نہیں، وہ کمرا تمہارے لئے ٹھیک نہیں، اس میں ارمان کی بہت ساری قیمتی کتابیں اور کاپیاں رکھی ہیں، تمہارے ابّا اجازت نہیں دینگے۔" ماں تحکمانہ لہجے میں اپنا آخری فیصلہ سناتی اور میں سوچتا، ایک دن میں نادر سکّوں کے بکس کے ساتھ اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا جاؤنگا۔

میں اس طرح کیوں اس بکس کے بارے میں سوچا کرتا ہوں، میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن جب بھی میں کسی گھاٹ پر اکیلا ہوتا تو دریا کے مٹیالے پانی کی طرف تاکتے تاکتے میں اس انجانے ملک میں پہنچ جاتا جہاں میں یہ بکس کھولنے والا تھا اور ان نادر سکّوں کے سبب وہ ملک ایک جادوئی ملک میں بدل جاتا جہاں چڑیاں مشینی تھیں اور انسان کے جسموں پر پانی نہیں ٹھہرتے اور سندر راجکماریاں اپنے آر پار نظر آنے والے لباسوں میں اپنے کاسنی نپل کے ساتھ دریا کے کنارے کی قد آدم گھاس کے جنگل میں بھاگ رہی ہوتیں۔ چاچو جو اس ملک کے بادشاہ تھے، جو اپنی ایک انگلی کے ایک اشارے پر سلطنتوں کو تباہ کر سکتے تھے اور آسمان سے پانی برسانے پر قادر تھے، میرے لئے ان کے دربار میں ایک خاص جگہ مخصوص تھی جہاں ستونوں پر آگ اگلنے والے سانپ لہرایا کرتے۔

حاتم میرے چاچا کی عمر کے ہی ایک دوسرے آدمی تھے جن کے سر کے سامنے کے سارے بال اڑ چکے تھے۔ انھوں نے لنن کی پتلون پر ایک ڈینم کا جیکٹ چڑھا رکھا تھا جس کے بٹن ان کی بھاری بھر کم توند کو سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں کے سبب وہ بالکل ہی مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے۔

"یہ بال میں نے کتابوں کی نذر کر دئے ہیں۔" انھوں نے کھانے کی میز پر مجھے بتایا۔ "اور اگر آج تمہارے چاچا پاگل خانے میں ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ہم میں سے سب سے کم پاگل کو ہم پاگل خانہ بھیجتے ہیں۔"

وہ وہی بات کہہ رہا تھا جو میرا باپ کہا کرتا۔ مگر وہ میرے چاچو کے دوست تھے تو اتنے دنوں تک انھوں نے ان کی خبر کیوں نہیں لی؟

"میں نے ایک دوسرے ملک میں روپا مچھلیوں سے بھری ایک آرکائیو میں پناہ لے رکھی تھی جہاں سورج تک کو جھانکنے کی اجازت نہ تھی۔" انھوں نے گوشت کے ایک کم گلے ٹکڑے کو چبائے بغیر حلق سے نیچے ڈھکیلنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ان کی آنکھوں سے پانی نکل آیا اور انھیں پانی کے گھونٹ کا سہارا لینا پڑا۔ "میرے بارے میں کہنے کے لئے اور بھی بہت ساری باتیں ہیں۔" انھوں نے دونوں گال پر بہہ آئے آنسو کو رومال سے خشک کرتے ہوئے کہا۔ "مثال کے طور پر میں شرط لگانے کے لئے تیار ہوں کہ میں بہت دنوں تک زندہ رہنے والا ہوں اور ایک اندھے کی موت مرونگا۔"

مجھے ان کی اس عجیب و غریب گفتگو پر حیرت نہ ہوئی بلکہ مجھے پورا یقین ہو گیا کہ وہ میرے چاچو کے قریبی دوست تھے۔ بعد میں جب ہم چاچا کے کمرے میں اکیلے ہوئے تو انھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے میری طرف دیکھا (انھوں نے توند کو آرام دینے کے لئے اپنے جیکٹ کے سارے بٹن کھول دئے تھے)۔

"تم سوچ رہے ہو گے میں کہاں سے ٹپک پڑا۔"

"ہاں۔"

"اور یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ اس نادر سکّوں کے بکس کے بارے میں میں جانتا بھی ہوں یا نہیں۔"

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہ بکس کالج کے دنوں میں بھی ارمان کی سب سے قیمتی چیزوں میں شامل تھا۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔ "اس کے سبب ہم لوگ اس کا مذاق بھی اڑایا کرتے مگر ہم میں سے کسی کو بکس کھولنے یا اس کے اندر جھانکنے کی اجازت نہ تھی۔"

"میں ایسے کسی بکس کے بارے میں نہیں جانتا۔" میں نے جھوٹ کہا۔

"بیکار ہے۔ تمہارے چاچو نے مجھے خط میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ مجھے احمق سمجھتا تھا اس لئے مجھ سے کچھ بھی چھپاتا نہ تھا۔ گھبراؤ مت، میں وہ بکس لینے نہیں آیا ہوں۔ گرچہ اسے حاصل کر کے مجھے کم خوشی نہ ہوگی۔ تم خوش قسمت ہو اور تمہارے چاچا نے ضرور تمہارے اندر کچھ دیکھا ہوگا کہ انھوں نے بکس تمہارے حوالے کیا۔ تم نے اسے کھول کر دیکھا تو ہوگا؟"

"نہیں۔"

"حیرت ہے۔ شاید تمہارے اندر اس طرح کی چیزوں کے لئے کوئی تجسس نہیں ہے۔ وہ بکس لاؤ۔ اسے کھول کر دیکھتے ہیں۔"

"اس کی کنجی میرے پاس نہیں ہے۔ چاچو نے غلط کنجی مجھے دی تھی۔" اس بار میں سچ کہہ رہا تھا کیونکہ پاگل خانے سے واپسی کے بعد میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔" حاتم نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن تم نے کبھی صحیح کنجی ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"مجھے کچھ ہی دن قبل اس کا پتہ چلا۔"

تو انھوں نے اپنا چرمی سوٹ کیس کھولا، اس سے ایک چھوٹی سی ہینڈ بیگ برامد کی اور اس کے سائڈ چین سے پیتل کی ایک مجوّف کنجی نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ رہی صحیح کنجی۔ تمہارے چاچا نے خط کے ساتھ لفافے میں اسے ڈال کر بھیجا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے راستے میں کسی نے نہیں کھولا اور یہ لفافہ کنجی کے ساتھ سفر کرتا ہوا سات سمندر پار اس بغیر دھوپ والے ملک تک پہنچ گیا۔"

"جب یہ بکس آپ کے پاس نہ تھا تو انھوں نے یہ کنجی آپ کو کیوں بھیجی؟" میں نے کنجی کو تھام کر کہا۔ کنجی تھامتے ہوئے جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔" انھوں نے لاپرواہی سے کہا۔ "اب تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید اس نے ایسا اس لئے کیا تھا تاکہ صحیح وقت پر صحیح کنجی تمہیں مل جائے۔"

کنجی تھام کر میں ان کی طرف گومگو کی کیفیت میں تاک رہا تھا جب انھوں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں یہ تمہارا نجی معاملہ ہے اسی لئے میں اسے میرے سامنے کھولنے پر اصرار نہیں کرونگا، بلکہ بہتر ہوگا اگر تم میرے جانے کے بعد بکس کو کھول کر دیکھو۔"

دوسرے دن میری آنکھ کھلنے سے پہلے ہی فجر کی نماز پڑھ کر وہ جا چکے تھے۔ میں نے نادر سکّوں کا بکس نکال کر کھڑکی پر رکھا جس پر فالحال کوئی کبوتر نہ تھا۔ پڑوس کی کھڑکی بھی خاموش تھی۔ میں نے کنجی کو بکس کے کلیدی سوراخ میں ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ بکس نے کھلنے سے انکار کر دیا۔

میرا شبہ صحیح نکلا۔ یہ پہلی کنجی کی کاپی ہی تھی۔

مجھے اس گنجے، مکڑی کی توند والے اس کالر کی احمقانہ مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی جو اس وقت ٹرین کی کھڑکی کے سامنے بیٹھا اپنی مشن پوری کرنے کی تشفی کے ساتھ بردوان کے لہلہاتے کھیتوں کی طرف تاک رہا ہوگا۔

یا پھر کون جانے، چاچو نہیں چاہتے تھے کہ یہ بکس کبھی کھلے۔

اور تب مجھے میرا آدمی نظر آ گیا۔ وہ ایک لانچ میں کھڑا مسافروں کو جادو دکھا رہا تھا۔ پہلے تو اس نے منہ کھول کر ایک چوڑے پھل والا لانبا تیز چاقو اس کے مٹھ تک اپنے حلق کے راستے پیٹ کے اندر ڈال لیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر لانچ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلتا پھرا، پھر اس نے انسانوں کے سر کی جسامت کے آہنی حلقے اپنی سیاہ تھیلی سے جس پر انسانی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کی تصویریں بنی تھیں برآمد کیے اور بڑے ہی حیرت انگیز طریقے سے انھیں ایک دوسرے کے اندر نتھی کرنے لگا جب کہ حلقوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا، جس کی تصدیق کئی تماشبین ہاتھ سے چھو کر کر چکے تھے۔ تماشہ دکھا کر جب وہ میرے پاس آیا تو میں دیر تک اسے دیکھتا رہ گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی بوسیدہ گولف کیپ سر پر سیدھی کر کے مسکرانے کی کوشش کی اور جب کہ لانچ دوسری طرف کے گھاٹ پر پہنچنے ہی والا تھا اور نصف سے زیادہ مسافر بینچوں سے اٹھ چکے تھے وہ ایک خالی بینچ پر بیٹھ کر کھینی بنانے لگا اور پانی پر تھوکنے لگا۔

جیٹی سے لگتے ہی لانچ دیکھتے دیکھتے مسافروں سے خالی ہو گیا تھا۔ صرف ہم دونوں الگ الگ بینچوں پر بیٹھے ایک دوسرے کی طرف تاک رہے تھے۔ بینچ ایک بار پھر مسافروں سے بھرنے لگے تھے جب وہ مسکرایا اور اٹھ کر میرے پاس چلا آیا۔ ہم ایک ساتھ لانچ سے باہر آئے تھے۔

"کوئی خاص بات؟" اس نے اپنے نیچے کے ہونٹ کو باہر کھینچ کر اس پر کھینی رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ایک بکس ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت خوب۔"

"اس پر ایک تالا پڑا ہے جو نہیں کھلتا۔"

"تو اسے کسی تالا کھولنے والے کو دکھاؤ۔"

"میں چاہتا ہوں کہ میرا بکس تالا کے بغیر کھل جائے۔ اور تم یہ کام کر سکتے ہو۔"

"تمہیں لگتا ہے میں سچ مچ کا جادوگر ہوں اور جادو نام کی ایک چیز بھی ہے دنیا میں۔" وہ ہنسا اور اس کے کھینی خوردہ سیاہ دانت نمایاں ہو گئے۔ "یہ دنیا بھی عجیب ہے۔ ہم دوسروں کے بارے میں کیا کچھ سوچ لیتے ہیں۔ کوئی پردے کے پیچھے جھانکنے کی محنت ہی نہیں کرتا۔ پھر بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔ تم وہ بکس یہاں لے کیوں نہیں آتے؟ تم مجھے آسانی سے ڈھونڈ سکتے ہو۔ میں تمہیں کسی نہ کسی جیٹی پر یا لانچ کے اندر تماشہ دکھاتا نظر آؤنگا۔"

"کل کالج کے بعد ٹھیک تین بجے میں بکس کے ساتھ چاندپال گھاٹ پر تمہارا انتظار کرونگا۔"

دوسرے دن چاندپال گھاٹ کی سنسان جیٹی کی سیڑھی پر بیٹھ کر، جہاں تیز ہوا چل رہی تھی (وہ مقررہ وقت سے تقریباً آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا تھا) اس نے بکس پر انگلیاں پھیریں، اسے الٹ پلٹ کر، ہلاڈلا کر دیکھا، اپنے کان سے لگا کر اندر سننے کی کوشش کی، دیر تک اس کے کلید کے سوراخ کے اندر جھانکتا رہا اور آخر کار تھک کر اس کے قبضوں کو ڈھونڈنے لگا جو اسے نظر نہیں آئے۔ وہ نظر آتے بھی کیسے۔ وہ تو بکس کے اندر کی طرف بنے ہوئے تھے۔ تھک کر اس نے میری طرف دیکھا۔

"یہ ایک غیر معمولی بکس ہے۔" اس نے دونوں کنجیوں کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اسے کسی تالا والے سے ہی کھلوا سکتے ہو، یا پھر اس بکس کو توڑ کیوں نہیں ڈالتے؟ تمہیں اس سے خوبصورت بکس بازار میں مل جائیں گے۔"

"تو وہ لوہے کے حلقوں والا تماشہ ایک فریب تھا۔ مجھے پہلے ہی جان لینا چاہئے تھا۔ تم میرے آدمی نہیں ہو۔" میں نے اس سے بکس واپس لیتے ہوئے کہا۔

"وہ آنکھوں کا فریب تو تھا، لیکن تم اتنی جلد فیصلہ نہ کرو۔ ہو سکتا ہے میں واقعی تمہارا آدمی نکلوں۔"

"نہیں تم میرے آدمی نہیں ہو سکتے۔" میں نے اس کی طرف پیٹھ گھماتے ہوئے کہا۔ "تمہیں دو وقت کی روٹی سے فرصت نہیں۔ جب کہ میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں اس کے پاس وقت ہی وقت ہے۔"

جیٹی سے باہر آ کر دریا کے کنارے چلتے چلتے میں نے دیکھا، ایک لانچ جس کے باہر شاک سے بچنے کے لئے استعمال شدہ ٹائر لگے ہوئے تھے مسافروں کو لے کر بہت ہی خطرناک حد تک ایک طرف جھکا ہوا جیٹی سے واپس لوٹ رہا تھا جس کے اندر وہ مسافروں کی بھیڑ میں کھڑا ایک زندہ سانپ نگلنے کا تماشہ پیش کر رہا تھا۔ اس کے بعد بھی ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر ایک دن وہ اور دکھائی نہ دیا۔ شاید لوگ روز روز ایک ہی تماشہ دیکھتے دیکھتے اوب گئے تھے یا شاید ایک ہی طرح کے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے وہ بور ہو گیا تھا۔

ہمیں خبر ملی ہے کہ چاچو پر پاگل پن کا شدید دورا پڑنے لگا ہے اور انھیں بجلی کے کافی ہولناک جھٹکے دیے جا رہے ہیں۔ ایک بار میں بھی بڑے چچا کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ انھیں ایک کمرے میں، جس کی دیواروں پر گدے چسپاں تھے، زنجیر سے جکڑ کر رکھا گیا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے پاگل کا داہنا کان نصف چبا ڈالا تھا۔ انھیں ہماری موجودگی پر حیرت ہوئی۔ وہ جب دروازے کی سلاخوں کے پاس آئے تو مسکرا رہے تھے۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" بڑے چچا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا۔

"بالکل چنگا، سر۔" وہ ہنسے۔ ہم نے دیکھا، ان کے سامنے کے دو دانت غائب تھے اور کنپٹی پر کسی گہری چوٹ کے سبب ان کی داہنی آنکھ بائیں آنکھ کے مقابلے میں کچھ چھوٹی ہو گئی تھی۔ "اور تم؟" انھوں نے اپنے ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے ہاتھوں کو اٹھا کر میری طرف اشارا کیا۔ "حاتم کہہ رہا تھا تم واقعی ایک الگ قسم کے لڑکے ہو۔"

"وہ یہاں آئے تھے؟" میں نے پوچھا اور دروازے کی موٹی سلاخوں کے اندر ہاتھ بڑھا کر چاچو کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، مگر پاگل خانے کے ملازم نے مجھے روک لیا۔

"ہاں، اور اس نے اپنے گنجے سر پر طبلا بجانے کی اجازت بھی دی تھی۔" وہ دوبارا ہنسے۔ "اس سے بڑا گدھا میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ خیر، اب وہ اپنی بوسیدہ کتابوں کی دنیا میں جا چکا ہے۔ اس نے تمہیں بتایا تو ہو گا۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مرنے کے بعد اس کے نتھنوں سے بڑی بھاری تعداد میں روپا مچھلیاں برامد ہونگی اور وہ ساری کی ساری بہت ہی جید اور دانشور مچھلیاں ہونگی۔"

میں وہاں سے بہت پریشان ہو کر واپس لوٹا تھا۔ میں نے ان کے دئے ہوئے بکس کو ہر زاوئیے سے الٹ پلٹ کر، ہلاڈلا کر دیکھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بکس کے اندر ایسا کوئی راز چھپا تھا جو چاچو کو اس کے پاگل پن کی دنیا سے واپس لے آئگا۔ لیکن مجھے اس کا بھی ڈر تھا کہ تالا کے کھلتے ہی وہ راز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو نہ جائے۔ کیا یہی وہ تذبذب تھا جس نے مجھے ہمیشہ بکس کو کھولنے سے باز رکھا؟

اس کے بعد شاید چاچو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ ایک دن پاگل خانے سے بھاگ نکلے اور اس سے ملحق ایک رہائشی بنگلہ کی دیوار پر لگائے گئے بجلی کے حفاظتی تاروں میں ان کی ادھ جلی لاش الجھی ہوئی ملی۔ لاش بری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ انھیں پاگل خانے کے قبرستان میں ہی دفنا دیا گیا۔ ان کی آخری رسومات میں مجھے تک شامل ہونے کی اجازت نہ ملی جس سے مجھے پتہ چلا کہ لاش کچھ ضرورت سے زیادہ مسخ ہو چکی تھی۔

چاچو کے انتقال کے بعد میں وہ بکس الماری کے بہت اندر رکھ کر بھول گیا۔ میں نے شہر کو نئے سرے سے دریافت کرنے کی کوشش کی، نئے نئے راستے اپنائے جہاں لوگوں کے چہرے بالکل اجنبی اور حیرت انگیز تھے، ایسی گلیاں دیکھیں جہاں ہر دوسری گلی میں ایک نیا چاند چمک اٹھتا، ایسی شاہراہوں سے گذرا جن پر میلوں چل کر بھی لوگ خود کو پہلی جگہ پر ہی پاتے۔ میں نے ایک غمگین مگر کم سخن آدمی کا دور تک پیچھا کیا اور آخر کار اسے اپنی کہانی سنانے پر مجبور کر دیا اور یہ کہانی بھی کتنی دردناک تھی جیسے شہر کا چمکیلا آسمان اچانک منحوس کووں سے ڈھک جائے، جیسے ایک پر سکون رات فسادیوں کے شور سے جاگ اٹھے، جیسے درختوں سے پتے دائمی طور پر جھڑنے لگیں، جیسے دور خلا میں چمکتے ستاروں سے راکھ کا گرنا شروع ہو جائے، جیسے راستوں پر چلنے والے راہگیر فریب ثابت ہوں اور فنا اور بقا کے سارے مفاہیم بدل کر رہ جائیں۔

لیکن ان سب چیزوں سے آخر کار میں تھک گیا۔ اب میرے پیروں میں اتنی سکت نہ تھی کہ دو قدم بھی چل پاتا۔ میں کسی کھمبے سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھوں کو خشک رکھنے کی کوشش کرتا تو آسمان سے بارش کی بوندیں لگاتار گرتی چلی جاتیں جب کہ اس وقت بادلوں کا نام و نشان نہ ہوتا اور میں اس پراسرار بارش میں شرابور چھتری بردار لوگوں کے بیچ ایک نابود ہستی کی طرح چلتا چلا جاتا۔ اور ایسی ہی ایک پراسرار بارش کے دن، بکس کو بغل میں دبائے، میں ایک سرکاری بس کے پائدان سے ایک بڑی سڑک پر اتر آیا جس پر آزادی کا شاندار جشن منایا جاتا تھا اور دریا کی طرف چل پڑا۔

بارش اور کہاسے کے سبب دریا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نہ نظر آنے والے دریا کے کنارے تارکول کی سڑک پر چلتا رہا اور چلتے چلتے ایک گھاٹ پر پہنچ گیا جس کے وسیع و عریض زینے پر دریا کا پانی بہت اوپر تک آگیا تھا اور دھوئیں کی طرح مچل رہا تھا۔ میں اس کی آخری سیڑھی پر کھڑا دریا کے دوسرے کنارے تاک رہا تھا جو کہاسے میں غرق دریا کا حصّہ ہی نظر آرہا تھا۔ جانے کتنا وقت گذر گیا جب مجھے اپنی بغل میں دبے ہوئے بکس کا خیال آیا اور میں اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ بکس کے نیچے مچلتے پانی کی طرف تاکتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لہریں انسانی انگلیوں کی شکلیں لے کر بکس کو گرفت میں لینا چاہ رہی ہوں۔ میں نے بکس کو پانی کے حوالے کر دیا۔ نادر سکّوں کا بکس پہلے تو پوری طرح اندر ڈوب گیا اور ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ شاید اب وہ دکھائی نہ دے جب اچانک غوطہ کھا کر باہر نکل آیا۔ وہ ایک موج کی زد میں آکر سیڑھی سے ٹکرایا اور پلٹ کر جیٹی سے لوٹتے کسی مسافروں سے بھرے لانچ کی طرح ایک طرف جھکا ہوا گھاٹ سے دور جانے لگا۔

بارش اور کہاسے میں پانی پر وہ کسی تابوت کی مانند نظر آرہا تھا۔

میں نے چاچو اور حاتم کی دی ہوئی دونوں کنجیاں پانی میں پھینک دیں۔

اس رات میں نے خواب میں دیکھا بکس بہتے بہتے جادوئی ملک میں پہنچ گیا تھا جہاں کی چڑیاں مشینی تھیں اور انسانی جسموں پر پانی نہیں ٹھہرتے اور سندر راجکماریاں اپنے آر پار نظر آنے والے لباسوں میں اپنے کاسنی نپل کے ساتھ دریا کنارے اگی ہوئی قد آدم گھاس کے جنگل میں بھاگ رہی تھیں اور چاچو جو اس ملک کے بادشاہ تھے، جو اپنی انگلی کے اشارے پر سلطنتوں کو تباہ کر سکتے تھے اور آسمان سے پانی برسانے پر قادر تھے، ان کے دربار میں میرے لئے ایک خاص جگہ مخصوص تھی جہاں ستونوں پر آگ اگلنے والے سانپ لہرا رہے تھے۔

دروازہ

وہ میرے بہت ہی برے دن تھے۔ میری پانچ برس کی نوکری چلی گئی تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ آئندہ کئی ماہ تک مجھے کوئی نوکری نہیں ملنے والی، بلکہ اب شاید ہی کوئی ڈھنگ کی نوکری مجھے ملے۔ میرے پاس ایک برائے نام پیشہ ورانہ تعلیم تھی جس کے دعوے دار دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔ اور ہنر کے نام پر میرے پاس چپ رہنے کے علاوہ دوسرا کوئی ہنر نہ تھا۔ جب میری میز پر تین ماہ کی تنخواہ کے ساتھ برخواستگی کا پروانہ رکھا گیا تو میں کھلی آنکھوں سے صرف اس لفافے کو دیکھتا رہ گیا جو معمول سے زیادہ دبیز تھا (گرچہ بعد میں ان میں پانچ سو کا ایک نوٹ جعلی ثابت ہوا جسے کیشئر نے بغیر کوئی سوال کئے مودبانہ خاموشی کے ساتھ بدل دیا تھا۔) ان لوگوں نے پچھلے کئی مہینوں سے مجھے اشارے کنایے میں یہ بتانا شروع کر دیا تھا کہ کمپنی کو میری کارکردگی اطمینان بخش نظر نہیں آتی، کہ میری ریویو ہونے والی ہے۔ جب انھوں نے مجھ سے پچھلے سات برسوں کی نوکریوں کی تفصیل مانگی تو مجھے ہوشیار ہو جانا چاہئے تھا اور استعفٰی کے بارے میں سوچنا شروع کر دینا چاہئے تھا۔ اس جگہ کام کرنے سے پہلے میں نے کئی جگہ سچ مچ کی نوکریاں کی تھیں اور کئی جگہ سے تجربات کے جعلی سرٹیفکیٹ حاصل کئے تھے جنھیں ترس کھا کر مجھے دے دیا گیا تھا۔ مگر میں نے سوچنے میں کافی وقت لگا دیا۔ اپنی خاموش طبیعت کے سبب میں نے دوسروں سے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا، نہ ہی کسی سے کوئی رائے مانگی، گرچہ انھیں اس بات کا پتہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ میرے آفس میں تو سن گلاس واحد شخص تھا جو اکثر میری میز پر آکر مجھ سے ایک آدھ ذاتی باتیں کر لیا کرتا۔ اسے مجھ سے دلی ہمدردی تھی۔ میں بھی اسے ناپسند نہیں کرتا تھا۔ وہ لانبے قد کا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، جس نے مشنریوں کے ایک فری اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک قبائلی کرسچن تھا جس پر یہ نام کچھ جچتا نہ تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی مگر میرے نہ چاہنے پر بھی وہ اختصار کے ساتھ اپنے حالات مجھے بتا دیا کرتا۔ مثال کے طور پر ایک بار اس نے بتایا کہ وہ جنگل محل کے جس شہر میں پلا بڑھا اب اس کا نام بدل گیا ہے۔ واقعی، مجھے اس وقت یہ عجیب لگا تھا کہ وہ کس طرح اپنے پیدائشی شہر کی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، گرچہ بعد میں مجھے اس واقعے میں کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ دوسری بار اس نے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کیا جسے ایک تیندوا اٹھا کر لے گیا تھا۔

"وہ صرف پانچ برس کا تھا اور مجھے میرے بھائی بہنوں میں سب سے عزیز تھا۔"

"شاید اس لئے کہ وہ جلد موت کی آغوش میں جانے والا تھا۔" مجھے خود کو بولتے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

"نہیں، اس وجہ سے نہیں۔" ایک ہاتھ میری کرسی کی پشت پر رکھے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی قبائلی آنکھوں سے میری طرف تاک رہا تھا۔ "اس کے آخری لمحے تک ہمیں کب پتہ تھا کہ وہ مر جانے والا تھا؟"

ہاں، میں نے اس وقت دل ہی دل میں تسلیم کیا، جسے ہم رگِ جان سے قریب رکھتے ہیں ہمیں اس وقت تک اس کی موت کا یقین نہیں ہوتا جب تک وہ مر نہیں جاتا، بلکہ اکثر تو اس کے مر جانے کے بعد بھی کئی کئی دن تک ہم خود کو یقین دلا نہیں پاتے۔ ہمارا دل کہتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے اور کسی بھی وقت سامنے آ کھڑا ہو گا۔ مجھے ایک شخص کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اسنے برسوں تک اس کا یقین نہیں کیا تھا کہ بس سے کچل کر اس کی لڑکی کی جان چلی گئی تھی گرچہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے ننھے منے جسم کو ہندوؤں کے قبرستان میں دفن کیا تھا۔ مجھے اس شخص کو دیکھنے، اس سے ملنے کی بڑی تڑپ تھی۔ یہ واقعہ میرے میس کے ایک بزرگ نے بتایا تھا جو کچھ برس پہلے ریلوے کی نوکری سے سبکدوش ہوا تھا، غیر شادی شدہ تھا، اپنی نوکری کی آخری دہائی اس نے اس میس میں گذاری تھی اور اب اس کا ارادہ اسے مرتے دم تک چھوڑنے کا نہ تھا۔

"یہ خبر اخبار میں چھپی تھی۔" اس نے بتایا۔ "بہت پہلے میں نے اسے بنگلہ اخبار میں دیکھا تھا۔ مگر ان اخبار والوں کا کیا بھروسہ۔ اکثر کسی دلچسپ خبر کی کمی کو پوری کرنے کے لئے وہ جھوٹ موٹ کی خبریں بھی چھاپ دیتے ہیں۔"

"لیکن ایسا تو ہو سکتا ہے۔" میس کے گنجے منیجر نے کہا جو ایک سنجیدہ انسان ہوتے ہوئی بھی دونوں کان کے اوپر اگے ہوئے جھالر نما بالوں کے سبب کسی مسخرے کی طرح نظر آتا تھا۔ "ایسا ممکن تو ہے۔ کون یہ یقین کر سکتا ہے کہ اس کا جگر کا ٹکڑا مر چکا ہے۔"

اس میس میں میری نوکری چھوٹ جانے کی خبر ابھی تک نہیں پہنچی تھی اور میں آخری شخص تھا جو یہ بتانے والا تھا۔ یہ میس ایک بالکل ہی سستے ہوٹل کی طرح تھا جس کے کمروں میں چوکیاں لگی تھیں، چھوٹے کمروں میں دو دو چوکیاں اور بڑے کمروں میں چھ چھ بلکہ ایک میں تو آٹھ تخت لگے ہوئے تھے۔ اسی سب سے بڑے کمرے میں شطرنج کا بساط سجتا تھا، تاش کے پتوں کا کھیل چلتا، سیاست پر لمبی چوڑی بحثیں ہوتیں اور کرکٹ کے موسم میں ٹرانزسٹر کی آواز اونچی کر کے کمنٹری سنی جاتی۔

"اور یہی جہ ہے کہ میں اس میس کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" ریلوے کے سبکدوش ملازم نے ایک دن اعلان کیا تھا۔"میرے دو بھائی ہیں، ان کے بیویاں ہیں، لڑکے بچے ہیں۔ تمام لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ ہمارا پشتینی مکان ہے، ذاتی تالاب اور مندر ہے۔ مگر میرا دل وہاں نہیں لگتا۔ صرف اس جگہ، اس میس میں مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں بوڑھا نہیں ہوں نہ ہی احترام کے لائق ہوں۔ صرف اس جگہ میں دل کھول کر بول اور ہنس سکتا ہوں اور لوگ میرے ریح خارج کرنے پر سنجیدگی اور احترام سے خاموش نہیں رہتے۔ صرف یہاں، تم لوگوں کے بیچ میں صحیح معنوں میں پوری طرح زندہ ہوں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس میس میں اس جیسے بوڑھے سے لے کر کئی ادھیڑ عمر اور مجھ جیسے پختہ عمر کے لوگوں کے علاوہ کالج اور ہائی اسکول کے طلبا بھی رہتے تھے۔ ان میں سے چند بستر پر کچھ لوگ کافی عرصے سے قابض تھے اور کچھ بستروں پر رہنے والے بدلتے رہتے جن میں زیادہ تعداد طالب علموں کی ہوتی کیونکہ یہاں چاروں طرف ہائی اسکول اور کالج بکھرے پڑے تھے۔

ہمارا بوڑھا میس کے اندر کافی مقبول تھا۔ ایک بار وہ شدید طور پر بیمار پڑا تو نہ صرف اسے سب لوگوں نے سرکاری اسپتال میں داخل کیا بلکہ اسپتال سے واپسی پر رات رات بھر جاگ کر اس کی تیار داری بھی کی۔ وہ تاش کا ایک اچھا کھلاڑی تھا اور اکثر لوگوں کو جوا کھیلنے پر اکسایا کرتا۔

"پیسہ نہ لگاؤ تو کیا خاک مزا ہے۔" وہ کہتا۔"چاہے وہ زندگی کا کھیل ہی کیوں نہ ہو۔ سارا کچھ پیسوں کے بل پر چلتا ہے۔ یقین نہ ہو تو ایک بار پیسہ پھینک کر دیکھو۔"

میں نے کئی بار تاش میں اسے ہرایا تھا۔

"مجھے حیرت ہے۔ تم کوئی اچھے کھلاڑی تو ہو نہیں۔" اس نے بعد میں مجھ سے کہا۔"ایک بار جیت لینا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن ہر بار جیتنا وہ بھی ایک ایسے کھلاڑی کے لئے جسے صحیح ڈھنگ سے پتے سنبھالنا تک نہیں آتا، یہ میری عقل سے باہر ہے۔ واقعی تم کس مٹی سے بنے ہو؟ اور تم اتنے خاموش انسان کیوں ہو؟ کیا راز ہے جو تم اپنے سینے میں ڈھوتے پھر رہے ہو۔ بچے، تمہارے گھر میں سب ٹھیک تو ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے سینے میں کوئی راز دفن نہیں ہے اور میں خاموش کیوں رہتا ہوں، میں خود نہیں جانتا۔ اور میرا گھر اور دوسرے گھروں سے الگ نہیں ہے۔

"شاید تمہاری خاموشی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ ممکن ہے ہم لوگ ہی اپنی زبان کا زیادہ استعمال کرتے ہوں۔" اس نے آخر کار ہار مانتے ہوئے کہا اور اس کے بعد ایک طرح سے میری خاموشی کو تسلیم کر لیا۔

ہر صبح ساڑھے نو بجے نہا دھو کر، مچھلی بھات کھا کر میں میس سے نکل پڑتا۔ میرا رخ ہمیشہ کی طرح اپنے آفس کی طرف ہوتے ہوئے بھی اگلے ہی موڑ پر میں کسی انجانی جگہ کے لئے نکل پڑتا جس کا مجھے اس وقت تک پتہ نہ چلتا جب تک میں اس جگہ پہنچ چکا نہ ہوتا، مگر اس جگہ پہنچ جانے پر مجھے ایسا لگتا جیسے میں وہیں کے لئے نکلا تھا۔ زیادہ تر وقت سڑک پر چلتے چلتے میں خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ زندگی یہی ہے، اور دنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے، رک رک کر، بدل بدل کر، جس طرح ہر انسان ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہوئے بھی ایک جیسا ہی ہوتا ہے، اسی طرح تمام انسانی زندگیاں بظاہر الگ الگ ہوتے ہوئے بھی بالکل ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر آج اگر میں ایک بے مقصد آوارہ انسان بن چکا ہوں تو میں اس شخص سے قطعی طور پر الگ نہیں ہوں جو تیز قدموں کے ساتھ اپنے سائے کا تعاقب کرتے ہوئے ایک خاص وقت میں کہیں پہنچنا چاہتا ہے۔ اور دن کے خاتمے پر جب سورج اونچی عمارتوں کے درمیان ننگے پیڑوں کے پیچھے جا رہا ہو گا تو وہ ایک بار پھر اسی راستے پر واپس اپنے سائے کا تعاقب کرتا دکھائی دیگا، پہلے کی طرح ہی کپڑوں میں ملبوس اور زندہ۔ اور اس وقت میس کی طرف واپس لوٹتے ہوئے (میں اس کا خیال رکھتا کہ یہ آفس سے لوٹنے کا وقت ہو) وہ مجھ سے کچھ الگ نہ ہو گا۔ اگر میں ایک گاؤں یا ایک چھوٹے شہر میں ہوتا تو یقیناً پکڑا جاتا، مگر ایک بڑے شہر میں چھپنے کے ہزاروں مواقع ہوتے ہیں۔ آپ اپنے گھر کے باہر ایک دوسرے انسان میں ڈھل جاتے ہیں جسے کوئی نہیں جانتا۔ اور اسی طرح ہر روز آپ بے نام لوگوں کی بھیڑ میں کسی ناؤ سے ٹوٹے ہوئے تختے کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں، بالکل تنہا اور خاموش۔ لیکن یہ شہر اگر ایک پر شور سمندر ہے تو ہمارا میس کسی پر سکون جزیرے سے کم نہیں، جہاں چڑیوں کی چہچہاہٹ ہے، کلبلاتے جھرنے ہیں اور ایک عجیب طرح کی طمانیت لوگوں کے چہروں میں نظر آتی ہے۔ کیا یہ اپنے گھر کی روزمرہ کی پریشانیوں سے دور رہنے کا نتیجہ تھا؟ واقعی یہ ایک عجیب طلسماتی جگہ تھی جہاں آپ کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ آپ موجوں کے تھپیڑوں کے بیچ ایک ٹوٹے ہوئے تختے کی طرح بہتے جا رہے ہیں جس کی کوئی سمت یا منزل نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی خاموشی کی چادر اوڑھے ہوئے بھی آپ اس جگہ کے شور وغل کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ان ہی آوارہ گردی کے دنوں میں، جب میں دھیرے دھیرے اپنی جمع کی ہوئی پونجی ختم کر رہا تھا اور میرے والدین حیران تھے کہ میں گھر کیوں نہیں لوٹا، میری ملاقات ایک عجیب انسان سے ہو گئی جس کی ہڈیوں کے گودوں میں چربی کی جگہ شراب دوڑتی تھی۔ وہ کبوتروں سے ڈھکا ہوا ایک روشن دن تھا اور عمارتوں کی دورویہ دیوارِ چین کے بیچ شاہراہ پر راہگیروں کا ہجوم اپنے معمول پر تھا جب میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک ہائڈرنٹ کے نیچے سر ڈالے اسے دھو رہا تھا۔ اس نے ابھی ابھی فٹ پاتھ کے ریلنگ کو تھام کر نالے کے اندر قے کی تھی۔ دراصل یہ اس کی حلق میں انگلی ڈال کر ڈکرانے کی آواز ہی تھی جس نے میرے قدم روک لئے تھے۔

جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا کہ میں نے جھک کر اس سے پوچھ لیا کہ وہ ٹھیک تو ہے۔
اس نے اپنا گیلا چہرا اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے بال پیشانی سے چپکے ہوئے تھے، آنکھیں سرخ۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔
وہ مجھے نہیں جانتا، اس نے اعلان کیا اور دوبارا پانی کی موٹی دھار کے نیچے اپنا سر ڈال دیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنا سر اچھی طرح دھو لیا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جیب سے رومال نکال کر سر اور چہرا صاف کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔
آج اس نے بہت زیادہ پی لی تھی، اس نے مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر بتایا۔ میرے اندر کسی طرح کے ردِ عمل کا فقدان پا کر اسے کوئی مایوسی نہیں ہوئی تھی، جیسے وہ ان چیزوں کا عادی ہو۔ کسی نے اسے ایک بہت ہی سستے شراب کے اڈے کا پتہ بتایا تھا، جو شہر کے بیچوں بیچ ایک گراج کے اندر واقع تھا۔ اسے یہ جگہ پسند آئی تھی۔ یہ ایک طرح سے مفلوک الحال لوگوں کی جنت تھی۔ یہ کبھی ایک مشہور گراج رہا ہو گا مگر اب دارو کے ایک اڈے میں بدل چکا تھا جہاں دیسی اور انگریزی دونوں پانی کے بھاؤ ملتی تھیں۔ ”جب شراب اتنی سستی ہو اور آدمی تنہائی کا شکار تو وہ ضرورت سے زیادہ پی لیتا ہے اور خالی پیٹ شراب پیو تو بعد میں پیٹ کے اندر چوہے دوڑنے لگتے ہیں۔ وہاں کھانے کی الم غلم چیزیں بک رہی تھیں، ہر طرح کی ابلی اور تلی ہوئی چیزیں جنھیں یہ چوہے خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔ شاید مجھے اپنی عمر کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔“
مجھے لگ رہا تھا میں نے خوامخواہ ہی اس شخص کے ساتھ خود کو الجھا لیا تھا۔ میں اس سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا جب اس نے اپنا گیلا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میرا کندھا اس کی ہتھیلی کے نیچے لاشعوری طور پر کسمسا اٹھا۔ اس کے وجود سے قے کی کھٹی مہک آ رہی تھی۔ اس نے واقعی بہت بری طرح کھایا تھا۔
”تم شراب پیتے ہو؟“
میں نے اسے بتایا کہ میرے جیسے قلیل آمدنی والے لوگ بھی کبھی کبھار شراب پی لیا کرتے ہیں۔
اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے پینا چاہئے۔ یہ انسان کو ایک مشین بننے سے روکتی ہے۔ ضروت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی بغاوتیں جاری رکھیں۔ ہمارے زندہ رہنے کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔
میں اس کی بے سر پیر کی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے مسکرا کر میرا کندھا تھپتھپایا۔ قے کرنے کے بعد اس کا نشہ تھوڑا کم ہو گیا تھا۔ اس کی طبیعت بھی سدھرنے لگی تھی۔ ”اور تم کام کیا کرتے ہو؟ کہیں میں تمہارے ذاتی معاملات میں ضروت سے زیادہ دخل تو نہیں دے رہا ہوں؟“
میں نے اسے بتایا کہ میں ان دنوں بیکار ہوں، کہ میری نوکری چلی گئی ہے۔
”کام ڈھونڈ رہے ہو؟“
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بتایا کہ ابھی میں نے اس کے بارے میں سوچا نہیں ہے۔
”تب تو تم زندگی کے سب سے سنہرے دور میں ہو۔“ وہ ریلنگ کو تھامے کھڑا تھا اور سڑک پر راہگیروں کی نہ ختم ہونے والی بھیڑ کی طرف دیکھ رہا تھا جو سب وے سے امڈی چلی آ رہی تھی۔ ”شہر کی سیر کرو، سٹی سینٹر کی طرف جاؤ، کسی آرٹ میوزیم میں وقت برباد کرو یا پھر دریا کو اپنے کنارے کا کوڑا کرکٹ کھاتے دیکھو، اور اگر ان سب چیزوں سے جی نہ بہلے تو میرے جیسے شرابیوں کو قے کرتے تو دیکھ ہی سکتے ہو۔ واہ کیا لاجواب زندگی ہے تمہاری۔ اور یہ کتنے دنوں چلنے والا ہے؟“
میں نے معذرت چاہی۔
”کہاں جاؤ گے تم؟ تمہارے پاس جانے کے لئے کوئی جگہ تو ہے نہیں۔ سورج کے ڈوبنے تک تمہیں ان ہی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنی ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نہ میں۔ تم سر نہ ہلاؤ تو بھی میں جانتا ہوں معاملہ یہی ہے؟“
میں اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔
اس نے اوور برج کے پیچھے، ٹن کے ایک بڑے سے کتھئی رنگ کے شیڈ کی طرف اشارا کیا جس سے پرانے زمانے کی ایک چمنی نکلی ہوئی تھی۔ لگ رہا تھا چمنی سے دھواں نکلے زمانہ ہو چکا تھا۔ شاید یہ کسی طرح کا سرکاری گدام تھا کیونکہ اس کی نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ اس اتنی بڑی دیوار پر کسی نے چے گیوارا کا بڑا سا پوسٹر چپکا رکھا تھا جس کا نچلا سرا دھوپ اور پانی میں سڑ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہاں، اس گدام کے پیچھے اینٹ کی ایک دو منزلہ پرانی عمارت کے اندر اس کا ٹھکانہ ہے اور اگر چاہوں تو میں تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ گذار سکتا ہوں۔ ”میرے پاس شراب کی ایک بوتل اب بھی بچی ہوئی ہے۔ ویسے کسی اجنبی کے ساتھ اس طرح ہو لینے کا مشورہ میں بھی نہیں دونگا۔ تم مصیبت میں پڑ سکتے ہو۔“
وہ شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
”مجھے لگتا ہے مجھے واپس جانا چاہئے۔“ ایک اکتا دینے والی خاموشی کے بعد میں نے احتجاج کا رویہ اپناتے ہوئے کہا۔

"سوچ لو۔" اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ قائم تھی۔ "یہ شہر ایک اور دروازہ تمہارے لئے کھول رہا ہے۔ شاید یہ تمہاری بوریت بھری زندگی میں تھوڑی سی رونق لے آئے۔ یا ساری زندگی یوں ہی گذار دینا چاہتے ہو، بے مقصد، آوارہ، کسی مشین کی طرح، کسی اور کے لئے جو تمہارا شکر گذار بالکل نہ ہو گا۔"

میں نے اسے بتانا چاہا کہ یہ اتنا برا بھی نہیں تھا، کہ زندگی ان ہی کل پرزوں کے سہارے چلتی رہتی ہے۔ مگر کیا میں اس کا اہل تھا کہ انھیں الفاظ کی شکل دے پاتا۔

میں دیر سے میس لوٹا تھا۔

"آج آفس میں کام زیادہ تھا؟" میرے پڑوسی نے راہداری کے بیسن پر چہرا دھوتے دھوتے آئینہ کے اندر سے میری طرف دیکھا۔ اس نے ابھی ابھی اپنی شیونگ ختم کی تھی۔ میرا دروازا بیسن سے لگا ہوا تھا۔ کنجی نکالتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ میری نوکری ایک ماہ قبل جا چکی ہے۔ میں اس سے بالکل قریب نہ تھا، بس کمرا آس پاس ہونے کے سبب کبھی کبھار ہماری ملاقات ہو جاتی۔ مگر جانے کیوں وہ راز جسے میں نے سب سے چھپا کر رکھا ہوا تھا اتنی آسانی سے اس کے سامنے اگل دیا۔ میرے کمرے میں دو بستر تھے۔ میرا روم میٹ بہت دیر سے واپس لوٹنے کا عادی تھا۔ ایک پرائیوٹ فرم اس کا استحصال کرتی تھی۔

وہ میرے پیچھے پیچھے شیونگ کا ڈبہ تھامے کمرے کے اندر آ گیا اور دوسری چوکی پر بیٹھ کر جس کا بستر تکیہ کے ساتھ لپیٹ کر ایک کنارے رکھ دیا گیا تھا، چھت کے کنڈے سے لٹکتے بلب کی تیز روشنی میں میرا جائزہ لینے لگا۔ اس نے گیلا چہرا صاف نہیں کیا تھا گرچہ تولیہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ میرا چھوٹا سا کمرا آفٹر شیونگ لوشن سے مہک اٹھا۔

"کوئی دوسری نوکری ڈھونڈ رہے ہو؟"

اس کا جواب دینے کی بجائے میں بستر سے اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا جسے میں صبح پڑھ کر نکلا تھا اور اب دوبارا پڑھنے والا تھا۔ میں نے اس سے التجا کی کہ میری نوکری کے بارے میں دریافت نہ کرے۔

"تم تھوڑا نشے میں لگ رہے ہو؟"

ہاں، میں نے اسے بتایا، میں نے ایک بے غیرت انسان کی شراب پی ہے جو خود کو سماج کا ناسور سمجھتا ہے۔

"تو ان دنوں یہ کر رہے ہو۔" اس نے تولیہ سے چہرا رگڑتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر برص کے نشان نمایاں ہو چلے تھے۔ "چلو، جب تک نوکری مل نہیں جاتی اس شہر کو چھان پھٹک لو۔ ایک بڑا شہر اپنے آپ میں کسی عجائب گھر سے کم نہیں ہوتا۔"

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک اس عجیب و غریب انسان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا دبیز دیواروں والا پرانا گھر ایک ڈھلان پر واقع تھا جس کی اوپر کی منزل پر جانے کس طرح کے لوگ آباد تھے۔ اس نے جس کمرے میں مجھے بٹھایا تھا اس کا ایک دروازہ نہر کی طرف کھلتا تھا جو اب گندے پانی کے ایک بڑے نالے کی شکل لے چکی تھی۔ دروازے کے باہر ایک ٹوٹا پھوٹا زینہ تھا جس کا آخری پائدان ٹوٹ جانے کے سبب زمین سے اس کا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ سیڑھی کے نیچے جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ڈھال تھی جس پر شراب کی رنگ برنگی بوتلیں پانی کے اندر تک بکھری پڑی تھیں۔ نہر کے دوسرے کنارے ریفوجیوں نے سرکنڈوں کے کے جھونپڑے بنا رکھے تھے جن کے چھپر کھجور کے پتوں کے تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر پولیتھین سے گھرے ہوئے سنڈاس پانی میں اپنے طوالوں پر کھڑے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر جھونپڑیاں ویران تھیں کیونکہ ریفوجیوں کی ایک بڑی تعداد ملک کی آبادی میں رچ بس گئی تھی۔ یہ جھونپڑیاں نہر کے دنوں کنارے اتنی دور تک چلی گئی تھیں کہ ان کا آخری سرا دھند میں غائب ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے شہر کے عین مرکز میں اتنی لمبی اتنی خوابناک نہر کو دیکھنے کا اس سے پہلے اتفاق نہیں ہوا تھا، وہ بھی ایک ایسی جگہ جس سے تھوڑے ہی فاصلے پر دنیا کا ایک مصروف ترین ریلوے اسٹیشن واقع تھا۔

"تمہاری آنکھوں سے لگتا ہے اس نہر کو پہلی بار دیکھ رہے ہو۔" اس نے ایک بہت ہی پرانے چرمی صوفے کی طرف اشارا کیا جس کے آدھے حصے پر پرانے اخبارات، گندے کپڑے اور دوسرے الم غلم سامان بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔ میں اس کمرے میں اپنی دلچسپی کے لائق کوئی چیز تلاش کر رہا تھا، ایسی کوئی چیز جو اس انسان پر روشنی ڈال سکے۔ ہم جن سامانوں کے درمیان زندگی گذارتے ہیں کیا وہ ہمیں ہم سے بہتر بیان نہیں کرتے؟ مگر مجھے کہیں پر کچھ بھی دکھائی نہ دیا یہاں تک کہ پلستر جہاں جہاں سے اکھڑ گئے تھے وہاں بھی کوئی انسانی ہیولا بن نہیں پایا تھا۔ کیا اس نے اپنی زندگی سے تمام مفاہیم کو جلاوطن کر دیا تھا؟

"زیادہ تر لوگ واپس اپنے اچھے دنوں میں جینا چاہتے ہیں۔" اس نے لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور چونکہ وہ نہیں جانتے اچھے دن کیا ہوتے ہیں انھیں اچھے دنوں کی کہانی بنانی پڑتی ہے۔"

"اور وہ لوگ جنھوں نے سرے سے اچھے دن نہیں دیکھے؟"

"تم نے کبھی بازار سے آلو خریدا ہے؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "صبح سے شام تک ایک ہی ڈھیر سے لوگ آلو چنتے رہتے ہیں اور تمام آلو بک جاتے ہیں۔ کیوں؟ کیا اس ڈھیر میں سڑے گلے آلو نہ تھے؟ قدرے کم سڑے گلے آلو بھی نہ تھے؟ دراصل ہم ان ہی دنوں سے اپنا اچھا دن چنتے ہیں جو ہمارے پاس ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کی زندگی میں برے دن ہی طئے کرتے ہیں کہ ان کے اچھے دن کون سے تھے۔"

"اس طرح سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی میں کوئی بھی اچھا دن نہیں ہوتا۔"

"نہ ہی برا دن۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اور دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔"

"کیا آپ ہمیشہ سے اسی طرح اکیلے رہتے آئے ہیں؟"

نہیں، اس نے ایک المونیم کی ڈبیا کھول کر بیڑی نکالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ اگر میرا مطلب اس عمارت سے ہے تو مجھے جان لینا چاہئے کہ اس بلڈنگ میں کچھ خاص نہیں ہے۔ اسے تو زمانہ ہوا ریلوے کنڈم ڈیکلے ئر کر چکی ہے۔ بس تھوڑے سے ہی لوگ بچے ہیں اس میں، اس کے جیسے گھس پیٹھیے جنھیں میں شہر کی گاد بھی کہہ سکتا ہوں۔ ہاں گاہے بگاہے یہاں جرائم پیشہ افراد پناہ لیتے رہتے ہیں، رات کے وقت اوپر کے ایک کمرے میں شراب کی ایک غیر قانونی دکان کھل جاتی ہے، کچھ کمروں میں بیسوائیں اپنا دھندا چلاتی ہیں جو دن کے وقت جانے کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ کوئی بلاوجہ نہیں کہ پولس کا یہاں آنا روز کا قصہ ہے جن میں بہت سوں کے ساتھ اس کی دوستی بھی ہو چکی ہے۔ مگر شاید میں نے اس کے اکیلے پن کی بات کہی تھی۔ نہیں، کبھی اس کی بھی ایک دنیا تھی جہاں رشتوں کی بھول بھلیاں تھیں، بچوں کی چہکاریں تھیں اور تعلقات کی چور زمینوں پر وہ بھی اور دوسرے لوگوں کی طرح چلنے کا عادی تھا۔ "مگر جب تم ایک کے بعد ایک نوکری کھونے لگتے ہو تو دھیرے دھیرے تم اکیلے ہو جاتے ہو۔" ممکن ہے اسے اکیلا پن پسند ہو، میں نے اپنی رائے دی۔

اس دنیا میں کون اکیلا ہے؟ وہ ایک ٹک کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں آسمان کا کوئی رنگ نہ تھا۔ وہ ان پرچھائیوں کا کیا کرے جو اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں؟ ابھی کچھ دن پہلے تک اس نے ایک چھاپے خانے میں نوکری کی تھی۔ عجیب عمارت تھی وہ، دقیانوسی دروازے، غیر ضروری طور پر اونچی کھڑکیاں، کالکھ سے ڈھکی دیواریں، ستون جیسے مردہ انسانوں کی آتمائیں سر جھکائے کھڑی ہوں، اس کی راہداریاں کسی مقبرے کے تہہ خانے کی یاد دلاتی تھیں۔ کون یقین کر سکتا ہے، اس دنیا میں ایسی جگہیں بھی ہیں۔ مجھے اس جگہ کو دیکھنی چاہئے۔ "تم یقین نہیں کروگے، اس چھاپے خانے میں داخل ہونے سے پہلے انسان کو اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔"

کیا وہ چاہتا ہے کہ میں اس کی باتوں کا یقین کر لوں؟ اور اس نے وہ جگہ کیوں چھوڑی؟ وہ جو کچھ بتا رہا تھا یہ تو اس کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز چیزیں موجود ہیں۔

شاید میں ٹھیک کہہ رہا تھا، اس نے کہا۔ شاید وہ اب کسی کام کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔ شاید اس نے بہت پہلے اپنے آپ کو ایک پیراسائٹ میں بدل دیا تھا۔ تو ایک دن اس نے خود سے سوال کیا، وہ اس جگہ کر کیا رہا ہے؟ اور اس نے وہ نوکری چھوڑ دی۔ میں چاہوں تو اس کی جگہ لے سکتا ہوں۔ اس کے تعلقات آج بھی ان لوگوں سے برے نہیں ہیں۔

یہ کتنا آسان ہے، اپنے آپ کو پیراسائٹ قرار دینا۔ جب کہ یہ سارا سماج ہی پیراسائٹ کے ایک دشوار گذار جنگل میں بدل چکا ہے۔ اور میں نے اس سے کہا کہ وہ غلط سمجھ رہا ہے۔ کیا میں نے ابھی تھوڑی دیر قبل نہیں بتایا تھا کہ میں نے ابھی کوئی نوکری ڈھونڈنے کے بارے میں سوچا نہیں ہے۔

"جو ثابت کرتا ہے کہ بہت جلد تم ڈھونڈنا شروع کر دوگے۔" وہ اپنی ناک سے ہنسا۔ "ایک کتا ہڈیوں کے بغیر زیدہ دن تک زندہ نہیں رہ سکتا۔"

وہ ایک میز کی طرف گیا جس پر دوائیوں کی شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے اس کا داہنا دراز باہر کی طرف کھینچا اور اس سے ایک اخبار کا مڑا تڑا صفحہ نکال کر میری طرف پھینک دیا۔ اس پر اور دوسرے اشتہاروں کے ساتھ ساتھ ایک چھاپے خانے کا اشتہار بھی تھا جس کے گرد نیلی روشنائی سے دائرہ بنا دیا گیا تھا۔

میری نوکری گئے یہ دوسرے مہینے کا آٹھواں دن ہے۔ اسی درمیان میں نے شہر کے سب سے بڑے ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ کا رخ نہیں کیا ہے جہاں میں ایڈز کی روک تھام کرنے والی ایک تنظیم کا رکن ہوں۔ اپنے کام کے دوران میری کئی طوائفوں سے اچھی جان پہچان ہو گئی ہے۔ یہ مجھے پسند کرتی ہیں اور انھیں اس پر حیرت ہوتی ہے کہ میں ان کے ساتھ سوتا کیوں نہیں۔ ان میں سے کئی کے میں نے بینک میں کھاتے کھلوائے ہیں، کچھ کے خطوط لکھ دیا کرتا ہوں، کئیوں کے میں نے پین کارڈ بنوا دئے ہیں، جن کے ریٹرن اپنے ایک وکیل دوست کی مدد سے ہر سال بھر دیا کرتا ہوں اور ایک ایسی طوائف بھی تھی جس کے دونوں پستان سرجنوں نے کاٹ دئے تھے مگر اس کے سرطان کو پھیلنے سے روک نہیں پائے۔ اس کی موت کے وقت میں واحد شخص تھا جو اس کے سرہانے موجود تھا۔ دراصل یہ سب کچھ میں کسی نیک مقصد سے نہیں کرتا تھا۔ میں جب اپنے ایک دوست کے ساتھ پہلی بار اس جگہ گیا تو میرا مقصد نیک بالکل نہ تھا۔ اس کے بعد بھی میں کئی بار وہاں گیا، مگر ایک دن میں نے ایک بہت ہی کمسن لڑکی کو، جسے ابھی سن بلوغ تک پہنچنے میں کئی سال باقی تھے، ایک بھاری بھرکم دروازے کے نیچے زمین پر اکڑوں بیٹھے گاہکوں کا انتظار کرتے دیکھا اور میں حیران رہ گیا۔ لکڑی کا یہ

مضبوط دروازہ، جس میں بے شمار کیلیں جڑی ہوئی تھیں، جو جانے کب سے اس جگہ کھڑا تھا، خود اس کمسن لڑکی کا ایک اٹوٹ حصہ نظر آرہا تھا جیسے وہ اس دروازے سے باہر آئی ہو۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی دروازے کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا، مگر وہ دروازہ اس دن سے لگاتار میرے خواب میں آنے لگا۔ مگر وہ میرے خواب میں اکیلا نہ آتا، ہر بار کوئی نہ کوئی طوائف اس سے لگ کر کھڑی یا بیٹھی نظر آتی جیسے دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہوں، اور یہ طوائف جو بھی ہوتی، چاہے اس کی عمر کچھ بھی رہی ہو، اس کا چہرا اسی کمسن لڑکی کا چہرا ہوتا۔ اس دن کے بعد میں جب بھی وہاں گیا، میری نظر ان پرانی کھنڈر نما عمارتوں کے دروازوں پر بھٹکتی رہتی کیونکہ ان طوائفوں کی طرح میرے لئے وہ بھی جیتی جاگتی چیز بن گئے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ کمسن لڑکی اور وہ دروازہ مجھے پھر کبھی دکھائی نہ دیے، یا شاید میں نے انھیں گڈمڈ کر دیا تھا۔ آج جب میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو جانے مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ اگر میں اس دن اس دروازے کو نہ دیکھ پاتا تو شاید سستے میک اپ سے لپی پوتی ان مورتیوں کے پیچھے چھپی عورتیں میرے سامنے کبھی کھل نہ پاتیں۔ یہ دروازے جن کی لکڑیاں گھنے اور تاریک جنگلوں سے لائی گئی تھیں اور یہ لڑکیاں جو نیپال کے پہاڑوں اور چھتیس گڑھ کے تاریک جنگلوں سے لاکر ان تنگ و تاریک کوٹھریوں میں ڈال دی گئی تھیں، کتنا عجیب رشتہ تھا ان دونوں کا، ان دونوں کو ایک دوسرے کے اندر دیکھنا کتنا آسان تھا۔ اس دن مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ ہر دروازے کی اپنی ایک الگ کائنات ہوتی ہے جو اس کے اندر اور باہر دونوں طرف پھیلی ہوتی ہے۔ ان دروازوں سے گذرتے وقت ہمیں کبھی اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ ہم ایک اجنبی کی طرح اس کائنات میں داخل ہوتے ہیں، ایک اجنبی کی طرح اس سے باہر جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔

مگر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے ایک اور دروازہ ہے جو شدت سے میرا انتظار کر رہا ہے۔ کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں اس نئی کائنات میں داخل ہو جاؤں۔ شاید وہاں مجھے اپنے اندر کا وہ انسان مل جائے جس کی تلاش میں میں اتنا سرگرداں ہوں۔

آج میں نے دسویں بار چھاپے خانے کے اشتہار کو پڑھا ہے۔ اس پر دیے گئے فون پر مجھ سے کہا گیا ہے کہ ایک خاص جگہ سب وے میں اترنے کے بعد مجھے کچھ دور چلنا ہوگا، وہاں مجھے ڈھلائی لوہے والی ایک چکر دار سیڑھی دکھائی دیگی جس کے نیچے ایک یک چشم بھکاری جاپانی افزائش جنسی آلہ کے ایک بڑے سے گھناؤنے پوسٹر کے نیچے کھڑا ملے گا۔ یہ چکر دار سیڑھی ایک لکڑی کے دروازے پر ختم ہوگی جس کے اندر ایک دوسری سیڑھی میری منتظر ہوگی جس کے خاتمے پر شہر دوبارا نیلے آسمان کے نیچے دکھائی دے گا۔

فٹ برج سے گذر کر زینہ اترتے ہوئے میں نے سوچا جب سب وے سے واپس اوپر آنا ہی ہے تو کیوں نہ اوپر ہی اوپر اس عمارت کی تلاش کی جائے۔ یہ میری غلطی تھی۔ ذیلی سڑکوں اور ان سے منسلک گلی کوچوں میں اس کے آس پاس کے نمبر کے کئی چھوٹے بڑے مکانات نظر تو آرہے تھے مگر کہیں پر اس کمپنی کا نام یا اس کی عمارت کا نمبر مجھے دکھائی نہ دیا نہ ہی ایسی کوئی قدیم عمارت نظر آئی جس کا گنبد آسمان کو چھو رہا ہو۔ وہاں ہر کوئی مجھے سب وے کی راہ دکھا رہا تھا۔ آخر کار مجھے ہتھیار ڈالنا پڑا۔

اس زمین دوز راستے میں اترنے کے لئے مجھے اسٹیشن کے داخلے کی طرف جانا پڑا جہاں سبزی منڈی میں چھکڑوں، رکشاوین اور انسانوں کی بے پناہ بھیڑ کے درمیان راستہ نکالنا ایک انتہائی مشکل کام تھا۔ یہ افراتفری سرنگ کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں اندر کی بدبو اور نیم تیرگی میں آگے بڑھ رہا تھا جب میں نے اپنے ایک ہم شکل انسان کو دیکھا۔ وہ میری طرح ہی ناک پر رومال ڈالے چل رہا تھا۔ وہ نہ صرف میری عمر کا تھا بلکہ اس کے بالوں کی تراش بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب ویرانی تھی جو کسی فرضی بلیک ہال کی طرح آس پاس کی روشنیاں پی رہی تھیں۔ میری ہی طرح اسے کہیں پہنچنے کی جلدی تھی یا شاید وہ اس بدبودار سرنگ سے جلد سے جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میرے دل نے کہا کہ وہ میرا آدمی ہے، کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔ شاید اسے بھی میری بات کا پتہ چل گیا تھا کیونکہ اس نے اپنی رفتار دھیمی کر لی تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم اس زمین دوز گذرگاہ میں بہت اندر تک چلے آئے جہاں دیوار سے نکلے ہوئے بلب اپنے سفید ڈھکنوں کے نیچے سے یرقان زدہ روشنیاں دونوں طرف کی دیواروں پر ڈال رہے تھے۔ جگہ جگہ چھت سے پانی رس رہا تھا جس نے نیچے اتر کر بدروؤں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ شاید تھوڑی دیر قبل سرنگ کے اندر بلیچنگ پاؤڈر کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا کیونکہ اس کی تیز مہک میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

"تم ضرورت سے زیادہ تیز چل رہے ہو۔" کسی نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ میں نے اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر روشنی اور تیرگی کی آنکھ مچولی کے درمیان وہ مجھے دکھائی نہ دیا۔ دوسرا آدمی ایک بلب کے نیچے رک گیا تھا۔ اس کا سایہ دیوار پر اس طرح ترچھا گر رہا تھا کہ اس کی ناک لمبی ہو گئی تھی۔

"مبارک ہو!" میرے قریب پہنچنے پر اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کس لئے؟"

"کیونکہ تم صحیح راستے پر ہو۔"

"شاید آپ نے بھی وہ اشتہار پڑھا ہے۔" میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ اسی شخص کا دیا ہوا ہے جس نے مجھے یہ دیا ہے۔"

"ممکن ہے یہ وہی آدمی ہو۔" اس نے اپنی جیب سے وہی اشتہار برامد کیا جو میرے پاس تھا۔ میں نے دیکھا چھاپے خانے کے اشتہار کے گرد نیلی روشنائی سے ہو بہو ویسا ہی ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ "ویسے ہمیں ایک دوسرے کو کسی طرح کی صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ اور یقین کرو میں خود کو اس طرح کے حالات کے لئے تیار کر ہی رہا تھا جب یہ ہو گیا۔" اور اس نے چکر دار سیڑھی کی طرف اشارا کیا جس کے نیچے ایک لحیم شحیم بھکاری اپنی ایک آنکھ کے ساتھ کھڑا تھا۔

"انسانیت کی خاطر، آپ پہلے۔" اور وہ تیزی سے مڑ کر سرنگ کے اندر غائب ہو گیا۔

یہ اچانک ہوا تھا جس کے لئے میں تیار نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا، میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا ممکن ہے وہ مجھے انسان نہ رہنے دے، ساری زندگی کے لئے ربر کے ایک بوے میں بدل دے۔ مگر ان حالات میں میرے پاس کرنے کے لئے کیا بچا تھا؟

"میں پچھلے ایک ہفتے سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس سیڑھی تک آتا ہے مگر پھر واپس چلا جاتا ہے۔" یک چشم بھکاری نے اپنی بن مانگی رائے دی ہے۔ وہ ایک بلب کی بھرپور روشنی میں کسی دیو کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے کان کے نیچے ورم کا ایک بڑا سا نشان تھا۔

"کیا تم دیکھ نہیں پائے کہ وہ میں ہی تھا؟" میں نے ایک سکہ اس کے کٹورے میں ڈال کر لوہے کی سیڑھی کی طرف قدم بڑھایا۔ لوہے کی سیڑھی طے کرتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا ہمزاد کسی کونے میں کھڑا مجھے ضرور دیکھ رہا ہو گا۔ مگر میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہ تھا کہ اسے نظر انداز کر دوں۔ پھر بھی خیر سگالی کے جذبے کے ساتھ میں نے اسے آواز دی۔

"دوست، میں تمہارے ہی راستے پر چل رہا ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو یہ اتنا مشکل نہیں ہے۔ کیا میں تمہارا انتظار کروں۔"

سرنگ کے اندر اتنا سناٹا تھا کہ چھت سے ٹپکتے پانی کے قطروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

سیڑھی کی بلندی سے میں نے نیچے نظر ڈالی۔ سرنگ سے تمام راہگیر جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مجھے نیچے سے بھکاری کی بلغمی ہنسی سنائی دی۔

"وہ اب یہاں کبھی نہیں آئے گا۔" اس کا چہرا روشنی میں تیرتا ہوا اوپر کی طرف آیا۔ وہ میرے سکے کو اٹھا کر بلب کی روشنی میں شبہ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ "میں ان لوگوں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہمارے کاسے میں کھوٹا سکہ ڈالتے ہیں۔"

چکر دار سیڑھی لکڑی کے ایک دروازے پر ختم ہوتی تھی جس کے اندر کنکریٹ کی ایک اور سرنگ نما سیڑھی تھی جو بتدریج بلند ہوتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے اوپر سے مشینوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یہ وہ آوازیں تھیں جو شہر کو فعال رکھتی تھیں۔ یہ سیڑھی مجھے ایک بڑے سے ہال کے اندر لے گئی جس میں کھڑے ستونوں کے بالائی حصے چھت کے اندھیرے میں غرق تھے۔ ہال کے خاتمے پر ایک اور دروازہ تھا جہاں روشنی دھندلی پڑ گئی تھی۔ اس دروازے کے باہر ایک کافی کشادہ سیڑھی تھی جو عمارت کی درمیانی منزل میں ختم ہوتی تھی۔ آفس اسی منزل پر واقع تھا۔ یہ ایک بڑا کمرا تھا جس کا پچی کاری کا فرش اور دیواریں بتا رہی تھیں کہ یہ عمارت ان دنوں کی یادگار تھی جب شہر پر مفلوک الحال لوگوں کا اتنا شدید غلبہ نہ تھا۔ کیا یہ کوئی اپنی نوعیت کا خفیہ چھاپ خانہ ہے جہاں حکومتِ وقت کا تختہ پلٹنے کی سازش چل رہی ہے؟

آفس کا منیجر ایک بڑی میز کے پیچھے بیٹھا میری طرف تاک رہا تھا۔ میز کے ایک سرے پر ایک کافی اونچا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا جس کی روشنی سیدھی اس کی لانبی انگلیوں پر گر رہی تھی۔ اس کے چہرے کو ایک ستون کے سائے نے ایک تہائی غائب کر رکھا تھا۔ شاید فون پر میں نے اسی سے گفتگو کی تھی۔

"ہمارا وقت گذر چکا۔" اس نے اپنی بیضوی فریم والی عینک کو میز پر رکھتے ہوئے کہا جہاں اس کے دونوں شیشے چمک اٹھے جیسے اس کی آنکھیں اب بھی ان کے پیچھے موجود ہوں۔ "میں ساری زندگی لوکل ٹرین میں سفر کرتا رہا مگر کہیں پر کچھ بھی نہیں بدلا۔ آج بھی لوگ اپنے گھروں کے اندر وہی ناآسودہ زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ ٹھیک بھی ہے۔ ایک شہر کو مرنے کے لئے دہائیاں تو لگ ہی جاتی ہیں۔ اور یہ چند دنوں قبل کی بات ہے کہ میں نے مالک سے کہا، اب اس چھاپے خانے کو ایک خطیر رقم کی ضرورت ہے، ورنہ یہ پرانی مشینیں ہمیں مفلسی کی دلدل میں لے جائینگی۔"

"میرا خیال ہے سیڑھی سے اوپر آتے وقت میں نے ان کی پرشور گڑگڑاہٹ سنی ہے۔"

"ہمارے کچھ کلائنٹ اب بھی وفاداری کا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ مگر کوئی بھی تجارت زیادہ دنوں تک چیریٹی پر زندہ نہیں رہ سکتی۔" اس نے اپنی شیو کھجاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ یہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس میں چہرے کا بالائی حصہ پیشانی تک غائب تھا۔ "بغیر تنخواہ کے مہینوں تک گذارا کرنا کوئی ہم سے سیکھے۔ ابھی کچھ مہینہ قبل ایک شخص تنگ آ کر اپنا بریف کیس اٹھا کر چلتا بنا۔ میں نے برسوں اسے اپنا ٹفن کا ڈبہ کھول کر سوکھی روٹی چباتے دیکھا تھا۔ وہ ہمارا بہت ہی بھروسے کا آدمی تھا مگر اس نے ہمیں ایسی کوئی مہلت نہ دی کہ ہم اس کے لئے کچھ کر پاتے۔"

میں نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ دوسری میزوں پر لوگ اپنے کم قیمت کے مگر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے بھوکے مگر وفادار تھے۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ کمپنی کے دیوالیے پن کی خبر لوگوں تک پہنچے۔ ممکن ہے یہ اشتہار بھی ایسی ہی کسی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہو۔

کچھ برس قبل تک کمپنی کے پاس مینوئل ٹائپ مشین کی ایجنسی تھی۔ وہ لوگ اس معاملے میں ملک کے ایک تہائی حصے کے بے تاج بادشاہ تھے۔ کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد کمپنی کے پاس بغیر بکی ہوئی مشینوں کا ڈھیر لگ گیا۔ کچھ مہینوں تک الیکٹرانک ٹائپ مشینیوں کی مانگ رہی۔ اب وہ بھی ختم ہو چکی ہے۔ ''اب ایک آدھ فرانکل مشین بک جاتی ہے۔ مگر اس کا واحد اور سب سے بڑا خریدار سرکار ہے جسے سامان بیچنا شیطان کو اپنی آتما بیچنے کے برابر ہے۔'' منیجر نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

پھر بھی کمپنی نے نئے آدمی کے لئے اشتہار دے رکھا ہے؟

ایک بزنس جب تک قائم ہے آدمی کی ضرورت تو پڑتی ہی رہتی ہے۔

اور یہ لوگ جو بیکار اپنی اپنی میز پر بیٹھے ہوئے ہیں؟

کوئی بیکار نہیں ہے۔ ہر کوئی ایک خاص کام کے لئے مخصوص ہے۔ مگر یونین اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس مخصوص کام کے علاوہ اس سے کوئی دوسرا کام لیا جائے۔

''اور میرا کام کیا ہو گا؟'' میں نے گویا نیند سے جاگتے ہوئے کہا۔

''یہ تو آپ کو ہمارا آخری آدمی ہی بتا پاتا۔'' ایک پل کے لئے منیجر کا چہرا اندھیرے سے باہر آ گیا۔ اس کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہو گی مگر اس کے تیکھے نقوش اس کی نفی کر رہے تھے۔ ''کاش وہ اچانک کام چھوڑ کر چلا نہ گیا ہوتا۔ اور یہ وہ آدمی نہیں تھا جس کا ذکر ابھی تھوڑی دیر قبل میں نے کیا ہے۔ وہ تو دن کے وقت بھی نشے میں ڈوبا ہوا رہتا۔ تو اس صورت میں اگر آپ کو اس کی جگہ رکھ لیا گیا تو آپ کو اپنے کام کی نوعیت خود ہی طئے کرنی ہو گی۔ اور یہ اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ آپ صرف اس کی جگہ پر بیٹھیں، الماری کے اندر پڑی ہوی فائلوں اور کاغذات کی ورق گردانی کریں،، فون کی ڈائریکٹری کھنگالیں، اس کے نمبروں کو اپڈیٹ کریں، سب کچھ خود بخود آپ کی سمجھ میں آ جائیگا۔ پھر بھی اگر آپ اپنا کام ڈھونڈ نہ سکے تو کام خود آپ کو ڈھونڈ نکالے گا۔ یہ دنیا ایسے ہی چلتی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

میں نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا حوالہ دیا۔ کیا اب اس کی کسی کو ضرورت ہے؟

شاید اسے بھی کام میں لگا لیا جائے یا شاید اس کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ ہو سکتا ہے اس پیشہ ورانہ مہارت کے باہر میں زیادہ کارآمد انسان ثابت ہوں۔ اکثر محنت و مشقت سے حاصل کی ہوئی ڈگریاں انسان کے اندر کی فطری صلاحیتوں پر قدغن لگا دیتی ہیں۔

میں تنخواہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس نے میری آنکھوں کو پڑھ لیا۔

''آپ تنخواہ کے سلسلے میں مطمئن رہیں۔'' وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا جیسا ان میں اسے کوئی نئی لکیر دکھائی دے گئی ہو۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہو گا، یہاں مہینوں سے لوگوں کو تنخواہیں نہیں ملی ہیں۔ آپ کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائیگا۔''

''اچھا انتظام ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''سچ کہیں تو مجھے ایسے ہی کام کی تلاش تھی۔''

''اور ہمیں آپ کے جیسے آدمی کی۔'' اس نے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کھڑا ہوتے ہی وہ ایک دوسرے انسان میں بدل گیا تھا جو میرے لئے بالکل نیا تھا۔ ''اور جناب اب آپ اس عمارت میں گھومنے پھرنے کے لئے آزاد ہیں۔ آپ دیکھیں گے اس کا ہر کمرا اتنا تاریک نہیں جتنا یہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، آپ کو اپنے کام میں مزا آئیگا، اتنا مزا آئیگا کہ آپ راتوں کو اپنا گھر جانا بھول جائیں گے۔''

گھر! کیا واقعی میرا کوئی گھر تھا؟ کیا میں اس قسم کا انسان تھا جس کا کوئی گھر ہوتا ہے؟

نئی جگہ میرا کام کیا تھا؟ تین دن ہونے کے باوجود ابھی تک میں یہ سمجھ نہ پایا تھا۔ اسٹیل کی الماریوں میں بند فائلوں کے اندر چالان، بل، اور واؤچروں کی بھرمار تھی، ہر ضخامت اور ہر رنگ کے رجسٹر پڑے تھے جن کی تاریخیں بہت پرانی تھیں، سرکاری نوٹس اور قانونی دستاویزات کے ڈھیر لگے تھے۔ ان کاغذات میں تقریباً ہر طرح کی متروک مشینوں کا ذکر تھا مگر ایسا کوئی سراغ نہ تھا جو میرے کام کی نوعیت کے بارے میں مجھے بتائے۔ اور یہ دو منزلہ عمارت جس کی دیواریں کہیں کہیں تین تین فیٹ تک دبیز تھیں اور ہر منزل کی بلندی تیس فیٹ سے بھی اوپر کی ہو گی، انسان کے دہرے قد کے برابر دروازوں اور قدِ آدم دریچوں کے سبب کسی پرانے محل کی یاد دلاتی تھی جس پر برا وقت اتر چکا تھا۔ کئی بڑے کمرے متروک مشینوں سے اٹے پڑے تھے اور کچھ کمروں کے اندر ان کے کل پرزے زنگ کھا کر آپس میں اس طرح گتھ گئے تھے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ دیکھنا ممکن نہ تھا۔ راہداریوں میں کھلنے والے زیادہ تر دروازے بند تھے اور کمرے کی کھڑکیوں پر لگی لوہے کی جالیوں کے منحنی سوراخ جھول سے تقریباً بند ہو گئے تھے۔ اس عمارت کے اندر چلنا ایک تیرہ و تاریک دنیا میں سفر کرنے کے برابر تھا۔

یوں ہی بھٹکتے بھٹکتے ایک دن میری ملاقات اس کمپنی کے مالک سے ہوگئی جو ایک نوجوان شخص تھا اور ایک بند دیوار گیر گھڑی کے نیچے کھڑا اوپر روشندان کی طرف تاک رہا تھا جس کے دھندلے شیشے سے ایک فاختہ چپکی ہوئی تھی۔ دیوار گیر گھڑی کا پنڈولم نکال لیا گیا تھا اور اس کے کانٹے دائمی طور پر اپنی جگہ تھم گئے تھے۔

"اتنی بڑی عمارت، کیا ہم اسے کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال نہیں کر سکتے؟" میں نے رائے دی۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میرا داہنا ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"ایسا کہتے وقت آپ صرف ایک بات بھول رہے ہیں کہ اس عمارت کا کوئی دروازہ شاہراہ کی طرف نہیں کھلتا۔ ہمارے پاس داخلہ اور خروج کے لئے صرف وہ چکر دار سیڑھی ہی رہ گئی ہے۔ اس نے اس کمپنی کو تباہ کر دیا۔"

"ایسا کب ہوا؟ اتنی بڑی عمارت، ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ اس کا اپنا کوئی داخلہ نہ ہو۔"

"کبھی اس کا اپنا ایک داخلہ تھا۔ دیوارِ چین کی طرح اونچا تو نہیں مگر کافی بلند تھا۔ شاید اس زمانے میں لوگوں پر رعب جمانے کے لئے اس طرح کے بلند و بانگ دروازے بنانے کا رواج تھا۔ تو جیسا کہ ان داخلوں کے ساتھ ہوتا ہے، ایک دن وہ اپنی محراب اور ستونوں کے ساتھ گر پڑا۔ کئی لوگ مارے گئے۔ کمپنی برسوں تک عدالت اور پولس کی لپیٹ میں آگئی۔ جب تک سارے معاملے درست ہوتے، ہمارے پڑوسی ملک میں آزادی کی لڑائی شروع ہوگئی، دیکھتے دیکھتے ہمارے داخلے پر ریفوجیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ان کی غیر قانونی تعمیرات کو قانون نافذ کرنے والوں کی شہہ حاصل تھی، سارا معاملہ سیاسی تھا۔ اس طرح یہ داخلہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔"

"آپ لوگوں نے اس کی واپسی کے لئے دوبارا عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا؟"

"بہت سارے مقدمے اب بھی عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ لیکن اب اس عدالت اور پولس سے بھی ایک بڑی آفات پیدا ہو چکی ہے۔ میدان میں ایک نیا جانور آ چکا ہے جس کا کل تک کوئی وجود نہ تھا، وہ ہیں پیشہ ور سیاست دان، اور یہ وہ سکہ ہے جس کے دونوں رخ غلط ہیں۔ یہ سب کچھ میرے دادا جان کے زمانے میں شروع ہوا، ایک بہت ہی چھوٹے سے کمرے میں، ایک ٹائپ مشین سے جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک مشہور و مقبول اخبار میں ڈھل گئی۔ مگر پھر وقت بدل جاتا ہے، خیالات باسی ہو جاتے ہیں، نئی سوچ کے ساتھ نئے لوگ آجاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم ہم لوگ کہاں پیچھے چھوٹ گئے۔ آج ان کی تحریروں کو میں پڑھتا ہوں تو مجھے حیرانی ہوتی ہے۔ یہ خیالات کتنے کم درجے کے تھے مگر اپنے وقت میں انھیں کتنے تقدس کے ساتھ دیکھا گیا۔ ہاں اختلاف کے پہلو تو نکالے جاسکتے ہیں، مگر کسی بھی دور یا تحریک کی تمام کی تمام چیزیں بالکل سیاہ یا سفید تو نہیں ہوتیں، نہ ہی سو فیصد قبول یا رد کی جاسکتی ہیں؟ سب کچھ ختم ہو جانے کے بعد بھی کیا ہمارے اندر ان کے جراثیم باقی نہیں رہتے؟ خیر اب ان سب چیزوں کا کیا رونا۔ لڑائی تو اب بھی جاری ہے۔ اور میں آخری وارث رہ گیا ہوں۔ کہیں آپ ہمارے نئے آدمی تو نہیں؟ پچھلا آدمی اتنا برا نہ تھا، بلکہ اس کی شراب نوشی کے باوجود میں اسے پسند کرتا تھا۔ مجھے اس کے لئے افسوس ہے۔ کچھ لوگ ایک لمبی زندگی جی کر بھی کچھ نہیں پاتے۔"

میں نے اسے بتایا کہ اسی آدمی نے مجھے اس جگہ کا پتہ بتایا تھا، کہ میں اپنا کوئی تقرری کا پروانہ دکھانے سے قاصر ہوں کیونکہ ایسا کوئی پروانہ ابھی تک مجھے دیا ہی نہیں گیا ہے۔ وہ دوبارا ہنسا۔

"ابھی کچھ مہینہ قبل ہمارے پشتینی مکان کو ایک بینک نے قرق کر لیا ہے۔ ہم ایک کرائے کے مکان میں اٹھ آئے ہیں۔ ہمیں کرائے کے مکان میں رہنے کی عادت نہیں مگر ہم کوشش کر رہے ہیں کہ عادت پڑ جائے۔ شاید آپ کے ساتھ بھی ایسا کچھ ہوا ہو گا۔ میں نے آپ کا تجربہ اور آپ کی سند دیکھی ہے۔"

"کچھ خاص نہیں ہے ان میں۔ مگر شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے سر ہلا کر حامی بھری۔ "شاید مجھے انتظار کی عادت ڈالنی چاہئے۔"

اچانک ایسا کچھ ہو گیا ہے کہ میں بہت خوش رہنے لگا ہوں۔ بلکہ میری زبان بھی مجھے واپس مل گئی ہے۔ اس عمارت کے سبب کیا میں اس شہر کو زیادہ سمجھنے کے لائق ہو گیا ہوں، یہ شہر جس نے خود اپنی تباہی کی کہانی رقم کی ہے؟ یہ تار کول یا کنکریٹ کی سڑکوں پر حرکات و سکنات میں مصروف لوگ؟ کیا اس شہر نے ایک اکٹوپس کی طرح انھیں اپنے ان گنت بازوؤں میں جکڑ نہیں رکھا ہے؟ کیا یہ سڑکیں اس اکٹوپس کے بازو نہیں ہیں؟ یہ مکانات کیا ان کے اندر زندہ انسان بستے ہیں یا یہ وہ باڑے ہیں جن کے اندر ان دیکھی پرچھائیوں سے سہمے ہوئے لوگ مذبح میں بھیجے جانے والے جانوروں کی طرح اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ گلیاں جہاں نیلے شیطانوں کی حکمرانی ہے اور قحبہ خانے جنھیں چیونٹیوں اور بچھوؤں نے آباد کر رکھا ہے، میں کیوں انھیں ہی سوچتا رہتا ہوں۔ کیا میرے حصے کا سورج مر چکا ہے؟ زندگی اور موت، کتنا عجیب کھیل ہے یہ۔ انسان جو دھیرے دھیرے مرتے ہوئے اپنی موت کھو بیٹھتا ہے، انسان جو زندہ رہنے کے تگ و دو میں یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا سانس لینا ایک میکانکی عمل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور میں نے اس پرانی عمارت کے ان گنت کمروں میں بھٹکتے ہوئے جانے کتنی بار خود سے بغیر جواب حاصل کئے یہ دریافت کیا ہے، بھلے آدمی، تمہیں کس چیز کی تلاش ہے۔ اور یہ خوشی جو تم نے دریافت کی ہے کیا اس دنیا کو رد کرنے کا کوئی نیا طریقہ ہے؟

"ایک دن تمہیں اس عمارت سے باہر جانے کا دروازہ مل جائیگا۔" میرے سن رسیدہ دوست نے کہا۔ وہ اپنی کھڑکی پر کہنی رکھے کھڑا تھا اور بیڑی پیتے ہوئے باہر خوابناک نہر کی طرف تاک رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح نہر کی طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "مگر تمہیں اس دن سے ڈرنا چاہئے۔"

"اگر میں نے اس دروازے کی تلاش کرلی تو یہ سینکڑوں لوگوں کی زندگی میں خوشحالی لے آئیگا۔" باہر ڈھلان میں ٹھنڈی ہوا سوکھی جھاڑیوں کے اندر سرسرا رہی تھی۔

"مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میں تمہیں پھر سے کہونگا کہ تمہیں اس دن سے ڈرنا چاہئے۔" اور وہ صوفہ پر رکھے پرانے اخبارات کے بیچ کچھ ڈھونڈنے لگا۔ "پھر بھی، جانے کیوں میرا دل کہتا ہے، تمہیں اپنی تلاش جاری رکھنی چاہئے۔ ہم انسانوں نے اپنی کاہلی کے سبب مکڑوں کو ہر جگہ اپنے جال تاننے کا موقع دے رکھا ہے۔"

مجھے علم تھا، کسی نیک دلی کے جذبے کے تحت میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہ کام کو شروع ہی سے بگاڑ دیتا ہے۔ میں خود کو سمجھایا کرتا، ہمیں اپنے عمل میں صرف وہی چیزیں رکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے جن کے بغیر ہم جی نہیں سکتے، جو ہمارے لئے اکسیجن کا کام کرے، دوسرے معنوں میں جو ہماری زندگی کی فوری ضروریات کا خیال رکھے۔ میں جانتا ہوں، اس دروازے کی تلاش ہمیں بالائی دنیا میں لے جانے والی ہے جہاں زندگی کی ہماہمی ہے اور آگے بڑھنے کے مواقع بھرے پڑے ہیں، اور یہ خود میری آزادی کے لئے کتنا ضروری ہے، میں جو اس اس سطحِ زمین پر زندگی گذارتے ہوئے بھی زیرِ زمیں ایک دنیا کے اندر قید کر دیا گیا ہوں۔

شاید میں اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہو پاتا اگر ہمارے میس کے اندر وہ واقعہ پیش نہ آتا، ایک ایسا واقعہ جسے کسی مقامی اخبار نے شائع کیا نہ کسی پولس اسٹیشن کے ذریعے اس کی چھان بین ہوئی، ایک ایسا واقعہ جس نے ہمیں اندر ہی اندر بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس معاملے میں میں واحد شخص نہ تھا۔ اس آسمان کے نیچے اور بھی لوگ تھے جنھوں نے اس واقعے کی گونج اپنے اندر محسوس کی۔

ہمارے ہوٹل کے داخلے پر لکڑی کا ایک دروازہ ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی راہداری ہے جو مڑ کر لوہے کے ایک دوسرے دروازے پر ختم ہوتی ہے۔ یہ لکڑی کا دروازہ آدھی رات تک کھلا رہتا ہے تاکہ دیر سے لوٹنے والوں کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، مگر لوہے کا دروازہ مقفل کر دیا جاتا ہے جسے میس کا نوکر اسی وقت کھولتا ہے جب اس کی زنجیر بجائی جائے۔ ایک دن اس لکڑی اور لوہے کے دروازے کے بیچ کی راہداری میں ایک شادی شدہ عورت کی اجتماعی عصمت دری کا واقعہ پیش آتا ہے جو کسی طعام گاہ کی تلاش میں ہمارے دروازے پر لکھے ہوئے Hotel De Bengal کے نام سے دھوکہ کھا کر اپنے شوہر کے ساتھ آنکلی تھی۔ دونوں شاید اس شہر کے لئے اجنبی تھے اور ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس وقت ہم لوگ اوپر کے کمروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ جاڑے کی رات سڑکوں کو وقت سے پہلے سنسان کر ڈالتی ہے۔ ایسی راتوں میں، جب کہ ساری دکانیں اور ہوٹل بند ہو چکے ہوں، علی الاعلان باہر نکل کر کسی رستوران کی تلاش ایک بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے کمروں میں بھوکے رہ لیں۔ ہم ان سبھی لڑکوں کو جانتے تھے جو ہمارے ہوٹل کے باہر فلائی اوور کے ریلنگ پر بیٹھ کر نشہ لیا کرتے اور اسکول اور کالج جاتی لڑکیوں پر فقرے کسا کرتے۔ پولس انھیں نظر انداز کرتی تھی کیونکہ جیسا کہ میرے ایک پولس دوست کا کہنا تھا، اپنے تجربوں سے پولس اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ قانون میں تھوڑی سی ڈھیل کسی بڑے مجرمانہ عمل کو روکنے میں معاون ہوتی ہے۔

دراصل یہ واقعہ ہمیں ہوٹل کے مالک نے دوسری صبح بتایا۔ وہ اور اس کے وفادار نوکر نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ پانچ لڑکے تھے، بعد میں دو اور آگئے۔ مرد اور عورت کے لکڑی کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی انھوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ لوہے کے بجنے کی آواز سے نوکر آہنی دروازہ کھولنے پہنچا تو اس نے سہمی ہوئی عورت کو زمین پر بیٹھے ہوئے پایا۔ اس نے مالک کو اطلاع دی جو آفس میں بیٹھا مئے نوشی میں مشغول تھا۔ وہ جب دروازے کے پاس آیا تو پوری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ لڑکوں نے ایک خالی کمرے کی مانگ کی، مگر اس نے انکار کر دیا۔

"سر، آپ کو ہمیں جگانا چاہئے تھا۔" قانون کے دونوں طالب علموں نے، جو میس کے ہر طرح کے معاملات میں پیش پیش رہتے تھے، تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور آپ نے ہمیں بھنک تک نہ دی۔ آپ نے یہ کیوں ہونے دیا؟"

"ان لڑکوں نے نشہ کر رکھا تھا۔ مجھے پتہ تھا اگر میں نے تم لوگوں کو جگایا تو معاملہ خون خرابے تک پہنچ سکتا تھا۔ پولس میرا ہوٹل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیتی۔"

شاید وہ اپنی جگہ صحیح تھا۔ اسے اپنا ہوٹل چلانا تھا۔ لڑکوں نے باری باری اس عورت کے ساتھ منہ کالا کیا جب کہ اسی دوران مرد دیوار کی طرف منہ کئے کھڑا رہا جس کی گردن سے ایک چھرا لگا ہوا تھا۔ تقریباً دو بجے رات کو ان دونوں کو ٹرام کی پٹریوں پر چھوڑ دیا گیا۔

کون تھے وہ؟ اتنی رات گئے اس شہر میں وہ کیا کر رہے تھے؟ دوسری صبح کسی اخبار میں اس واقعے کا ذکر نہ تھا۔ اس کا ذکر ہوتا بھی کیسے، ایک بڑا شہر کسی بڑے بلاٹنگ پیپر سے کم نہیں ہوتا جس میں جانے کتنے گھناؤنے واقعات جذب ہوتے رہتے ہیں۔ تو میں نے خود سے دریافت کیا، کیا اس واقعے سے کہیں پر کچھ فرق پڑ گیا تھا؟ کیا کہیں پر کچھ بدلا تھا؟ ہم لوگوں نے اس دن سے ان آوارہ لڑکوں پر حقارت کی نظر ڈالنا شروع تو کر دیا تھا مگر کیا ہم لوگ ان سے کسی طور الگ تھے؟ ممکن تھا کہ اگر ہمیں ایسا کوئی موقع ملتا تو ہم منہ پھیر لیتے، ہو سکتا تھا ہم کچھ بھی نہ کرتے، اس لئے نہیں کہ ہم اندر سے روشن تھے، بلکہ اس لئے کہ ہمیں پکڑے جانے کا خوف تھا، اوروں سے زیادہ خود اپنے

ذریعے پکڑے جانے کا خوف۔ اگر ہم اپنے آپ سے چھپ پاتے (اور یہ لڑکے چھپ پاتے ہیں) تو ہو سکتا ہے کہ ہم ان سے بھی زیادہ برے ثابت ہوتے، شاید ہمارا اپناڈر ان لوگوں کو قتل کرنے پر مجبور کر دیتا، ایک بزدل انسان کا کارنامہ جو آخر کار اسے پھانسی کے تختے تک لے جاتا ہے۔ تو میں نے فیصلہ کیا، بہت دیر ہو چکی ہے۔ اگر مجھے اپنے اندر کے دونوں دروازوں کے بیچ کی گھناؤنی دنیا سے نکلنا ہے تو مجھے اس عمارت کے دروازے کی تلاش کرنی ہو گی جو اسے باہر کی ایک آزاد دنیا سے جوڑ سکے۔ یہ کہیں پر موجود ہے اور کسی وجہ سے اسے صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے، ہو سکتا ہے ان لوگوں کو میرے آنے کا انتظار ہو۔ یہ دروازہ، اگر میں نے اس کی تلاش نہ کی، تو شاید میں اپنے جینے کے مقصد سے سرے سے محروم ہو جاؤں۔

وہ چھٹی کا دن تھا اور مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، جیسے پہلی بار مجھے اپنے منہ کے اندر زبان کا احساس ہوا ہو مگر مجھے خاموش رہنے کا حکم دے دیا گیا ہو، جیسے کسی نے سانس روک کر مجھے جاننے کی کوشش کی ہو اور اسے مایوسی ہوئی ہو۔ شاید ایسے ہی کسی دن یہ کام ممکن تھا۔ میں نے خود سے کہا، تم کسی عام دن کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ اس طرح کے کاموں کے لئے ایک خاص دن کی ضرورت پڑتی ہے، جب تم خود کو وہ نہیں پاتے جو بنیادی طور پر تم ہوتے ہو۔ تو وقت آ گیا ہے کہ تمہیں صحیح جگہ، صحیح وقت اور صحیح کام کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اس شہر نے ایک واقعے کے ذریعے تمہیں ایک پیغام بھیجا ہے۔ اب تک تم نے جو زندگی گذاری تھی وہ ایک ایسے انسان کی زندگی تھی جس کے اندر باہر کچھ بھی صحیح نہ تھا۔ تم صرف دوسروں کے بل پر جیتے آئے تھے، دوسروں کی گونج بن کر زندہ تھے۔ اور کیونکہ تمہیں زندہ رہنا تھا، تمہارے اپنے سمجھوتے تھے، اپنے فیصلے تھے جن کے تم غلام ہو چکے ہو۔ مگر اچانک ہی یہ سب کچھ نہیں بدلنے والا، ایک بڑے، ٹس سے مس نہ ہونے والے بوجھ کی طرح تمہیں خود کو آگے ڈھکیلنا ہو گا، ایک ایسے انسان کی طرح جسے گھر کے فرنیچر اور دوسرے الم غلم سامانوں کے ساتھ سی دیا گیا ہو، جو اپنے دورانِ خون اور دماغ کے اربوں خلیوں کے باوجود کسی کام کے لائق نہ رہ گیا ہو۔ تو فٹ برج کے اوپر کھڑے کھڑے میں نے آسمان کے کنارے دیکھا جہاں سورج کے ٹوٹے ہوئے انڈے سے زردی باہر آ رہی تھی۔ عجیب روشنی تھی یہ جس میں مجھے یہ شہر اپنی سپاٹ چھتوں، دھند میں ڈوبی ہوئی گنبدوں میناروں اور لوہے کے پلوں کے ساتھ دور تک بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ شہر جس کے در و دیوار گھس گھس کر ننگے ہو چکے تھے، جہاں ہر کسی کو کسی ایسی ہستی کی ضرورت تھی جس کے اندر وہ اپنی جڑیں پھیلا سکے، جس سے وہ اپنی نمی اور معدنیات حاصل کر سکے۔

میں فٹ برج پر دیر تک نہیں رکا تھا کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو گئی تھی اور شہر روشنی سے جگمگا اٹھا تھا۔

فٹ برج سے اترتے ہوئے میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شہر کی روشنی کے سبب وہاں ستارے نظر نہیں آ رہے تھے۔

سب وے کے اندر کثیف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ یک چشم بھکاری چکر دار سیڑھی کے نیچے سے غائب تھا۔ یہ اس کے یہاں ہونے کا وقت نہیں ہے۔ وہ شاید کہیں اور موجود ہے، شاید کسی کھولی میں، یا پائپ کے اندر یا کسی بھٹیار خانے میں اپنی روٹی کے ٹکڑے کر رہا ہے۔ چکر دار سیڑھی کے خاتمے پر لکڑی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ دروازہ اہم نہیں ہے۔ سرنگ نما زینے سے چھاپے خانے کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی ہے۔ تو ان دنوں آرڈر تیزی سے آ رہے ہیں، بہت زیادہ تعداد میں آ رہے ہیں، اسی لئے چھٹی کے دن بھی کام چل رہا ہے۔ آفس کا بڑا کمرا اور اس کے زیادہ تر کمرے سنسان پڑے ہیں۔ ایک آدھ نیم جان بلب یہاں وہاں روشن ہیں مگر ایسا لگ رہا ہے جیسے کاتبِ تقدیر ان کے بارے میں فیصلہ کرنا بھول گیا ہو کہ انھیں بلب رہنے دے یا انسانی کھوپڑیوں میں بدل دے۔ آہ، وہ لوگ جو ان کمروں میں موجود نہیں، ان روشنیوں میں ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے سرے سے ان کا کوئی وجود تھا ہی نہیں۔ آنکھیں جو آنکھیں نہ تھیں اور انگلیاں جنھوں نے کام کرنے کی عادت سے مفر پا لیا تھا۔ میں انھیں دیکھ سکتا، اگر یہ بلب اتنے بے جان نہ ہوتے، دوسرے لفظوں میں اگر سب کچھ شروع سے غلط نہ ہو گیا ہوتا۔ میس کے دونوں دروازوں کے بیچ کے واقعے نے بہت پیچھے جا کر شروعات سے ہی سب کچھ غلط کر دیا تھا۔

کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑتا ہوا میرے پیچھے سے آ کر میرے کندھے سے چپک گیا ہے۔ کیا میں انسان کی جگہ ایک خاص مقناطیس میں بدل گیا ہوں جو ہر بے جان چیز کو اپنی طرف کھینچنے پر قادر ہو؟ میں کاغذ کو جسم سے الگ کرتا ہوں۔ یہ فل سکیپ ہے اور اس پر کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہے اور ہر کوری چیز کی طرح یہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اگلے ہی پل ، بھول جاؤ اسے، وہ کہتا ہے اور میں اسے نیچے پھینک دیتا ہوں۔ شاید اسے پتہ ہے اس دنیا میں کہنے کے لائق کچھ بھی نہیں ہے۔ ان مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے باوجود میں اس گندے پانی کو سن سکتا ہوں جو شہر کے زمین دوز نالوں میں بہہ رہا ہے، دیواروں سے لٹکتی زنجیروں سے ٹکرا رہا ہے۔ نہیں، یہ میرا تصور ہے، میں تو نیم تاریک دیواروں کے سائے میں رینگنے والا کیڑا ہوں جو کبھی بھی اڑ کر اندھیرے میں غائب ہو سکتا ہے یا ایک کپڑے چٹ کر جانے والا تتلی نما پتنگا ہوں جو کسی گرد آلود دیوار پر چپکا ہوا ہے۔

ایک ایسے انسان کی طرح جس کی سانسیں نکال لی گئی ہوں، میں چل رہا ہوں، ایک ایسی صبح، ایک ایسی روشنی، ایک ایسے دہانے کی تلاش میں جو مجھے شک و شبہات کے گھیرے سے باہر لا سکے۔ میری کپڑوں کے اندر پسینہ جیسا کچھ رس رہا ہے جب کہ یہ فروری کا مہینہ ہے۔ مگر کیا میں نے اپنے کلنڈر کو ٹھیک سے دیکھا ہے؟ کیا موسم نے اس کلنڈر کو ٹھیک سے دیکھا ہے؟ چلو، چلتے رہو، ورنہ اندر سے تم ہمیشہ کے لئے تھم جاؤ گے، یہ کائنات تمہارے لئے ایک ایسی گلی کی طرح ہے جو دونوں طرف سے بند ہے۔ اس میں کہیں پر ایک بھی دروازہ نہیں ہے۔ مگر جب تم اس کے اندر آئے ہو تو باہر جانے کا راستہ بھی یقیناً ہو گا۔ تمہیں پتہ ہے تم ایک ایسی عمارت کے اندر چلے آئے ہو

جہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں کیڑوں مکوڑوں کی بھرمار ہے جو انڈوں سے باہر آ کر اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ اندھیرے میں چمک رہے ہیں۔ انھوں نے تمہارے جسم کے ننگے حصوں پر رینگنا شروع کر دیا ہے۔ وہ تمہاری جلد میں اپنی سنڈیاں چبھو رہے ہیں۔ کسی مکڑے کے جالے نے تمہارے داہنے کان کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور اب اس سے مکڑیاں رینگتے ہوئے تمہارے حلقوم کے اندر اتر رہی ہیں۔ ایک عجیب احساس جیسے کچھ ہے جو ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے، ایسا کچھ جو موجود نہیں ہے مگر ہے۔ اور ان دیواروں پر ایک عجیب تھرتھراہٹ ہے جیسے دہائیوں کی تیرگی ان کے اندر سے باہر آنے کے لئے بے چین ہو۔ اگر ہمیشہ سے ان کے ساتھ یہ ہوتا آیا ہے تو یہ دیواریں اتنے دنوں تک زندہ کیسے رہ سکتی ہیں۔ اگر میری آنکھیں ہوتیں تو میں ان کی پژمردہ آنکھیں دیکھ سکتا۔ کہیں پر کچھ جل رہا ہے۔ تیل کی مہک! کیا یہ کسی طرح کی وارننگ ہے؟ کیا اس عمارت کے ان گنت کمروں میں، جن کی تمام بیرونی کھڑکیاں لوہے کی جالیوں سے ڈھکی ہوئی ہیں، میں واحد موجود شئے ہوں، باقی سب کچھ غائب۔

اور پھر مجھے وہ دروازہ دکھائی دے گیا۔ وہ ستونوں کے پیچھے سے ایک سیاہ فام افریقی کی طرح ابھرا تھا، ایک ایسی ہستی جو جو بھاپ میں ڈوبے ہوئے جنگل سے ابھی ابھی باہر آئی ہو اور اپنی بھاری بھرکم ٹانگوں پر کھڑی میری طرف تاک رہی ہو۔ ہاں، میں دیکھ سکتا تھا، اس کی دونوں آنکھوں کو جو غلط اونچائیوں پر بنی تھیں۔ چینی مٹی کی صراحیاں اس کے دونوں طرف کے ستونوں سے لگی کھڑی تھیں۔ ان مرتبانوں پر جیر نئیم کے بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ ان پھولوں کا رنگ کیا تھا اس کا تعین کرنا ناممکن تھا۔ ان سے بیلیں مردہ سانپوں کی مانند باہر نکل کر فرش پر ستونوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی اندر کی طرف چلی گئی تھیں۔ عرصہ ہوا کہ ان پر سڑن نے اپنا کام کرنا بند کر دیا ہے۔ ان مرتبانوں کو نہ چھونا ورنہ یہ چکنا چور ہو جائینگے، میرے دل نے کہا۔ نہیں، تم انھیں چھو سوکتے ہو، شاید تمہاری ہتھیلی کے لمس سے یہ بیلیں زندہ ہو جائیں، میرے دل نے دوبارا کہا۔ آج وہ میری اجازت کے بغیر سب کچھ کہنے پر مائل ہے۔ مجھے دروازے پر ایک چھوٹا سا شگاف نظر آتا ہے اور میں اپنے داہنے ہاتھ کی چاروں انگلیاں اس پر رکھ دیتا ہوں۔ یہ باہر کی روشنی ہے جو دروازے کی درزوں سے رس رہی ہے۔ میری انگلیاں روشن ہو گئی ہیں جیسے میرے تاریک وجود کے اندر ایک روشن انسان موجود ہو۔ اگر یہ دروازہ باہر سے بند ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں کواڑ کے ابھرے ہوئے حصوں کو تھام کر اپنی پوری طاقت کے ساتھ اندر کی طرف کھینچتا ہوں۔ دونوں پلّے سختی کے ساتھ اپنے فریم سے چپکے ہوئے ہیں۔ ان پر کالکھ کی ایک موٹی تہہ جمی ہے اور اسے اندر سے بند رکھنے کے لئے جس بالٹ کا ہونا تھا وہ اپنی جگہ سے غائب ہے۔ اس کی جگہ کسی نے لوہے کی ایک سلاخ ڈال دی ہے۔ میں اسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سلاخ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ مجھے اس کی ضد پسند نہیں آتی۔ میری لگاتار کوشش ایک جنون میں بدل جاتی ہے۔ یہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟ میں کیا پانا چاہتا ہوں؟ میں کس سے بھاگ رہا ہوں؟ اور جب کہ میں اپنی ہمت ہار رہا تھا، اچانک سلاخ اپنی جگہ سے نکل کر میری ہتھیلی میں آجاتی ہے۔ یہ اتنا اچانک ہو گیا ہے کہ میں اس کا بوجھ سنبھال نہیں پاتا۔ اس کے فرش پر گرنے کی آواز گنبد کے اوندھے پیالے سے ٹکرا کر کافی دور تک پھیل گئی ہے۔ اور جب کہ میں اپنی کالکھ زدہ انگلیوں کو آپس میں مسل رہا ہوں میں دیکھتا ہوں، کچھ چمگادڑ اپنی تاریک پناہ گاہوں سے نکل کر واپس ان میں چھپ گئے ہیں۔ مجھے اپنی چپلوں کے نیچے چمگادڑوں کی بیٹ کی نرمی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر میں نے چلنے کی کوشش کی تو میں پھسل کر گر سکتا ہوں۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں دروازے کے ابھرے ہوئے حصوں کو تھام کر اپنی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ کواڑ اب بھی آپس میں گتھے ہوئے ہیں جیسے انھوں نے میرے خلاف سازش کرنے کی سوچ لی ہو۔ شاید یہ دیوقد افریقی میرے بس کی بات نہیں۔ اور جب کہ میں اپنے اندر سے کمزور پڑنے لگا تھا، داہنے کواڑ کے پینل عجیب ڈھنگ سے کانپنے لگے۔ میں دروازے سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پینل اسی طرح اپنی کسی اندرونی کمزوری کے سبب کانپتے رہے۔ پھر اس کے بالائی حصے سے لکڑی کا ایک ٹکڑا الگ ہو کر عین میرے سامنے آ کر گرا اور گھن کھائے ہوئے تختے کے اندر کی گرد میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس لکڑی کے گرنے سے کواڑ کے بالائی حصے پر روشنی کا ایک بڑا خانہ بن چکا تھا۔ دروازہ اتنا بڑا ہے کہ میرے کندھے پر ایک دوسرا آدمی کھڑا ہو جائے تو اس کے اوپری حصے کو چھو سکتا ہے۔ میں ایک بار پھر اسے اندر سے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لکڑی کے کچھ اور ٹکڑے اوپر سے گرتے ہیں، میرے بالوں اور کپڑوں پر لکڑی کے برادوں کے ساتھ ساتھ کچھ کیڑے بھی رینگنے لگے ہیں۔ کچھ روشن مگر بے ترتیب لکیریں دروازے پر جگہ جگہ جاگ اٹھی ہیں۔ انھوں نے بیٹ میں غرق فرش پر آڑی ترچھی لکیریں بچھا دی ہیں۔ یہ اس روشنی کا نتیجہ ہے کہ میرے چاروں طرف ایک نئی دنیا وجود میں آچکی ہے جس میں میں دکھائی دینے لگا ہوں۔ دروازہ اب پوری طرح میرے قابو میں ہے۔ اس کے چاروں کناروں میں روشنی کی لکیریں بن چکی ہیں۔ آخر کار داہنی طرف کا کواڑ فریم سے الگ ہو کر ایک کراہ کے ساتھ اندر کی طرف کھل جاتا ہے۔

کواڑ کو اس کے کنارے سے پکڑ کر میں ڈھکیلتے ہوئے اندر لے آیا ہوں اور ٹھنڈے پسینے میں غرق لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہوں۔ اب میرے سامنے ایک مستطیل خلا ہے، یہ اتنا بڑا ہے کہ میں دوسرے کواڑ کو کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مکڑی کے جالے کو کان سے صاف کرتے ہوئے میں عمارت سے باہر آ گیا ہوں اور اس نیم منہدم شدہ بابِ ہیکل کے نیچے اپنے گیلے پیروں کے ساتھ کھڑا تازہ ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہوں۔

یہ کنکریٹ کا بنا ایک اونچا چبوترا ہے جس سے ایک کشادہ زینہ نیچے کی طرف اترتا چلا گیا ہے۔ یہاں آس پاس کوئی غیر قانونی تعمیر نہیں ہے۔ ایک روشن شاہراہ تک پہنچنے سے قبل زینہ اندھیرے میں غائب ہو گیا ہے۔ اپنے شہر میں اس روشن شاہراہ کا وجود مجھے حیران کر دیتا ہے۔ اتنی روشنی! یہ میرے شہر کی روشنی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ وسیع و عریض زینہ جو بتدریج نیچا ہوتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا ہے، اس پر پاؤں رکھتے ہی میرے پیروں کے گیلے پن کا احساس کیوں اتنا تیز ہو گیا ہے جیسے آپ برف پر چل رہے ہوں؟ زینے کے دونوں کناروں سے ان گنت پگڈنڈی نما زینے نکل نکل کر اکٹوپس کے بازوؤں کی طرح اندھیروں میں گم ہو رہے ہیں۔ ان پر چلتے لوگ کون ہیں، یہ جو اپنی شکلوں، اپنے جسموں میں اقلیدس کی لکیروں کے علاوہ اور کچھ نہیں رکھتے؟ یہ جو جگہ جگہ سلنڈر کی طرح کھلے ہوئے ہیں یا کون کی طرح ٹوٹے ہوئے ہیں، یا پائپ کی طرح ٹیڑھے میڑھے نظر آ رہے ہیں، ان کی آنکھیں جو خود بھی غلط اونچائیوں پر بنی ہیں، ایک دوسرے کی نفی کر رہی ہیں۔ کیا یہی زندگی کی سچائی ہے اور ان روشن لکیروں کے درمیان جو تاریکی ہے، جہاں ان دیکھے خداؤں کا وجود ہے، جہاں آنکھیں سبز ہیں اور ٹاٹ کے زرد زرد پردوں سے چہروں کے خطوط ابھر رہے ہیں، کیا سب کچھ ان ہی چیزوں سے بنی ہیں۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں، چھاپہ خانہ کی عمارت کافی بلندی پر، بلکہ شہر کی چوٹی پر کھڑی ہے، تاریک مگر موجود جیسے وقت اس کے وجود کو پوری طرح مٹانے میں ناکام رہا ہو۔ یہ باہر سے تاریک ہے مگر اس کا دہانہ، جو دروازے کے نصف کھلنے کے سبب نظر آ رہا ہے تابناک اور روشن ہو چکا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اس سے روشنی کا ایک دریا لاوا کی طرح بہتا ہوا شاہراہ کی طرف آ رہا ہو، شاہراہ خود جس پر انسانوں کا ایک ہجوم اپنی اقلیدس کی لکیریں اٹھائے چل رہا ہے۔ میں کہ اس شاہراہ سے دور ہوں مگر حیرت انگیز طور پر اس میں موجود ہوں، میں سوچ رہا ہوں اپنے جسموں کو ڈھوتے ہوئے یہ لوگ، ان کے چہرے کتنے روشن ہیں جیسے وہ خاص قسم کے اندھیرے میں چمکنے والے کیڑے ہوں۔ یہاں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی، رد کئے جانے کے مکمل احساس کے باوجود جینے کے لئے جن چیزوں کا سہارا لیا جاتا ہے ان کا بوجھ ان کی ہڈیوں کو وقت سے قبل ٹیڑھی کرنے کے لئے کافی ہے۔ اپنی جگہ کھڑا مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میں ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہوں جہاں وقت خود کو دہرا رہا ہے، جہاں روشنیوں کے آس پاس تاریکیوں نے اپنا الگ نظام بنا رکھا ہے جن کے مطابق روشنیوں کو مڑنا پڑتا ہے؟ آہ، یہ عجیب روشنی، جس کے بل پر ہم لوگوں نے ایک تہذیب کی بنیاد تو ڈالدی مگر اس تہذیب میں لوگ آج بھی اسی طرح تھکے ہوئے، کمہلائے ہوئے نظر آ رہے ہیں جس طرح وہ روزِ ازل میں نظر آئے ہونگے جب خدا نے انھیں رد کیا ہو گا۔ روشن کھمبوں کے نیچے پتھروں پر بیٹھے ہوئے یا سر جھکا کر چلتے ہوئے یہ لوگ، زندگی کی ان دیکھی مانگوں سے نڈھال، اب جانے کس خدا کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے شاہراہ کی بھیڑ میں چلتے ہوئے مجھے اپنے چہرے پر ایک عجیب حرارت کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے کسی نے اس پر فاسفورس چھڑک دی ہو۔

"کیا واقعی، یہ کسی قسم کی نجات کا لمحہ ہے!" میں اپنے چہرے پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے خود سے کہتا ہوں۔ نہیں، یہ میرا چہرا نہیں ہے جو جل رہا ہے، یہ کسی اور کا چہرا ہے جسے میں نے پہن رکھا ہے۔

"اور تم یہاں کیسے آ گئے؟" ایک لاغر عورت جانے کہاں سے نمودار ہو کر میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے اپنے بدن پر ایک چغہ ڈال رکھا ہے جس کا ہڈ اس کے سر پر پڑا ہوا ہے۔ ہڈ کے اندر کوئی چہرا نہیں ہے۔

"بس میں نکل آیا۔ اور آپ نے یہ چغہ کیوں پہن رکھا ہے؟ کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟"

"ہاں، تم مجھے جانتے ہو۔ اور مجھے یہ پہننا پڑا ہے کیونکہ میرے پستان سڑ گئے تھے۔ تمہیں تو پتہ ہے، میرے سارے بال گر چکے ہیں۔ مجھے یاد آیا، تم نے میرے لئے ایک وگ لانے کا وعدہ کیا تھا۔" اندھیرے میں اس کے لانبے دانت چمک اٹھے ہیں۔ "شاید تم نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم لوگ دوسروں کے دئے گئے دنوں میں جی رہے ہیں۔"

ہاں، میں اسے پہچان گیا ہوں۔ مگر میرے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید اسے اس بات کا علم ہے۔ وہ مڑ کر چلنے لگتی ہے۔ میں اسے پکارتا رہ جاتا ہوں، مگر وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اقلیدس کی لکیروں میں ڈھل جاتی ہے۔

میرے خدا، میں اس روشنی کا کیا کروں جس نے سب کچھ اتنا ننگا کر دیا ہے کہ دیکھنے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔ مجھے چھاپے خانے کی طرف واپس لوٹنا چاہئے۔ میں اتنی جلد ہار نہیں مان سکتا۔ میں نے اس دروازے کی دریافت کی ہے۔ ابھی میرا کام باقی ہے۔ دروازے کے دوسرے طرف کی دنیا وہ نہیں ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ واپسی پر میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے ہیں۔ میرے راستے کے دونوں جانب تاریک دریا سا کچھ ابل رہا ہے، جس میں کشتیاں ڈول رہی ہیں، ان میں جلتی لالٹینیں دراصل انسانی آنکھیں ہیں۔ تو کیا واقعی اس شہر کے سارے زمین دوز نالے سطحِ زمین پر آ گئے ہیں۔

چھاپے خانے کے دروازے پر سب کچھ پہلے کے جیسا ہے۔ اندر مشینوں کے شور میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس شدید کپکپاہٹ کے سبب کہیں نیم بوسیدہ دیواریں زمیں بوس نہ ہو جائیں، اس کے داخلے کی دیوار کے گرنے کا واقعہ ایک بڑے پیمانے پر پھر سے دہرایا نہ جائے۔ میں شور کا تعاقب کرتے ہوئے ایک بڑے ہال کے اندر نکل آیا ہوں جہاں مشینیں طوفانی رفتار سے چل رہی ہیں۔ یہ روایتی لیٹر پریس مشینیں ہیں جن پر لوگ جھکے ہوئے کام کر رہے ہیں، پلیٹیں اور روشنائی کے رولر بدل رہے ہیں، فیڈ بورڈ میں کاغذات ڈال رہے ہیں۔ میں جانے کتنی دیر تک ان کے درمیان چلتا رہتا ہوں، مگر کوئی میری طرف نہیں دیکھتا۔ ان کی آنکھوں کے گڈھے تیرگی میں ڈوبے

ہوئے ہیں۔ کیا ان لوگوں کا کوئی چینج اوور ٹائم نہیں ہے؟ مشینوں سے کاغذ برابر نکلتے چلے جارہے ہیں۔ مگر چھپے ہوئے کاغذات کو چاک کرنے، تہہ کرنے، پنچ کرنے، لئی لگانے اور اسٹیپل کرنے کے لئے کوئی آن لائن آپریشن نہیں ہے۔ صرف دو کارندے ہیں جو ان کاغذات کے پلندوں کو اٹھا اٹھا کر ٹرالی کے اندر رکھ رہے ہیں، انھیں ڈھکیل کر ہال سے لگے کمروں کے اندر لے جارہے ہیں۔ آخر کار تھک کر میں ایک ڈھیر سے کچھ کاغذات اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ ان میں کسی بھی کاغذ پر کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہے، صرف سیاہ روشنائی نے حاشیوں کو چھوڑ کر کاغذ کو دونوں طرف سے سیاہ کر رکھا ہے۔۔ تو یہ راز ہے اس چھاپے خانے کا! میں باری باری سے ان تمام کمروں کے اندر جاتا ہوں جن کا استعمال گدام کے طور پر ہو رہا ہے۔ ہر کمرے میں اسی طرح کے کاغذات کے ڈھیر اپنی ریکوں پر سجے ہوئے کہیں کہیں چھتوں کو چھو رہے ہیں۔ میں ایک ریک سے کچھ کاغذات کھینچ کر باہر نکالتا ہوں۔ ان پر گرد کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی ہے۔ پلندوں کو ایک دوسرے سے مار کر صاف کرتے ہوئے میں دیکھتا ہوں، یہ کاغذات تمام کے تمام سیاہ ہیں، شاید ان میں حروف آپس میں اتنے ملا دئے گئے ہیں کہ پورا صفحہ سیاہ ہو گیا ہے، یا ہو سکتا ہے کہ ان کاغذات میں کہیں پر ایک بھی لفظ چھپا ہوا نہ ہو، صرف ان پر سیاہی پھیر دی گئی ہو۔ مجھ پر اس حیرت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان تمام کمروں میں بس اسی طرح کے کاغذات بھرے پڑے ہیں۔ باہر آکر میں چھاپے کی مشینوں کے سامنے حیران و پریشان کھڑا ہوں۔ ان پر کام کرتے لوگ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ ''آخر یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟'' میں چیخ اٹھتا ہوں۔ میری غیر انسانی چیخ کے سبب پہلی بار شاید انھیں میری موجودگی کا احساس ہوا ہے۔ انھوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہوتا،، واقعی ان کی آنکھوں کی جگہ تیرہ و تاریک خندقیں میری طرف گھور رہی ہیں۔ ''تم دونوں میرے پیچھے پیچھے آؤ۔'' میں مڑ کر ٹرالی مین سے کہتا ہوں۔'' میں اس چھاپے خانے کا نیا آدمی ہوں''۔ دونوں اپنی اپنی ٹرالی کے سامنے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ ان کی ہچکچاہٹ قائم ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑے اپنی آنکھوں کی خندقوں سے ایک دوسرے کی طرف تاکتے رہتے ہیں، پھر ان خندقوں میں ایک موہوم سی روشنی جاگتی ہے۔ شاید ان میں کسی قسم کا تبادلۂ خیال ہوا ہے۔ وہ ٹرالیوں کو ڈھکیلتے ہوئے روازے کی طرف لانا شروع کر دیتے ہیں۔ انھوں نے دروازے کو دیکھ لیا ہے۔ وہ میری آواز پہچان چکے ہیں۔ برسوں سے انھیں اس آواز کا انتظار تھا۔

جانے کتنا وقت گذر گیا ہے۔ دونوں کارندے ٹرالیاں کاغذات سے بھر بھر کر میری ہدایت پر کھلے دروازے سے باہر زینے پر انڈیل رہے ہیں۔ دروازے کے سامنے کاغذ کا پہاڑ سا بن گیا ہے۔ یہ پہاڑ اس خلاء کے مقابلے جو دروازے کا ایک حصہ کھل جانے سے بن گیا ہے، بہت بڑا ہے۔ ٹرالیاں کمروں سے کاغذات سے بھری ہوئی باہر آتی جا رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ کاغذ کا پہاڑ تیزی سے بلند ہوتا جارہا ہے، ان میں سے پلندوں کی اچھی خاصی تعداد باہر زینے پر پھسلنے لگی ہے۔ دروازے کا ایک پلّا اب بھی بند ہے۔ مگر وہ زیادہ دیر اپنی جگہ قائم نہیں رہتا۔ کاغذات کا بوجھ سنبھال نہ پانے کے سبب وہ ایک زور دار چڑچڑاہٹ کے ساتھ اپنے قبضوں سمیت باہر زینے پر جا گرتا ہے۔

جس کے ساتھ ہی چھاپے خانے کے اندر کی گڑگڑاہٹ اچانک رک گئی ہے۔

عمارت ایک عجیب سنّاٹے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ زینہ پر اوندھے گرے ہوئے پلّے پر کاغذات کے ڈھیر پھسلتے جارہے ہیں مگر پھر بھی اس سے دھول باہر آرہی ہے جیسے اس کی روح نکل رہی ہو۔ دیمک نے اسے اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ مجھے اپنی پشت پر کچھ لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ تمام لوگ اپنی اپنی مشینوں کو چھوڑ کر میرے پیچھے جمع ہو گئے ہیں۔ میں اپنی سانس روکے سوچ رہا ہوں، کیا اس کائنات سے جو اس دروازے کے دونوں طرف موجود تھی ہم ہمیشہ کے لئے مفر پا چکے ہیں۔ کیا ایک نئی کائنات وجود میں آچکی ہے جس کے واقعی ہم مالک ہیں۔

عجیب سنّاٹا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے خاموشی ابھی ابھی بول پڑے گی۔

اور تب بہت ہی غیر محسوس طور پر روشندان کے نیچے سے ایک سریلی جھنکار ابھرتی ہے۔ یہ بہت ساری گھنٹیوں کی ایک ہم آہنگ آواز ہے۔ میں اسے پہچان لیتا ہوں۔ اس آواز کو میں بچپن سے اپنے اندر سنتا آیا ہوں۔ اور جب کہ دیوار گیر گھڑی اپنی جھنکار پے در پے دہرا رہی ہے میری نظر اس کے پنڈولم پر جا ٹکتی ہے۔ وہ بہت ہی پر اسرار طور پر اپنی جگہ واپس آچکا ہے اور اس کی پلیٹ دونوں اندرونی دیوار سے شدت کے ساتھ ٹکرا رہی ہے، جیسے زمین کی گردش اس کے محور پر کسی وجہ سے اچانک بہت تیز ہو گئی ہو۔ کیا یہ دنیا کے خاتمے کا اعلان ہے؟

ابھی میں اس پنڈولم کی گتھی کو سلجھا بھی نہیں پایا ہوں کہ اوپر روشندان میں کئی پرایک ساتھ پھڑ پھڑاہٹیں ہیں۔ وہ ایک بڑا سا الّو تھا جو کسی تاریک کونے سے نکل کر فاختہ پر جھپٹا تھا۔

مگر اسے دیر ہو گئی تھی۔

شکار گھنٹی کی آواز کے سبب پہلے ہی ہوشیار ہو چکی تھی۔

فاختہ روشندان سے تیر کی طرح نیچے آئی ہے۔ وہ ایک ستون سے ٹکرا کر گرتے گرتے خود کو سنبھال لیتی ہے اور ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔
کھلے دروازے کے سامنے ہم لوگ چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے ہیں، فاختہ اپنے دونوں پر پھیلائے روشن آسمان میں اڑتی چلی جارہی ہے۔ فاختہ نظروں سے اوجھل ہوچکی ہے، جس کے ساتھ ہی روشن آسمان اچانک بجھ گیا ہے، شہر تیزی سے تاریکی میں ڈوبتا چلا جارہا ہے، زینے غائب ہوتے جارہے ہیں۔ اقلیدس کی لکیریں ماند پڑتی جارہی ہیں۔
اب ان میں سے ایک بھی لکیر باقی نہیں بچی ہے۔ ایک تاریک کائنات مجھے چاروں طرف سے نگل چکی ہے۔ میں انگلیاں آنکھوں کے اندر ڈال کر دیکھتا ہوں۔۔۔
میری آنکھیں تاریک خندقوں میں تبدیل ہوچکی ہیں۔